خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2014

عید مبارک

HUM

محرم

EVERY THURSDAY AT 8:00 P.M.

A PRESENTATION OF MOOMAL ENTERTAINMENT

HUM NETWORK





مزہ اب سب کی پہنچ میں




HUM
ہم


جاگو




HUM
NETWORK

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالد جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز	MEMBER APNS CPNE

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے



عید مبارک


آپ سے کیا پردہ


خاتون کی ڈائری


مجھ سے ملیے


انٹرویو


ناول


مکمل ناول


ناولٹ


افسانے


نظمیں غزلیں













اکتوبر 2014

جلد 42 شمارہ 6

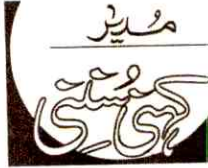
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا اکتوبر کا شمارہ عید نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اسلامی تہوار اپنی علیحدہ ہی شان رکھتے ہیں۔ ان میں خوشی کے ساتھ ساتھ عبودیت، شکر گزاری، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل، اس کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے کی جو لگن نظر آتی ہے وہ پوری دنیا میں کسی بھی قوم کے تہواروں میں نظر نہیں آتی۔

عیدالاضحیٰ کا تہوار، جو سنت ابراہیمی کی یاد تازہ کرنے کے لیے منایا جاتا ہے، اس میں مذہبی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ فرائض کی ادائیگی پر تشکر اور سکون و اطمینان کا احساس خوشیوں کا رنگ دوبالا کر دیتا ہے۔

تہوار اجتماعی خوشی اور باہمی میل ملاپ کا مظہر ہوتے ہیں۔ عیدالاضحیٰ تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماعی تہوار ہے۔ خوشی کے اس دن ان لوگوں کو بھی اپنی خوشیوں میں شامل کریں جن کے لیے عید خوشی کی پیامبر بن کر نہیں آتی۔ ملک کے بڑے حصے میں لوگ ایک ناگہانی آفت کا شکار ہیں۔ سیلاب نے ان کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ آپ کی تھوڑی سی اعانت ان کے دکھوں میں کمی کر سکتی ہے۔

ہماری جانب سے تہہ دل سے عید کی مبارک باد قبول کیجیے۔ ہماری دعا ہے کہ عید آپ سب کے لیے حقیقی معنوں میں عید بن کر آئے۔ ہر گھر میں خوشی اور شادمانی ہو، کوئی بھی دل رنجور نہ ہو۔ آمین۔

نیا ناول،

بہن عنیزہ سید کا ناول اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ نومبر میں اس کی آخری قسط شائع ہوگی۔ آئندہ ناول بہن عمیرہ احمد کا ہوگا۔ وہ آپ کے لیے "آب حیات" لائی ہیں۔ عمیرہ احمد کی تحریر کسی تعارف یا تعریف کی محتاج نہیں۔ ان کے بارے میں صرف اتنا کہہ سکتے ہیں۔

ع آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)،

محمود بابر فیصل، ایک روشن چراغ۔ وہ جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، روتوں کو ہنسا دینے کا فن جانتے تھے۔ جانے کتنی آنکھوں میں آنسو دے کر چلے گئے۔ ہم آج بھی ان کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر کرے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

25۔ اکتوبر کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"، • تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول "عہدالست"،
- فرحانہ ناز ملک کا مکمل ناول "محبت کی کہانی ہیں"، • شیریں ملک اور نورعین کے ناولٹ،
- آمنہ طیفور، صدف آصف اور علیقہ محمد بیگ کے افسانے،
- ماہر پکوان ردا آفتاب سے ملاقات، • ٹی وی فنکارہ عشا نور سے باتیں،
- عیدالاضحیٰ احباب کے ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

اس شمارے کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے' ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابو داؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

خرید و فروخت اور لین دین میں نرمی اور ادائیگی اور تقاضا کرنے میں اچھا رویہ اختیار کرنے' جھکتا تولنے اور ناپنے کی فضیلت اور کم تولنے اور ناپنے کی ممانعت اور مال دار کے تنگ دست کو مہلت دینے اور اس سے قرض کو معاف کردینے کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "تم جو بھلائی بھی کرو گے' یقیناً" اللہ اسے جاننے والا ہے۔" (البقرہ 215)

نیز فرمایا "اے میری قوم! انصاف کے ساتھ ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو۔" (سورہ ہود 85)

اور فرمایا "ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے خود ناپ کر پورا لیتے ہیں مگر جب ناپ یا تول کر دوسروں کو دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔ کیا ان کو یقین نہیں کہ وہ ایک بڑے دن میں اٹھائے جائیں گے۔ جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (المطففین 1-6)

قرض کی ادائی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضا کرنے لگا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درشت رویہ اختیار کیا۔ صحابہ نے اسے زدوکوب کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اسے چھوڑ دو' اس لیے کہ حق دار کو کہنے کا حق ہے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسے اتنی عمر کا جانور دے دو جتنی عمر کا جانور اس کا تھا۔"

صحابہ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس جیسا تو ہم نہیں پاتے' البتہ اس سے بہتر اور زیادہ عمر والا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہی اسے دے دو' اس لیے کہ تم میں بہتر وہ ہے جو ادائیگی میں

سب سے اچھا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ کہا جاتا ہے کہ قرض خواہ حضرت زید بن شعبہ کنانی تھے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے' بعد میں مسلمان ہوئے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا اور مطالبہ کرنے میں سخت رویہ اختیار کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سمجھایا کہ صاحب مال کے لیے بہتر تو یہی ہے کہ وہ تقاضا کرتے وقت اچھا رویہ اختیار کرے' تاہم اگر کوئی اس میں سختی کرتا ہے تو اسے نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ حق دار کو بہر حال کہنے کا حق ہے۔ تاہم اس میں شرعی حدود و آداب سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے۔

2۔ مقروض اگر اپنی مرضی سے ادائیگی کے وقت قرض اور حق سے زیادہ ادا کر دے تو مستحب ہے اور صاحب مال (قرض خواہ) کی طرف سے زیادتی کا مطالبہ ہو گا تو یہ سود ہو گا' جس کا لینا جائز ہے نہ دینا۔ اسی طرح اگر پہلے سے زیادہ دینا طے ہو گا تو وہ بھی سود ہو گا خواہ مقروض کی مرضی سے ہو۔

نرمی کرنے والا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو بیچتے وقت' خریدتے وقت اور قرض کی وصولی کا مطالبہ کرتے وقت نرمی کرتا ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ خرید و فروخت کے وقت نرمی کا مطلب یہ ہے کہ خریدتے وقت ایسا رویہ اختیار کرے جس سے بیچنے والے کو کوئی نقصان نہ ہو' اسی طرح بیچتے وقت ایسا انداز اپنائے جس سے گاہک کو تکلیف نہ ہو' حتیٰ کہ خریدار سودا واپس کرنا چاہے تو اسے واپس کر لے۔

2۔ ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ خریدتے وقت قیمت اصل سے زیادہ دے اور بیچتے وقت قیمت کے مقابلے میں سودا زیادہ دے۔ علاوہ ازیں کسی سے اپنا حق لینا ہو تو اس کے مطالبے میں بھی سختی کے بجائے نرمی سے کام لیا جائے' ادب و احترام کے دائرے سے تجاوز نہ کیا جائے' غریب ہو تو اس کو مہلت دے یا پھر قرض معاف ہی کر دیا جائے۔

مہلت دینے والا

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی بے چینیوں سے نجات دے تو اسے چاہیے کہ وہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس سے (قرض) معاف ہی کر دے۔" (مسلم)

فائدہ : اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ قرض کی ادائی میں مزید مہلت دے دے' یعنی "مطالبے کو موخر کر دے۔" دوسرے معنی ہیں : اس کی تکلیف کو دور کر دے باایں طور کہ اپنے پاس سے اسے اتنی رقم دے دے کہ جس سے وہ اپنا قرض ادا کر دے' بہر حال یہ ہمدردانہ رویہ قیامت کے روز انسان کو قیامت کی بے چینیوں سے بچائے گا جہاں ہر شخص بے چین اور مضطرب ہو گا۔

درگزر کرنے والا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک آدمی لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اپنے ملازم سے کہا کرتا تھا : جب تو (رقم کی وصولی کے لیے) کسی تنگ دست کے پاس آئے تو اس سے نرمی اور درگزر کا معاملہ کیا کر' شاید اللہ تعالیٰ ہم سے بھی درگزر سے کام لے۔ چنانچہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملا (مر گیا) تو اللہ نے اسے معاف فرما دیا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ درگزر کرنے کے مفہوم میں حسن مطالبہ' مزید مہلت یا قرض کی معافی' تینوں صورتیں شامل ہیں اور

تینوں ہی شرعاً "مطلوب و محمود ہیں۔"

2۔ یہ واقعہ سابقہ امتوں میں سے کسی آدمی کا ہے لیکن اس نے ایسا مثالی کردار پیش کیا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پسند فرمایا کیونکہ آپؐ نے بھی اپنے قول و عمل سے اسی بات کی تلقین اپنی امت کو فرمائی ہے اور یہ عمل یقیناً "اللہ کی رضامندی کا بھی باعث ہے۔

تنگ دستی سے نرمی

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم سے پہلے لوگوں میں سے (مرنے کے بعد) ایک شخص کا حساب کیا گیا تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی نیکی نہیں پائی گئی کہ وہ لوگوں سے لین دین کا معاملہ کرتا تھا اور خوش حال تھا اور اپنے غلاموں سے کہتا تھا کہ تنگ دست سے درگزر کیا کرو۔ (جب وہ مر گیا تو فرشتوں سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ہم درگزر کرنے کے اس سے زیادہ حق دار ہیں ہم اس سے درگزر کرو (اسے معاف کردو)۔" (مسلم)

فائدہ : "حساب کیا گیا" یہ قیامت کے حالات کی خبر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے اطلاع پا کر تمثیل کے طور پر بیان فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ حساب کتاب میں اللہ تعالیٰ عفوو درگزر کا معاملہ فرمائے گا' اس لیے کہ جزا بھی عمل کی جنس ہی سے ہوگی۔

زیادہ حق دار

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ' جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا تھا' اللہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا "تو نے دنیا میں کیا کیا؟"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے (جملہ معترضہ کے طور پر) قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔ "اور وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔"

اس نے جواب دیا۔ "اے میرے رب! تو نے اپنے پاس سے مجھے مال دیا تھا' چنانچہ میں لوگوں کے ساتھ خرید و فروخت کا معاملہ کرتا تھا اور (اس میں) میری عادت درگزر کرنے کی تھی۔ میں خوش حال پر آسانی کرتا (اس سے عیب والی چیز بھی قبول کرلیتا) اور تنگ دست کو مہلت دے دیتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"میں اس درگزر کرنے کا تجھ سے زیادہ حق دار ہوں۔ (فرشتو)! میرے بندے سے درگزر کرو۔" (مسلم)

عرش کا سایہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دے یا اس کو معاف کردے' اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا۔ اس دن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے : یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ قیامت کے روز میدان محشر میں سورج بالکل قریب ہوگا اور لوگ پسینے میں ڈوبے ہوئے اور شدت حرارت سے نڈھال ہوں گے۔ اس وقت جن لوگوں کو عرش الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا' بڑے ہی خوش نصیب ہوں گے۔ ان ہی خوش نصیبوں میں سے ایک وہ شخص ہوگا جو تنگ دستوں کو نہ صرف قرض دیا کرتا تھا بلکہ انہیں مہلت بھی دیتا یا پھر کچھ یا کل کا کل معاف کر دیتا۔

2۔ اس میں خوش حال لوگوں کے لیے غور و فکر اور عمل کی دعوت ہے۔ آج کل لوگ اپنے ہم پلہ لوگوں کو تو قرض دے دیتے ہیں لیکن کسی غریب کو قرض دینا پسند نہیں کرتے' وہ سوچتے ہیں کہ اس سے وصولی مشکل ہوگی کیونکہ کسی تنگ دست کو معاف کردینے کا سبق ہم نے بالکل بھلا دیا ہے۔ بہرحال کسی ضرورت

مند غریب کو وسعت کے باوجود قرض دینے سے گریز کرنا ناپسندیدہ ہے اور اسے قرض دے کر اسے مہلت دینا یا معاف کر دینا نہایت پسندیدہ عمل ہے جس کی بہترین جزا قیامت کے روز ملے گی۔

زیادہ تولنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک اونٹ خریدا تو اس کی قیمت جھکتی ہوئی تول کر دی۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ : عہد رسالت اور اس کے بہت بعد تک دینار و درہم کے ذریعے سے خرید و فروخت ہوتی تھی۔ دینار سونے کا اور درہم چاندی کا ہوتا تھا۔ اونٹ کی جو قیمت سونے یا چاندی میں طے ہوئی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تول کر دی اور طے شدہ وزن سے زیادہ دی۔

ناپ تول میں نرمی

حضرت ابو صفوان سوید بن قیس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں اور مخرمہ عبدی ہجر جگہ سے کچھ کپڑا (فروخت کرنے کے لیے) لے کر آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے ایک پائجامہ کا بھاؤ کیا۔ میرے پاس ایک وزن کرنے والا تھا جو مزدوری لے کر مال تولتا تھا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وزن کرنے والے سے فرمایا۔

"تول اور جھکتا ہوا تول۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں : یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ خریدنے والا طے شدہ قیمت سے زیادہ دے اور اسی طرح بیچنے والا، سودا زیادہ دے۔ یہ انصاف سے بڑھ کر احسان کی صورت ہے۔ جس سے معاشرے پر نہایت خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرے کے حق میں کمی کرنے سے بغض و عداوت کے جذبات نشوونما پاتے ہیں جو معاشرے کے لیے نہایت مہلک ہیں۔

چغلی کے حرام ہونے کا بیان اور یہ فساد ڈالنے کی نیت سے ایک کی بات دوسرے کو پہنچانے کا نام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بہت عیب جو یا غیبت کرنے والے اور چغلی کے ذریعے سے فساد برپا کرنے والے کی بات نہ مان۔) (سورہ ن۔11)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا "انسان جو لفظ بھی بولتا ہے تو اس کے پاس ہی نگران فرشتہ تیار ہوتا ہے۔" (ق۔18)

چغل خور

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : چغلی کا مفہوم امام نووی رحمتہ اللہ نے عنوان باب ہی میں بیان کر دیا ہے۔ جو شخص چغلی کو حلال سمجھتے ہوئے چغلی کرتا اور لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے، دراں حالیکہ اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں، ایسا شخص یقیناً" کبھی جنت میں نہیں جائے گا۔ ہاں وہ شخص جو اس کو حرام ہی جانتا ہے لیکن بشری کمزوری کی وجہ سے اس سے چغل خوری کا گناہ صادر ہو جاتا ہے تو اگر اللہ نے اس کا یہ گناہ معاف نہ کیا تو وہ پہلے اس کی سزا جہنم میں بھگتے گا اور اس کے بعد جنت میں جائے گا یعنی ایسا گناہ گار مسلمان پہلے مرحلے میں جنت میں نہیں جائے گا، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔

عذاب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دو قبروں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا۔

"ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور ان کو یہ عذاب کسی بڑی (یا زیادہ مشکل) بات پر نہیں ہو رہا۔" پھر

فرمایا "کیوں نہیں، وہ بڑی بات ہی ہے۔ ان میں سے ایک تو چغلی کھایا کرتا تھا اور دوسرا پیشاب (کے چھینٹوں) سے نہیں بچتا تھا۔"

(بخاری و مسلم اور یہ بخاری کی روایت میں سے ایک روایت کے الفاظ ہیں۔)

علماء نے کہا ہے۔

"ان کو کسی بڑی بات میں عذاب نہیں ہو رہا ہے" کا مطلب ہے: ان کے خیال میں وہ کوئی بڑی بات نہیں تھی ورنہ شریعت کی نظر میں تو وہ بڑی بات تھی۔

اور بعض نے کہا۔

کبیر سے مراد ہے کہ ان کا ترک کرنا زیادہ مشکل بات نہ تھی (وہ چاہتے تو آسانی سے اس گناہ سے بچ سکتے تھے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیشاب کرتے وقت وہ لوگوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا، بلکہ بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظروں کے سامنے ہی پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔ ظاہر ہے، یہ بے شرمی بھی گناہ ہے۔ بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ چغل خوری، پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچنا یا پردے کا اہتمام نہ کرنا یہ سب کبیرہ گناہ ہیں جن پر گرفت ہو سکتی ہے۔

2۔ اس سے عذاب قبر کا بھی اثبات ہوتا ہے جس کا بعض لوگ انکار کرتے ہیں۔

لوگوں کی گفتگو اور باتیں بلا ضرورت حکام تک پہنچانے کی ممانعت کا بیان، تاہم بگاڑ یا کوئی نقصان وغیرہ کا اندیشہ ہو تو جائز ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"گناہ اور زیادتی کے کاموں پر ایک دوسرے سے تعاون مت کرو۔" (المائدہ۔2)

کسی کی شکایت کرنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے صحابہ میں سے کوئی شخص کسی کی کوئی بات مجھ تک نہ پہنچائے، اس لیے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میں تمہارے درمیان اس حال میں نکلوں کہ میرا سینہ (ہر ایک کی بابت) صاف ہو۔"

(اسے ابوداؤد ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

دورخے شخص کی مذمت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"وہ لوگوں سے چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے، حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو ایسی باتوں میں مشورہ کرتے ہیں جو اللہ کو ناپسند ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے عملوں کا احاطہ کرنے والا ہے۔" (النساء 108)

نفاق

حضرت محمد بن زید بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے ان کے دادا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ "ہم اپنے حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو ان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان باتوں سے مختلف ہوتی ہیں جو ہم ان کے پاس سے باہر نکل کر کرتے ہیں۔"

آپ نے فرمایا "ہم ایسے رویے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نفاق شمار کرتے تھے۔ (بخاری)

فائدہ: مطلب یہ ہوا کہ حکمرانوں کے سامنے تو ان کی تعریف کرنا اور آگے پیچھے ان کی مذمت کرنا عملی نفاق ہے۔ اس لیے کہ جو دل میں ہے۔ وہ زبان پر نہیں اور جو زبان پر ہے وہ دل میں نہیں۔ ایک سچے مسلمان کا کردار تو یہ ہے کہ بادشاہ اگر اچھا، متقی اور عادل ہے تو منہ پر بھی اس کی تعریف کی جائے (اگر ضرورت پڑ جائے، خوشامد کے طور پر نہیں) اور پیٹھ پیچھے بھی اسے اچھے لفظوں سے یاد کیا جائے اور اگر وہ برا ہے تو اسے اس کے منہ پر بھی اللہ کی نافرمانی کے انجام بد سے ڈرایا جائے اور آگے پیچھے بھی یہی رویہ اختیار کیا جائے کیونکہ یہی خیر خواہانہ طرز عمل ہے جس کی تاکید ایک مسلمان کو کی گئی ہے۔ اس کے برعکس پہلا رویہ دورخے پن کا مظہر ہے جس پر سخت وعید گزشتہ حدیث میں گزری ہے۔

غزل

انشا جی

دل عشق میں بے پایاں، سودا ہو تو ایسا ہو
دریا ہو تو ایسا ہو، صحرا ہو تو ایسا ہو

اک خالِ سویدا میں، پنہائیِ دو عالم
پھیلا ہو تو ایسا ہو، سمٹا ہو تو ایسا ہو

اے قیسِ جنوں پیشہ، انشا کو کبھی دیکھا
وحشی ہو تو ایسا ہو، رسوا ہو تو ایسا ہو

دریا بہ حباب اندر، طوفاں بہ سحاب اندر
محشر بہ حجاب اندر، ہونا ہو تو ایسا ہو

ہم سے نہیں رشتہ بھی، ہم سے نہیں ملتا بھی
ہے پاس وہ بیٹھا بھی، دھوکا ہو تو ایسا ہو

اس درد میں کیا کیا ہے، رسوائی بھی لذت بھی
کانٹا ہو تو ایسا ہو، چبھتا ہو تو ایسا ہو

ہم نے یہی مانگا تھا، اس نے یہی بخشا ہے
بندہ ہو تو ایسا ہو، داتا ہو تو ایسا ہو



عید کے معنی اور مفہوم ہی خوشی اور شادمانی کے ہیں۔ سنت ابراہیمی کی یاد میں منائی جانے والی عیدالاضحیٰ عبادت اور قربانی کے ساتھ ساتھ ایک خوشیوں بھرا تہوار بھی ہے۔ کچن سے اٹھتی مزے دار' خوش ذائقہ کھانوں کی خوشبوئیں' خوش رنگ ملبوسات' بناؤ سنگھار' مہندی سے سجے' چوڑیوں سے بھرے ہاتھ.... ہر طرف گہما گہمی اور رونق نظر آتی ہے۔ سب ہی عید کی خوشیاں منانے میں مگن نظر آتے ہیں.... خاص طور پر پرتکلف ضیافتیں جب دوست' احباب' رشتہ دار ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے گلے ملتے ہیں تو سارے گلے شکوے مٹ جاتے ہیں' دلوں کی کدورتیں دور ہو جاتی ہیں' مل جل کر پکانے اور کھانے کا لطف ہی اور ہے۔

عیدالاضحیٰ قارئین کے ساتھ منانے کے لیے ہم نے سروے' کیا ہے اور قارئین سے سوالات کیے۔

1۔ عید کے تین دن ایک خوش گوار مصروفیت میں گزرتے ہیں۔ مزے دار پکوان' باربی کیو کا اہتمام' دوستوں' رشتہ داروں کی دعوتیں۔ آپ اپنی مصروفیات کا احوال لکھیں۔ آپ کے گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے یا آپ دوستوں' رشتہ داروں کے ہاں مہمان ہوتی ہیں۔

2۔ کسی عیدالاضحیٰ پر کوئی دلچسپ واقعہ پیش آیا ہو تو اس کا احوال لکھیں۔ آپ کبھی قربانی کے جانور کی خریداری کے لیے گئی ہیں؟ یہ تجربہ کیسا رہا؟

آیئے دیکھتے ہیں۔ ہماری قارئین عید کیسے مناتی ہیں۔

عیدالاضحیٰ - احباب کے ساتھ

ادارہ

لاال افضل گھمن.....لاہور

(1) قربانی کا دن بہت زیادہ مصروفیت میں نہیں گزرتا۔ خانساماں بھی ہے اور گھریلو مستقل ملازمہ بھی۔

عید کے دوسرے دن۔ ہم تمام خاندان والوں کو اپنے گھر مدعو کرتے ہیں۔ پورے لان کی صفائی کر کے دریاں چٹائیاں بچھاتے ہیں۔ گرمی ہو تو چھ عدد پیڈسٹل فین لگا کر اوپر ترپال لگا کر بہت پیارا ماحول بناتے ہیں۔ ایک طرف تین واٹر کولر اور ساتھ ہی واش بیسن تاکہ مہمانوں کو دقت نہ ہو۔ پھر مرد حضرات باہر باجماعت ظہر ادا کرتے ہیں جبکہ خواتین کے لیے علیحدہ باپردہ نماز کا بندوبست ہوتا ہے۔ نماز کے بعد مٹن بریانی' قورمہ کی دیگیں جو پچھلے لان میں پکتی ہیں.... حاضر ہو جاتی ہیں اور خواتین مرد ایک ساتھ ایک جگہ پر اکٹھے کھانے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

عید کے تیسرے روز صرف میری فیملی عارفہ معین کے گھر مدعو ہوتی ہے۔ جہاں پر بانو قدسیہ بھی مدعو ہوتی ہیں۔

(2) ایک دفعہ ہم لوگ عارفہ معین کے گھر مدعو تھے۔ ان کی قربانی عید کے تیسرے روز تھی۔ بہت پیاری موٹی تازی گائے تھی۔ بڑی مشکل سے گائے کو لٹایا گیا۔ ابھی گائے پوری طرح زیر نہ ہوئی کہ محترمہ نے رسے تڑا لیے۔ آدھی گردن کٹی اور آدھی نہیں.... گائے بپھر گئی۔ وہ منظر بھلائے نہیں بھولتا۔ سب خوف زدہ ہو گئے تھے۔ صد شکر کہ ہم لوگ چھت پر تھے.... تمام مرد حضرات کے کپڑے خون سے لت پت کسی پاکستانی مووی وحشی جٹ کا آخری منظر پیش کر رہے تھے۔

قربانی کے جانور کی خریداری کا موقع نہیں ملا کیونکہ گھر کا پالتو بکرا ہی قربان ہوتا ہے لیکن بکرا منڈی سبزہ زار لاہور میں کافی دفعہ جانے کا اتفاق ہوا ہے.... بہت پیارے پیارے جانور ہوتے ہیں۔

انجل.....ڈہرکی

عید کے تینوں دن مصروفیت ہی مصروفیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ مصروفیت گھر کے اندر ہی ہوتی ہے۔ ہم چار دیواری کے اندر مقفل لوگ ہیں۔ باہر کی دنیا ہمیں راس نہیں اور نہ ہی میں باہر نکلنا پسند کرتی ہوں۔

عید کے تینوں دن مزیدار پکوان ضرور ہی پکتے ہیں لیکن عید کے تینوں دن نہ ہم کبھی کسی کے گھر گئے اور نہ کوئی دوست ہمارے گھر آئی۔ البتہ ایک اکلوتی دوست ہے جو کہ

مجھے کبھی بھی رپلائی نہ کرنے پر بھی بڑی مستقل مزاجی سے ہر عید پر ایک عدد مبارک باد کا میسج بھیج ہی دیتی ہے (ہے' وہ بھی بڑی کنجوس) پرسنل سیل میرے پاس ہے نہیں۔ اور مانگ تانگ کر دوستوں کو میسج کرنا' فون کرنا میری انا کو گوارا نہیں۔ بھلے وہ میرے بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں بڑی اونچی ناک کی مالک ہوں۔ باقی رہا رشتے داروں کے ہاں آنا جانا تو رشتہ دار کبھی کبھار آ ہی جاتے ہیں لیکن ہم کبھی کسی کے گھر نہیں گئے۔ بالخصوص عید کے تینوں دن تو کبھی بھی نہیں۔ باقاعدہ دعوت دے کر عید کے دن کبھی کسی رشتہ دار نے بلایا نہیں اور بن بلائے ہم گئے نہیں۔ ویسے دعوتوں کے معاملے میں ہمارے رشتہ دار انتہا کے کنجوس واقع ہوتے ہیں۔

پھر بھی عید کے دن ہمیں سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ سارے بھائی گھر آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے کام ہی ختم نہیں ہوتے اور میں اکیلی نازک جان ہلکان ہوتی رہتی ہوں۔ ویسے میرے ویر بھی کم نازک مزاج نہیں۔ بھلے فریج کے پاس بھی ہی کھڑے ہوں۔ مجھے ہی آواز دے کر بلائیں گے اور پانی کے لیے کہیں گے۔

عید کے دن کا آغاز فجر کی نماز سے ہوتا ہے۔ (حالانکہ اتنی پابند نماز نہیں ہوں) ہمارے ہاں بقر عید پہ بھی صبح سویاں لازمی بنتی ہیں۔ بناتی اماں ہیں سرو میں کرتی ہوں۔ آس پڑوس میں بھی لازمی بھجواتے ہیں۔" اس کے بعد بھائیوں کی تیاری میں مدد کرواتی ہوں۔ بھائیوں کے عید نماز کے لیے جانے کے بعد پھر ہم دوبارہ کچن کا رخ کرتے ہیں اور ان کے آنے سے پہلے ہی پکوڑے' سموسے اور بھنے ہوئے چھولے تیار کر کے رکھ دیتی ہوں۔ خود مجھے بارہ ایک بجے تیار ہونے کی فرصت ملتی ہے۔ اس کے بعد قربانی سے لے کر گوشت بننے کے مرحلے تک ہم اس سب سے دور ہی رہتے ہیں مگر اس کے بعد پھر وہی کچن وہی ہم۔ اسی طرح عید کا دن تمام ہو جاتا ہے۔

(2) اب آتے ہیں آپ کے دوسرے سوال کی طرف۔ اس سوال کے لیے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ پچھلی عید کا ہی قصہ ہے کہ صبح صبح اماں نے ہمیں بکرے صاحب کی خدمت کے لیے طلب کیا اور میرے ذمے اسے چارہ ڈالنے کی ذمہ داری ڈالی اور یہ بھی کہ محترم بکرے صاحب کو تھوڑی بہت سیر بھی کروائی جائے۔ اماں کے حکم سے روگردانی کسی طور ممکن نہیں تھی۔ بلا چوں و چراں اٹھ کھڑے ہوئے اور بکرے صاحب کے آگے چارہ ڈالا لیکن چارہ کھانے کے بجائے محترم بکرے نے اپنے بڑے بڑے ڈیلے گھما کر ہمیں ٹکر ٹکر گھورنا شروع کر دیا اور ساتھ رسی چھڑانے کی کوششیں بھی شروع کر دیں۔ اس سے پہلے کہ ہم سچویشن سمجھ پاتے۔ بکرے صاحب جلدی سے رسی چھڑا کر یہ جا وہ جا۔ پلک جھپکنے کی دیر میں بکرا پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ پھر تو جی سب گھر والوں کو اطلاع ہو گئی اور بکرے کی کھوج مہم شروع ہوئی لیکن بکرا صاحب تو جیسے چھلاوا ثابت ہوئے مل کے ہی نہیں دے رہے تھے۔ اور پھر آخر کار بڑی تلاش بسیار کے بعد بکرے صاحب اس خالی کمرے سے برآمد ہوئے جس کی کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس دوران اماں سے ہماری جو گوشمالی ہوئی' وہ رہنے ہی دیں تو اچھا ہے۔

آخر میں آپ سب کو عید الاضحیٰ کی پیشگی مبارک باد۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ سیلاب زدگان کی مصیبتیں دور کرے اور اس مشکل گھڑی میں تمام پاکستانیوں کو متحد ہو کر تمام تفرقے بھلا کر بحیثیت ہم وطن اور مسلمان ہونے کے ان کی امداد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اور آخر میں یہ شعر اہلیان وطن کے نام۔

تیرہ شبوں کو پھر سے جگمگائے ہلالِ عید
سندیسہ بہار بن کے آئے ہلالِ عید
تمنا ہے کہ دیکھیں نئی سحر کی رنگینی
اے کاش نوید صبح لے کے آئے ہلالِ عید

سفینہ عظیم ..... کھڈیاں خاص قصور

1 عید الاضحیٰ کے تین دن بہت خوشگوار مصروفیت میں گزرتے ہیں۔ میں تو عید سے پہلے کی پوری رات سوتی نہیں ہوں۔ کبھی سلائی کا ادھورا کام نمٹاتی ہوں تو کبھی بہنوں اور ہمسائیوں کی لڑکیوں کو مہندی لگاتے لگاتے تھک جاتی ہوں اور اکثر اپنے ہی نہیں لگا پاتی۔ صبح نماز کے بعد سے ہی نماز عید کی تیاری شروع۔

عید گاہ سے واپسی پر خالہ کے گھر پہ بولا جاتا ہے اور وہاں سے کوک' نمکو' گول گپے وغیرہ کھا کر گھر آجاتے ہیں مگر..... گھر آتے ساتھ ہی بھوک چمک اٹھتی ہے۔ پر قربانی سے پہلے کھانا کدھر سے۔ قربانی کے بعد عزیز و اقارب کے ہاں سے آنے والا تحفتاً "گوشت سنبھالا جاتا ہے اور تب تک امی اور بڑی بہن مل کر کھانا تیار کر لیتی ہیں عید والے دن



کڑاہی گوشت 'سندھی بریانی لازمی طور پر پکائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھائی سے فرمائش کر کے آئس کریم کھائی جاتی ہے۔ یوں عید کے پہلے خوشگوار دن کا اختتام ہو جاتا ہے لیکن سونے سے پہلے سب دوستوں کو وش کرنے کے بعد حال احوال پوچھنا اور پھر ہنسی مذاق کرنا عید کی خوشیوں کو دوبالا کر دیتا ہے۔

عید کے دوسرے دن میں اپنی دوستوں کے گھر ضرور جاتی ہوں اور عزیز و اقارب بھی ہمارے گھر آتے ہیں۔ یوں ایک طرح سے دعوت کا اہتمام بھی ہو جاتا ہے اور یہ دعوتیں عید کے تین دن تک جاری رہتی ہیں۔ اس بار کی عید پہلے سے زیادہ مصروف گزرے گی کہ پہلے ہم قربانی نہیں کرتے تھے مگر اب الحمد للہ قربانی کریں گے 'یوں قربانی کا گوشت دوستوں' رشتہ داروں اور غربا و مساکین میں بانٹنے سے اس عید پر روحانی خوشی بھی حاصل ہو گی۔

2 ہاں جی عید الاضحیٰ کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ ہے اور اس عید پر میری کزن عائشہ جس کی اب شادی ہو گئی اور آپی آمنہ جواب دو خوب صورت سے دو بیٹوں کی ماں ہیں 'ہمارے ساتھ تھیں۔ عید پر سب کزنز نے گھومنے پھرنے کا پروگرام بنایا اور خالہ کی ہمراہی میں ہم سید پور کی سیر کو نکل گئے۔ وہاں سے واپسی پر سب ہمارے گھر جمع ہو گئے۔ کافی رونق لگی ہوئی تھی تو بھائی کو شرارت سوجھی کہ سب خواتین صرف خواتین اگر میری شرط جیت گئیں تو جو متفقہ طور پر مانگیں گی' کھلاؤں گا۔ لو جی اب ہم سب بہنیں اور کزن پر جوش ہو گئیں ساتھ میں امی اور خالہ بھی شامل ہو گئیں۔

شرط یہ لگی کہ سنا گیا ہے کہ جہاں دو خواتین بیٹھی ہوں اور خاموشی ہو تو یہ سب سے بڑا جھوٹ تصور کیا جاتا ہے۔ تو بھائی نے کہا کہ آپ سب خواتین پانچ منٹ تک بالکل خاموش (نہ ہنسنا اور نہ بولنا ہے) رہ کر دکھا دیں۔ انعام کے طور پر جو کہیں گی وہ کھلاؤں گا۔

بھائی کی شرط سب خواتین نے مان لی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔ ٹائم نوٹ کرنے کی ذمہ داری ابو نے لے لی۔ ٹائم شروع ہوتے ہی سب منہ چھپا کے بیٹھ گئیں تو بھائی نے ٹوک دیا کہ نہیں سیدھا ہو کر بیٹھو' منہ نہیں چھپانا۔ چلو جی سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کریں کہ کہیں ہنسی نہ نکل جائے۔ مارے ضبط کے میری کزن کا چہرہ سرخ ہو گیا جس کا بعد میں بہت ریکارڈ لگا۔ پانچ منٹ پورے ہو گئے جیسے تیسے اور ٹائم پورا ہوتے ہی وہ ہنسی اور شور اٹھا کہ بس۔

شرط جیتنے کے بعد سب خواتین کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے کہ جی ہم نے ورلڈ ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ پھر بھائی نے اپنی شرط پوری کی اور سب کو آئس کریم کھلائی بھی اور سب کے چہروں پہ لگائی بھی۔ یوں وہ عید ایک یادگار عید کے طور پر ہمیشہ یاد رہے گی۔ اور ایک بات میں کہنا بھول گئی کہ ہر عید پر شعاع اور خواتین ہمیشہ ہر خوشی میں ہمراہ ہوتا ہے اور پیاری پیاری رائٹرز کی پیاری تحریریں عید کا مزا دوبالا کر دیتی ہیں۔

بینش اشرف..... ککھڑ شی

جیسے ہی عید کا چاند نظر آتا ہے، شور شرابا شروع ہو جاتا ہے۔ بکرا تو ابو اور بھائی لے کر آتے ہیں۔ ہمارے گھر میں بکرا عید سے صرف ایک دن پہلے آتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے گھر کوئی بھی جانور، پرندہ زندہ نہیں رہتا۔ واللہ عالم۔

بکرے کو سنوارتے ہیں۔ اس کو مہندی لگاتے ہیں۔ ہاتھ میں پکڑ کر چارہ کھلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تصویریں اور مووی بنواتی ہوں۔

خالہ جی اور امی کی دوستیں آجاتی ہیں۔ بھائی بھی انٹرنیٹ سے آجاتے ہیں بکرا بھائی کو دکھا کر ذبح کرتے ہیں۔ اسی میں عصر ہو جاتی ہے۔ اس دوران مہمان وغیرہ آتے رہتے ہیں۔ آپیاں ساتھ ساتھ ان کی بھی مہمان نوازی کر رہی ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ اسکائپ پہ کبھی بھائی سے تو کبھی میں اپنی دوست سے بات کر رہی ہوتی ہوں۔

آپی سے پوچھ کرتاتی ہوں کہ میری پسندیدہ ڈش کون سی ہے۔ آپی کہہ رہی ہیں کہ بریانی، دہی بھلے، گول گپے، ٹماٹر گوشت، نوڈلز وغیرہ۔

عید والے دن ہمارے گھر میں صرف کلیجی پکتی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ آپ کے گھر اتنے مہمان کہاں سے آتے ہیں۔ تو ہم سب ہنس کر کہتے ہیں اللہ کی رحمت ہے اور اللہ خوش ہوتا ہے تو مہمان آتے ہیں۔

ہم سب کا متفقہ نعرہ "بندہ سارا سال کھاتا ہے۔ اگر اب بھی خود ہی کھانا ہے تو فائدہ نام کرنے کا۔"

آخر میں یہ کہ میرے خیال میں صرف عید پر قربانی کر دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ اپنی پسندیدہ چیز دوسروں کو دے دینا اصل قربانی ہے۔ گوشت بانٹتے وقت میرے ذہن میں

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے۔

مسرت الطاف احمد..... کراچی

1 عیدالاضحیٰ کی آمد سے پہلے ہی عید کی خوب ساری تیاری کرلی جاتی ہے لیکن پھر بھی عیدالاضحیٰ میں ہماری مصروفیت کچن میں دیکھنے والی ہوتی ہے۔ قربانی کے بعد امی اور بہنوں کے ساتھ خاندان والوں، پڑوسیوں میں گوشت تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان غریب لوگوں کے لیے بھی گوشت کا ایک حصہ رکھا جاتا ہے جو سارا سال گوشت لینے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ قربانی کے بعد گھر کی صفائی ستھرائی پر خاص توجہ دی جاتی ہے پھر سب گزنز کو کلیجی کا ناشتہ کرایا جاتا ہے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم اہتمام سے تیار ہوتے ہیں، پھر رات کو باربی کیو کا پروگرام ارینج کرتے ہیں۔ ہم اپنے حصہ کا گوشت باہر بہاری بوٹی بنوانے کے لیے بھی دیتے ہیں۔ دعوتوں کا سلسلہ عید تو کیا، عید کے بعد بھی چلتا رہتا ہے لیکن عید کے دوسرے دن دادا ابو کے گھر گیٹ ٹو گیدر ضرور کرتے ہیں۔

2 ماضی کے دریچوں میں جھانکا تو دلچسپ تو نہیں ہاں ایک ایسا واقعہ ذہن کے پردے پر لہرا رہا ہے جو بہت ہی تکلیف دہ اور کوفت زدہ ہے۔

عیدالاضحیٰ کے پرمسرت موقع پر قربانی کے لیے سب سے پہلا خیال قصائی کا آتے ہی جان نکل جاتی ہے، جو بہت ہی محنت طلب اور مشکل ترین کام ہے۔ عیدالاضحیٰ کی جتنی خوشی جانوروں کی خریدنے اور سجانے و سنوارنے میں ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ تکلیف قصائی کو ڈھونڈنے، اسے کنوینس کرنے اور اس کی منت سماجت کرنے میں ہوتی ہے اور یہی ہمارے گھر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

دو سال پہلے ابو ہمارے لیے مغرور آنکھوں والی گائے لے کر آئے۔ اتنی خوشی گائے کے آنے پر نہیں ہوئی جتنی کوفت اور اذیت قصائی کے انتظار کرنے پر ہوئی۔ قصائی کے وعدے کے مطابق پہلے دن ذبح ہونے والی گائے عید کے دوسرے دن بھی ظہر تک قربانی کے انتظار میں کھڑی رہی۔ طویل انتظار کے باوجود جب قصائی نے اپنی جھلک نہیں دکھائی تو ابو کا غصہ ہم معصوم اور سہمی چڑیوں پر نکلنے لگا۔ ابو نے ہمیں سنانا شروع کیا کہ آپ لوگوں کی وجہ سے میں گائے لاتا ہوں ورنہ میرا تو ارادہ بکرا لانے کا تھا۔

اب ہم کیا کریں سوائے دعائیں کرنے کے ....

خیر اللہ اللہ کرکے جب قصائی صاحب آئے تو ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ قصائی لیٹ آنے کے باوجود شرمندہ ہونے کے بجائے قربانی کے جانور کو دیکھ کر اپنے آپ پر گھمنڈ کرنے لگے۔ اسے ذبح کرنا میرے لیے مشکل نہیں۔ یہ تو بس دس، پندرہ منٹ میں ہو جائے گا۔ مگر شاید گائے کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ گائے کے پیروں میں رسی باندھتے ہی اس نے قصائی کی آنکھ پر جولات ماری تو قصائی کی دلخراش چیخ ہم سب کے ساتھ ساتھ محلے کے ایک دو معزز افراد نے

بھی سنی۔ لیٹ آنے کی سزا ہماری طرف سے خود گائے نے ہی قصائی کو دی۔ یہ سبق قصائی صاحب کو ہر عید الاضحیٰ پر یقیناً" یاد رہے گا۔

فہمیدہ اجمل..... ساہیوال

ہمارے عید کے تین دن انتہائی دلچسپ مصروفیت میں گزرتے ہیں کیونکہ ہم سات دیورانیاں 'جٹھانیاں عید کے موقع پر اکٹھی ہوتی ہیں۔ کوئی اپنے نواسوں پوتوں کے ساتھ تو کوئی اپنے چنو منو کے ساتھ۔ اصل عید تو بچوں اور مہمانوں کی ہوتی ہے۔ کھیر اور شاہی ٹکڑے میں رات کو ہی بنا کر رکھ لیتی ہوں۔ دہی بڑے اور فروٹ چاٹ میری دیورانی صبح اٹھ کر بناتی ہے۔ ہم لوگ نمکین عید پر میٹھا زیادہ شوق سے کھاتے ہیں۔ گھر والوں کے ساتھ تو پتا نہیں لیکن کام والیوں کے ساتھ میں عید کے تینوں دن کھیر سے زیادہ میٹھی ہوتی ہوں۔

اگر بکرا ہو تو عید کے دن ہی قربانی کرلی جاتی ہے اور پچاس بندوں میں بکرے بچارے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ گائے کے لیے قصائی صاحب ٹائم ہی اگلے دن کا دیتے ہیں اور ہماری عید سے اگلے دن اصل مصروفیت شروع ہوتی ہے۔ گوشت کے پیک بنا کر فٹافٹ رکھ دیتے ہیں تاکہ سب کو دینے میں آسانی رہے اور وہ ٹائم پر ہی تقسیم ہو جاتا ہے۔ تھوڑا سا پلاؤ کے لیے علیحدہ کرتے ہیں۔ کوئی ایک سالن بنانے لگتی ہے۔ باقی گوشت کا قیمہ بنوالیا جاتا ہے اور شام کو باربی کیو کا انتظام ہوتا ہے اور دعوت عام۔

یہ روایت میری سسرال میں تقریباً" پچیس سال سے چلی آرہی ہے۔ پہلے صرف تکے کباب ہوتے تھے۔ پھر چکن تکہ کا اضافہ ہوا 'پھر نان کا۔ مغرب کے فوراً" بعد کباب بنانے والا آجاتا ہے۔ شام کو سارا گھر جگمگ کرتا ہے۔

خوب رونق ہوتی ہے۔

ہمارے گھر میں تو آٹھ بھائیوں اور دو بہنوں کے بچے ہی جمع ہو جائیں تو شادی والا گھر لگتا ہے اور جب شام کو باقی لوگ بھی آجائیں تو خوب ہی محفل جمتی ہے۔ میرے ساتھ کم از کم پانچ ہیلپرز ہوتی ہیں۔ لڑکے سارے علیحدہ ڈیوٹی دیتے ہیں۔ جب سب مہمانوں کے جانے کے بعد بڑے لڑکوں کا گروپ جو سرونگ میں لگا ہوتا ہے 'وہ لوگ اپنے بچائے ہوئے کباب تکہ اور کولڈ ڈرنک نکالتے ہیں تو پھر خوب چھینا جھپٹی ہوتی ہے۔

2 دلچسپ اور یادگار واقعہ یہ ہے کہ پچھلے سال ہمارے ایک جیٹھ صاحب کی عید سے اگلے دن یعنی کباب پارٹی والے دن ویڈنگ اینورسری تھی۔ لہٰذا کسی مہمان کا لایا ہوا کیک بچالیا گیا اور مہمانوں کے جانے کے بعد انہوں نے کیک کاٹا اور خوب ہلا گلا ہوا۔ کیونکہ ہمارے گھر میں آج تک کبھی کسی قسم کی سالگرہ نہیں منائی گئی لیکن اس دن میں نے کہا یہ تو اللہ پاک نے خود کیک بھیج دیا ہے۔ اب یہ کفران نعمت ہے۔ ویسے بھی کھانا ہے۔ باقاعدہ کاٹ لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ پھر اتنا مزا شاید شادی پر نہ آیا ہو گا جتنا اس دن آیا۔

ہم لوگ کبھی جانور خریدنے نہیں گئے۔ کیونکہ مرد حضرات خود ہی اچھی سی گائے لے کر کسی گاؤں میں باندھ دیتے ہیں۔ البتہ بکرا ایک دن پہلے آتا ہے اور وہ گھر میں ہی باندھا جاتا ہے۔ اگر کبھی یہ سارے بھائی بھتیجے اکٹھے بکرا خریدنے چلے جائیں تو شاید بکرے والا بھی کہے کہ باؤ جی میں نے بیچنا ہی نہیں ہے۔

یوں عید سے تیسرے چوتھے دن سب کی واپسی شروع ہوتی ہے۔ پھر ہم ہوتے ہیں اور بکھرا ہوا گھر اور لمبی تھکان۔ کبھی ہمارے ساتھ عید منا کر دیکھیں امزا نہ آئے تو سروے واپس۔





کھانا پکانے کی ماہر

ردا آفتاب سے ملاقات

شاہین رشید

بقر عید کی آمد آمد ہے اور پکوان چینلز میں خواتین کو سگھڑ بنانے کے لیے مزے مزے کے کھانے پکانے بھی سکھائے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم نے آپ کے لیے اس بار معروف شیف ردا آفتاب سے ملوانے کا اہتمام کیا ہے۔

★ ''کیسی ہیں ردا آپ؟''

✲ ''جی اللہ کا شکر ہے۔''

★ ''آج کل کیا مصروفیات ہیں اور کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟''

✲ ''مصروفیات تو جی گھر کی اور پھر چینل کی ہیں۔ پہلی ترجیح میرا گھر ہے۔۔۔ صبح اٹھ کر پہلے گھر کی نوک پلک سنوارتی ہوں، کوکنگ کرتی ہوں پھر میرا یو ٹیوب بھی ہے اور چینل پہ تو آپ کو نظر آتی ہی رہتی ہوں۔''

★ ''ترقی کا یہ سفر کہاں سے شروع ہوا اور کہاں تک پہنچا' کچھ اس کے بارے میں بتایئے؟''

✲ ''شروعات اس طرح ہوئی کہ مجھے کھانے پکانے کا شوق تھا میں خود سے بھی نت نئے کھانے پکانے کی کوشش کرتی تھی اور جب وہ کھانے اچھے پک جاتے تھے تو میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے کھانے کی ریسپی کسی میگزین یا اخبار میں دوں۔ چنانچہ میں نے ڈالڈا کا دستر خوان میں اپنی تراکیب بھیجیں تو انہیں بہت پسند آئیں۔۔۔ اور مجھے باقاعدہ لکھنے کے لیے کہا گیا۔ پھر میرے گھر میں ہی فوٹو شوٹ ہونے لگا۔ کھانا پکانا اس کی ڈیکوریشن اس کی پریزنٹیشن کرنا ٹوٹل کام میرے گھر پر ہی ہوتا تھا۔۔۔ کافی ٹائم میں اس میگزین کے لیے کام کرتی رہی۔۔۔ فوٹوگرافر کاشف اکثر میرے گھر کھانا وغیرہ بھی کھاتے تھے اور مجھ سے کہتے بھی تھے کہ آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ آپ کسی کوکنگ چینل پہ بھی

ٹرائی کریں... میں نے کہا گھر والوں کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ پھر اے آر وائی نے "کچن" کے نام سے ایک پروگرام شروع کیا۔ تو میں نے انکار کر دیا کہ میں لائیو شو نہیں کرتی' پھر انڈس والوں نے بلایا... راحت عمرہ کرنے جا رہی تھیں اس وقت کاشف کے ہی ریفرنس سے انہوں نے مجھے بلایا تھا... اور پھر میں نے انکار نہیں کیا اور راحت کی جگہ میں نے پروگرام کیے تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ پھر ٹی وی ون پہ کیا۔ آج ٹی وی پر بھی کیا۔ ایک دن مصالحہ والوں نے بلایا اور مجھے مستقل طور پر ہائر کر لیا اور اب تقریباً" پانچ سال سے میں مصالحہ چینل کے لیے ہی کام کر رہی ہوں۔"

★ "آپ میگزین کے لیے تو کام کر رہی تھیں' پھر چینل کو انکار کرنے کی کیا وجہ تھی؟"

✻ "بس ایک دم سے اسکرین پہ آنا اور وہ بھی لائیو شو کے لیے تو وہ میرے لیے تھوڑا مشکل تھا۔ کیونکہ مجھے تو عادت ہی نہیں تھی۔ جب میرے پروگرام ریکارڈ ہونے شروع ہوئے اور کیمروں سے میری دوستی ہو گئی تو پھر میں نے لائیو پروگرام شروع کیے۔"

★ "اب آپ کیا محسوس کرتی ہیں کہ لائیو شو کرنا زیادہ آسان ہے یا ریکارڈنگ کروانا بہتر رہتا ہے؟"

✻ "لائیو زیادہ بہتر ہے کیونکہ۔ آپ کو کالز کے ذریعے فوراً" رسپانس مل جاتا ہے کہ لوگ آپ کو پسند کر رہے ہیں یا نہیں... ریکارڈنگ میں تو کچھ پتا نہیں چلتا... کوئی پیچھے گالیاں بھی دے رہا ہو گا تو پتا نہیں چلے گا اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ہمیشہ بہت اچھا رسپانس ملا۔"

★ "کبھی لائیو شو میں کوئی حماقت ہوئی' کبھی کوئی غلطی ہوئی؟"

✻ "نہیں کبھی نہیں۔ کیوں کہ میں بڑے کانفیڈینس کے ساتھ کام کرتی ہوں اور میرا پورا فوکس کوکنگ پہ ہی ہوتا ہے کیونکہ ساری دنیا میں ہمارا چینل دیکھا جا رہا ہوتا ہے۔ تو ذرا سی بھی غلطی کرو تو فوراً" پکڑی جاتی ہے۔ اس لیے بہت توجہ اور خیال سے پروگرام کرتی ہوں۔"



★ "عموماً" لڑکیوں کو اپنی پڑھائی کی وجہ سے یا سستی کی وجہ سے کوکنگ کا شوق نہیں ہوتا' مائیں سسرال کا کہہ کہہ کر کوکنگ کی طرف راغب کرتی ہیں تو آپ کو کیسے شوق ہوا؟"

✻ "بس شاید قدرتی طور پر ہی مجھے شوق تھا اور آپ یقین کریں کہ میں نے خود سے کافی ریسپیز کری ایٹ کی ہیں جیسے بریانی کو مختلف انداز میں پکانا یا دیگر کھانوں کو اور شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن بڑے بڑے شیف نے میری ریسپیز کی کاپی کی ہے۔"

★ "کہیں باہر سے کچھ سیکھا ہے؟"

✻ "جی باقاعدہ میں نے کورسز کیے ہیں۔ پاکستان سے بھی کیے اور پاکستان سے باہر بھی۔ رنگون والا سے میں نے سیکھا۔ اپنی امی سے بہت کچھ سیکھا۔ خود بھی بہت کچھ کری ایٹ کیا۔"

★ "کوکنگ چینل کتنے ضروری ہیں آج کل کے دور میں اور آپ مطمئن ہیں؟"

✻ "میرے خیال میں بہت ضروری ہیں اور بہت

اچھی بات ہے کہ اس طرح کے چینلز ہیں۔ ادھر ادھر جا کر سیکھنے میں ٹائم بہت لگ جاتا ہے۔ جبکہ ان چینلز کے ذریعے آپ گھر بیٹھے سب کچھ سیکھ جاتی ہیں۔ ہم نے یعنی میں نے تو بہت ساری پرابلمز کے بعد یہ مقام پایا ہے۔ اگر مجھے چینلز کی سہولت نہ ہوتی اور فیس بک کی بھی تو میں یقیناً "کوئی کوکنگ انسٹی ٹیوٹ چلا رہی ہوتی۔ میں اپنے کام سے بہت خوش اور بہت مطمئن ہوں۔"

★ "اپنے بوتیک کے بارے میں بتائیں؟"

✱ "جی زمزمہ میں میرا بوتیک ہے۔ اگرچہ بوتیک کھولنے کا کوئی شوق تو نہیں تھا لیکن سائیڈ بزنس کے طور پر کھولا ہے اور اس کے علاوہ "رداز" کے نام سے میری کیٹرنگ بھی ہے تو اللہ کا بڑا کرم ہے۔"

★ "کہتے ہیں کہ شیف خواتین 'حضرات کھانے پکانے کا ایک گر اپنے ہاتھ میں ضرور رکھتے ہیں۔ ایسا ہے؟"

✱ "جی بالکل آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بہت سارے شیف ایسا کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کیونکہ اللہ نے مجھے جو عزت دی ہے وہ اسی لیے دی کہ میں ہر کام بہت ایمان داری کے ساتھ کرتی ہوں اور وہ ہی سب کچھ سکھاتی ہوں جو خود اپنے لیے استعمال کرتی ہوں۔"

★ "بازار کے مسالا جات زیادہ بہتر نہیں رہتے بہ نسبت اس کے کہ ایک چمچہ اس کا اور دو اس کے... پھر سب مسالے خرید کر رکھو۔"

✱ "میں تو سمجھتی ہوں کہ بازار کے مسالوں کا ٹرینڈ تو اب ختم ہی ہو گیا ہے۔ اب تو جب سے کوکنگ چینل شروع ہوئے ہیں۔ لوگ خود ہی پکاتے ہیں اور ہم لوگوں نے تو بہت آسانی کر دی ہے 'میں نے تو پورے بارہ مسالے بتا دیے ہیں اپنے پیج پہ 'تو لوگوں کو بہت آسانی ہو گئی ہے۔ مجھے تقریباً" دس سال ہو گئے ہیں اس فیلڈ میں 'لیکن کسی نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ہم نے آپ کی رسیپی استعمال کی تو ہمارا کھانا خراب ہو گیا بلکہ سب نے ہمیشہ تعریف ہی کی ہے۔"

★ "کانٹی نینٹل کھانے بھی سکھاتی ہیں... لوگ اس میں دلچسپی لیتے ہیں کیا؟"

✱ "مجھے دیسی کھانوں سے زیادہ دلچسپی ہے اور بدیسی کھانوں میں لوگ زیادہ تر چائنیز کھانے ہی پسند کرتے ہیں یا پھر اٹالین۔ جیسے پزا اور پاستا وغیرہ اور اس میں بھی آپ کو پتا ہی ہے کہ ہم اپنا پاکستانی ذائقہ ضرور شامل کرتے ہیں کیوں کہ ان کے اوریجنل کھانے آپ نہیں کھا سکتے۔"

★ "بڑے بڑے ہوٹلوں میں مرد شیف کیوں ہوتے ہیں خواتین کیوں نہیں ہوتیں۔ جب کہ یہ شعبہ خواتین کا ہے؟"

✱ "ویسے تو اب بہت سارے ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ میں خواتین شیف کام کر رہی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرد شیف زیادہ ہیں شاید اپنے شوق اور پیسے کی وجہ سے۔"

★ "گوشت کو محفوظ کس طرح کریں؟"

✱ "فریز کیا ہوا گوشت زیادہ عرصہ کھایا نہیں جاتا۔ اکثر خواتین بڑے بڑے شاپر میں گوشت بھر کر رکھ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کیا کریں اس سے گوشت خراب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اور اس میں بکٹیریا پیدا ہو جاتا ہے اپنی ضرورت کے گوشت کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ بنائیں اور جب پکانا ہو ایک یا دو پیکٹ نکال کر پکالیں...

دوسری بات یہ کہ گوشت میں نمک اور ہلدی لگا کر رکھیں 'ایک تو اس طرح گوشت کی مہک ختم ہو جائے گی۔ نمبر دو گوشت جلدی گل بھی جاتا ہے۔ گوشت کو دھو کر نہ رکھیں بلکہ پکانے سے پہلے اسے دھولیں۔ اس طرح نمک اور ہلدی بھی صاف ہو جائے گی اور گوشت جلدی گل بھی جائے گا۔"

★ "لوگ دل گردے پائے اور کلیجی مغز بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ انسانی صحت کے لیے کتنے ضروری ہیں اور ان کو فریز کرنا چاہیے؟"

* "آج کل زندگی میں چلنا پھرنا اور ایکسر سائز وغیرہ تو رہی ہی نہیں ہے۔ گھر سے نکلے گاڑی میں بیٹھے اور منزل تک پہنچ گئے۔ اس لیے ان چیزوں سے تو پرہیز ہی کریں۔ لیکن چونکہ عید کا تہوار ہے اور کھانے کو دل چاہتا ہے تو پھر اگر کلیجی پکا رہی ہیں تو ادرک لہسن کا استعمال زیادہ کریں۔ پھر چربی والا گوشت کھانے سے بھی پرہیز کریں۔ کلیجی گردے اور مغز کو اسٹور نہ کریں بلکہ تازہ تازہ پکا کر کھالیں۔ کلیجی کو ہمیشہ تیز آگ پہ پکائیں اور مغز کو پکانے سے پہلے نیم گرم پانی میں رکھیں تاکہ اس کی رگیں آسانی سے نکالی جاسکیں۔"

★ "ساتھ ساتھ تھوڑے سے نجی سوال بھی ہو جائیں۔ مزاج کی کیسی ہیں... غصہ آتا ہے آپ کو؟"

* "میں جی بڑی خوش مزاج ہوں ہر ایک کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے ملتی ہوں اور زیادہ بہتر تو آپ کو وہی لوگ بتا سکیں گے جو مجھے قریب سے جانتے ہیں۔ ساتھ رہتے ہیں۔"

★ "اور اتنے مزے مزے کے کھانے جو آپ پکاتی ہیں وہ اسٹاف کے حصے میں آتا ہے یا آپ گھر لے جاتی ہیں؟"

* "نہیں جی ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے چینل پہ جو بھی کوکنگ ہوتی ہے اس کا پہلے فوٹو شوٹ ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد وہ پیک ہوتا ہے اور ہماری اونر ہیں سلطانہ آپا (سلطانہ صدیقی) کے گھر چلا جاتا ہے...."

★ "اچھا... آپ لوگ خود مزے نہیں کرتے کیا دل بھی نہیں چاہتا؟"

* "نہیں نہیں وہاں کوئی بھی ٹیسٹ نہیں کرتا... اور دل بھی نہیں چاہتا کیوں کہ میں سمجھتی ہوں کہ جتنے بھی شیف ہوتے ہیں ان کا دل چاہتا ہے کہ خود نہ کھائیں بلکہ دوسروں کو کھلائیں۔"

★ "اور جناب شادی ہوئی... بچے ہیں اس فیلڈ میں؟"

* "جی شادی ہوئی' ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے ابھی وہ چھوٹے ہیں... بڑے ہوں گے تو اپنی فیلڈ کا انتخاب



خود کریں گے۔"

★ "آپ کے اپنے گھر والوں کے تو بڑے مزے ہوں گے۔ روز مزے مزے کے کھانے کھانے کو ملتے ہوں گے؟"

✱ "ایک زمانہ تھا کہ بہت کھلایا کرتی تھی۔ مگر اب تو مصروفیات اتنی زیادہ ہو گئی ہیں کہ ٹائم ہی کم ملتا ہے۔ میرے میاں صاحب تو کھانے کے شوقین ہیں لیکن بچے شوقین نہیں ہیں۔۔۔ ویسے بھی ہمارے یہاں بہت سمپل کھانا بنتا ہے اور گھر کا کھانا ہی کھایا جاتا ہے۔"

★ "باہر کھانا کھاتی ہیں تو نقص نکالتی ہیں اور ریڈیو پہ بھی جاتی ہیں؟"

✱ ہنستے ہوئے "ہاں کیوں نہیں۔ کوئی نہ کوئی کمی نظر آ ہی جاتی ہے اور پہلے تو خوب دعوتیں کرتی تھی خاندان والوں کی مگر اب ٹائم ہی نہیں ملتا اور ریڈیو پہ میں تقریباً" چار سال سے کام کر رہی ہوں۔"

★ غیر ملکی چینل یا ریڈیو سے پروگرام کرنے کی آفر آئی؟"

✱ "ہمارے چینل والے وہاں کے کسی چینل یا ریڈیو پہ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور یہاں بھی کوئی ہمیں بہ حیثیت مہمان کے بلاتا ہے تو ہم اجازت لے کے جاتے ہیں۔۔۔ باہر سے اکثر آفرز آتی ہیں۔ مگر میں نے انہیں بتا دیتی ہوں کہ اجازت نہیں ہے۔"

★ "تکہ بوٹی جھٹ پٹ پکائیں؟"

✱ اجزا

گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں
لال مرچ کٹی ہوئی
ادرک لہسن کا پیسٹ
نمک
بھنا ہوا زیرہ
پپیتے کا پیسٹ
آئل

ترکیب:

گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر کے اس میں دو چائے کے چمچے کٹی ہوئی لال مرچ 'ایک چائے کا چمچہ پسا ہوا ادرک لہسن پیسٹ' دو چائے کے چمچے زیرہ تھوڑا سا پپیتے کا پیسٹ اور چار کھانے کے چمچے آئل کے ڈال کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں اور توے یا کڑاہی میں قدرے تیز آنچ پر پکائیں زبردست تکہ بوٹی تیار ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے روا آفتاب صاحبہ سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- ماریہ
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا



1 "اصلی نام؟"
"سحرش احتشام۔"
2 "پیار کا نام؟"
"عیشا ہی کہتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش/ شہر؟"
"13 جون 1989ء / کراچی۔"
4 "قد/ ستارہ؟"
"5 فٹ 4 انچ اور ستارہ جیمنائی۔"
5 "بہن بھائی/ آپ کا نمبر؟"
"تین بہنیں ایک بھائی۔ مجھے ملا کر ہم چار بہنیں ہیں اور میں اپنے خاندان میں سب سے بڑی ہوں اور سب کی آپی ہوں۔"
6 "شادی؟"

باتیں عیشا نور سے

شاہین رشید

"ان شاء اللہ اگلے سال میں متوقع ہے۔ والدین کی پسند سے ہوگی۔"
7 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویشن کر چکی ہوں۔ ایم بی اے کرنے کا ارادہ ہے۔"
8 "شوبز میں آمد؟"
"اتفاقاً۔"
9 "گھر والوں کا ردعمل؟"
"پہلے پہل تو سب نے منع کیا مگر مما نے سب کو قائل کر لیا۔"
10 "پہلا کمرشل/ ڈراما؟"
"پہلا کمرشل "نیلی نار" کا تھا اور پہلا ڈراما ڈراما سیریز "عورت کی کہانی" کا ایک کھیل تھا۔"
11 "وجہ شہرت؟"
"سوپ تھا خوشبو کا گھر۔"

12 "شوبز کی کوئی خاص بات؟"
"ٹیلنٹ کو آگے نہیں بڑھنے نہیں دیتے بلکہ آج کل

15 "کیا صبح اٹھتے ہی ناشتے کی طلب ہوتی ہے؟"
"جی ہاں ہاتھ منہ دھو کر ناشتا کرتی ہوں امی کے ہاتھ کا۔"
16 "کس بات سے چڑ ہوتی ہے؟"
"کہ جب میں تھکی ہوئی گھر آؤں تو کوئی مجھ سے سوال نہ کرے۔ کوئی کرتا ہے تو چڑ جاتی ہوں۔"
17 "تہوار جوش و شوق سے مناتی ہیں؟"
"ایک تو قومی تہوار 14 اگست کو جھنڈیاں بھی لگاتی ہوں اور گاڑی میں بھی جھنڈا۔ لگاتی ہوں اور عید کے تہوار تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔"
18 "اپنے آپ میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"میری دور کی نظر کمزور ہے تو بس سوچتی ہوں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

19 "شدید بھوک ہو تو؟"

"میرا بلڈ پریشر لو ہو جاتا ہے۔ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھانے کی چیز اپنے پاس رکھتی ہوں۔"

20 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"

"ہر شخص اگر ایمان دار اور اپنے ملک کے ساتھ مخلص ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"

21 "اخبار کا مطالعہ کرتی ہیں؟"

"صرف اتوار کا اخبار پڑھتی ہوں۔ شوبز کا صفحہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔"

22 "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"اپنی برتھ ڈے کا۔"

23 "شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟"

"شاپنگ کے لیے۔"

24 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"

"ٹریٹ دے کر' باہر کھانا کھلا کر' گفٹ دے کر۔"

25 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"ضد ہے..... مگر بہت زیادہ نہیں..... پھر مان بھی جاتی ہوں۔"

26 "کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟"

"سوال کر لیتی ہوں کہ بھائی صاحب کیا مسئلہ ہے۔"

28 "کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"امی کے۔ امی کا غصہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ پھر وہ بات کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔"

29 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"گھر کی ذمہ داری..... جو کہ لڑکیوں کو شادی کے بعد ملتی ہے۔"

30 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا.....؟"

"سنگل..... اپنا اپنا..... اکاؤنٹ ہونا چاہیے۔ اپنا پیسہ اپنے ہاتھ میں ہی ہونا چاہیے۔"

31 "کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟"

"آسٹریلیا مجھے بہت پسند ہے تو آسٹریلیا کی شہریت چاہوں گی اور کوشش یہی ہے کہ شادی کے بعد وہاں سیٹل ہو جاؤں۔"

32 "شاپنگ میں پہلی خریداری؟"

"سینڈل..... بہت کریز ہے اچھے سینڈل جوتوں وغیرہ کا۔"

34 "اپنے اوپر تنقید برداشت ہے؟"

"بالکل ہے..... اگر اچھے طریقے سے کی جائے تو' ناجائز تنقید برداشت نہیں کرتی۔"

35 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا خیال آتا ہے؟"

"ویسے تو بہت کنجوس ہوں مگر جب خرچ کرنے لگتی ہوں تو پھر سوچتی ہوں چلو خرید ہی لوں۔"

36 "انسان کی قدر کب ہوتی ہے؟"

"جب وہ اپنے ٹائم میں سے آپ کو ٹائم دے رہا ہوتا ہے' آپ کو اہمیت دے رہا ہوتا ہے..... تو میرے دل میں اس کے لیے قدر بڑھ جاتی ہے۔"

37 "موڈ کب اچھا ہو جاتا ہے؟"

"جب ٹیبل پہ اچھا اور لذیذ کھانا لگا ہوا ہو کیونکہ مجھے اچھے کھانوں کا بہت شوق ہے۔"

38 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"ایکٹنگ اور میں بہت شکر کرتی ہوں۔ اب یہی میرا پروفیشن ہو گا۔"

39 "کیا آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"

"نہیں نہیں..... ابھی اٹھتی ہوں' ابھی اٹھتی ہوں کہہ کر آرام سے پندرہ بیس منٹ کے بعد اٹھتی ہوں۔"

40 "مشکل وقت میں کون کام آتا ہے؟"

"مشکل وقت میں صرف اپنے ہی کام آتے ہیں پرایا کوئی کام نہیں آتا' کوئی ساتھ نہیں دیتا۔"

41 "چھٹی کا دن کہاں گزارنے کو دل چاہتا ہے؟"

"فیملی کے ساتھ آؤٹنگ پہ جا کر انجوائے کرتی ہوں۔"

42 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"ٹراؤزر..... شرٹ..... پہننا بھی آسان' دھونا بھی آسان۔"

44 "کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"ندیم بیگ صاحب۔"

45 "ایک شام جو آپ گزارنا چاہتی ہیں؟"

"امیتابھ بچن بہت پسند ہیں۔"

46 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"
"فی الحال تو اپنے منگیتر کے۔"
47 "مطالعہ کا شوق ہے؟"
"بالکل ہے .... مجھے کتابیں پڑھنے کا مضامین پڑھنے کا شوق ہے اور اب انٹرنیٹ پر معلومات عامہ کی چیزیں پڑھتی ہوں۔"
48 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"اپنے فرینڈز کو.... بہت تنگ کرتے ہیں۔"
49 "کوئی فین جو بہت تنگ کرتا ہے؟"
"ہاں.... ایک ہے جو روز ایک میسج کرتا ہے۔ مگر میں جواب نہیں دیتی۔"
50 "مہمانوں کی آمد پسند ہے؟"
"جی بالکل اور پھر یہ بھی دل چاہتا ہے کہ وہ جلدی نہ جائیں۔"
51 "اگر حکومت مل جائے تو؟"
"کوشش کروں گی سب خراب لوگوں کو ملک بدر کر دوں اور تمام ایمان دار لوگوں کو بڑے عہدوں پہ فائز کر دوں۔"
52 "کن چیزوں کو جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"بچپن سے سکے جمع کرنے کا شوق ہے۔ ابھی بھی کرتی ہوں اور جیولری۔"
54 "وقت کی پابند ہیں؟"
"وقت پر پہنچنے کی کوشش بہت کرتی ہوں مگر پھر بھی لیٹ ہو جاتی ہوں۔"
55 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہوں؟"
"اپنی فیملی پر۔"
56 "تحفے دینا کیسا لگتا ہے؟"
"بہت اچھا اور اپنے منگیتر کو بھی دیتی ہوں۔ مگر وہ مجھے زیادہ تحفے دیتے ہیں۔"
57 "اپنے لیے چیزیں خریدنے میں کنجوس ہیں یا کھل کر لیتی ہوں؟"
"نہیں جی.... اپنے اوپر ذرا کم ہی خرچ کرتی ہوں۔ ابھی ایک موبائل لیا ہے قیمتی تو ہر وقت یہی سوچتی ہوں کہ اتنا مہنگا لے لیا۔"
59 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"بہت زیادہ.... خاص طور پر انٹرنیٹ سے۔"
60 "کوئی بزنس جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"
"جی بالکل ابو تیکھیا جم کھولنے کا ارادہ ہے۔"
61 "کانٹی نینٹل کھانے پسند ہیں؟"
"کبھی کبھی .... اپنے دیسی کھانوں کی تو بات ہی الگ ہے۔"
62 "ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"
"نوڈلز.... وہ نوڈلز نہیں جو ابالے اور کھا لیے بلکہ دوسرے قسم کے نوڈلز' اسپیگیٹی وغیرہ۔"
63 "نرم دل کون ہوتا ہے؟"
"عورت بہت نرم دل ہوتی ہے جبکہ مرد پتھر دل ہوتے ہیں۔"
64 "اچھا شیف کون ہوتا ہے مرد یا عورت؟"
"میرا خیال ہے کہ مرد زیادہ اچھا کھانا بنا لیتے ہیں۔"
65 "اگر آپ کو کوئی اغوا کرلے تو گھر والوں کا ردعمل ؟"
"بے چین ہو جائیں گے اور ہر ممکن کوشش کریں گے کہ کسی طرح سے میں بازیاب ہو جاؤں۔"
66 "آپ کس کو اغوا کرنا چاہتی ہیں اور تاوان میں کیا لینا چاہیں گی؟"
"بل گیٹس کو.... اور دولت لینا چاہوں گی اور بہت کچھ ان سے سیکھنا بھی چاہوں گی۔"
67 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"رینگنے والے کیڑوں سے اور چھپکلی سے۔"
68 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"سالا اپنے بہنوئی کا راستہ روکتا ہے وہ اور جوتا چھپائی کی رسم پسند ہے۔"
69 "شادی میں تحفہ بہتر رہتا ہے یا کیش؟"
"تحفہ اہمیت رکھتا ہے اور یادگار بھی رہتا ہے۔"

71 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"
"دو بار.... ایک بار فون چھن گیا تو پھر میں نے نمبر بدل لیا۔"

72 "کون سی چیزیں لازمی اپنے پاس رکھتی ہیں؟"
"موبائل' والٹ جس میں میرا آئی ڈی کارڈ ہوتا ہے اور پیسے ہوتے ہیں۔ بس یہی۔"

73 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"
"بالکل.... کر لیتی ہوں۔ کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔"

74 "آپ کی کوئی اچھی اور بُری عادت؟"
"اچھی عادتوں کا تو نہیں پتا اور بُری یہ کہ لوگوں کی باتوں پر جلدی بھروسا کر لیتی ہوں۔"

75 "گالیاں کب دیتی ہیں؟"
"ہمارے میڈیا میں ہر کوئی دوسرے کو غلط ہی سمجھ رہا ہوتا ہے خاص طور پر لڑکیوں کو تب...."

76 "غصے میں کھانے پہ غصہ نکلتا ہے؟"
"ہاں جی.... جب امی سے اپنی بات منوانا ہوتی ہے تو پھر کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔"

77 "غصے میں پہلا لفظ؟"
"I kill you"۔

78 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"
"جب آپ شاپنگ کرنے جائیں اور دکان دار پہچان کر کہیں کہ آپ تو بڑی ایکٹر ہیں' آپ تو زیادہ پیسے بھی دے سکتی ہیں۔"

79 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا؟"
"اب تو کام سے اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ فوراً" نیند آجاتی ہے۔"

80 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کن چیزوں سے بھری رہتی ہے؟"
"گلاسز' پانی اور موبائل.... ہر وقت نہیں صرف رات کے وقت یہ چیزیں رکھتی ہوں۔"

81 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"ماں.... ماں کا کوئی بھی نعم البدل نہیں ہے۔"

82 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو مزا نہیں آتا؟"
"سلاد.... میں سلاد بہت زیادہ کھاتی ہوں۔"

83 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"بولتی نہیں ہوں لیکن جب فرینڈز کے ساتھ کہیں جانے کا موڈ ہو اور اجازت نہ مل رہی ہو تب۔"

84 "بہت سارا پیسہ ہاتھ آجائے تو؟"
"غریب بچوں کو مفت تعلیم دوں گی۔"

85 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتی ہیں؟"
"شام کے وقت۔"

86 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟"
"اپنی سُست طبیعت میں تیزی لانا چاہتی ہوں۔"

87 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"اپنے بستر پر لیٹ جاؤں.... تھوڑا آرام کروں.... پھر میک اپ اتاروں۔"

88 "موبائل سروس آف ہو تو؟"
"تو غصہ آتا ہے کہ ہمارے ملک کے حالات کب سدھریں گے۔"

89 "سینما میں پہلی فلم کون سی دیکھی تھی؟"
"بچپن میں دیکھی تھی "سر کٹا انسان۔"

90 "کیا کر گزرنے کی خواہش ہے؟"
"ورلڈ ٹور کرنے کی خواہش ہے۔"

91 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟"
"اچھا خاصا دیتی ہوں۔ کم سے کم دس روپے تو ضرور ہی دیتی ہوں۔"

92 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"اللہ نہ کرے.... دعا کریں ایسا نہ ہو۔"



عنیزہ سید

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم

میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا کہ یہ لڑکی تو ویسی ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے، میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

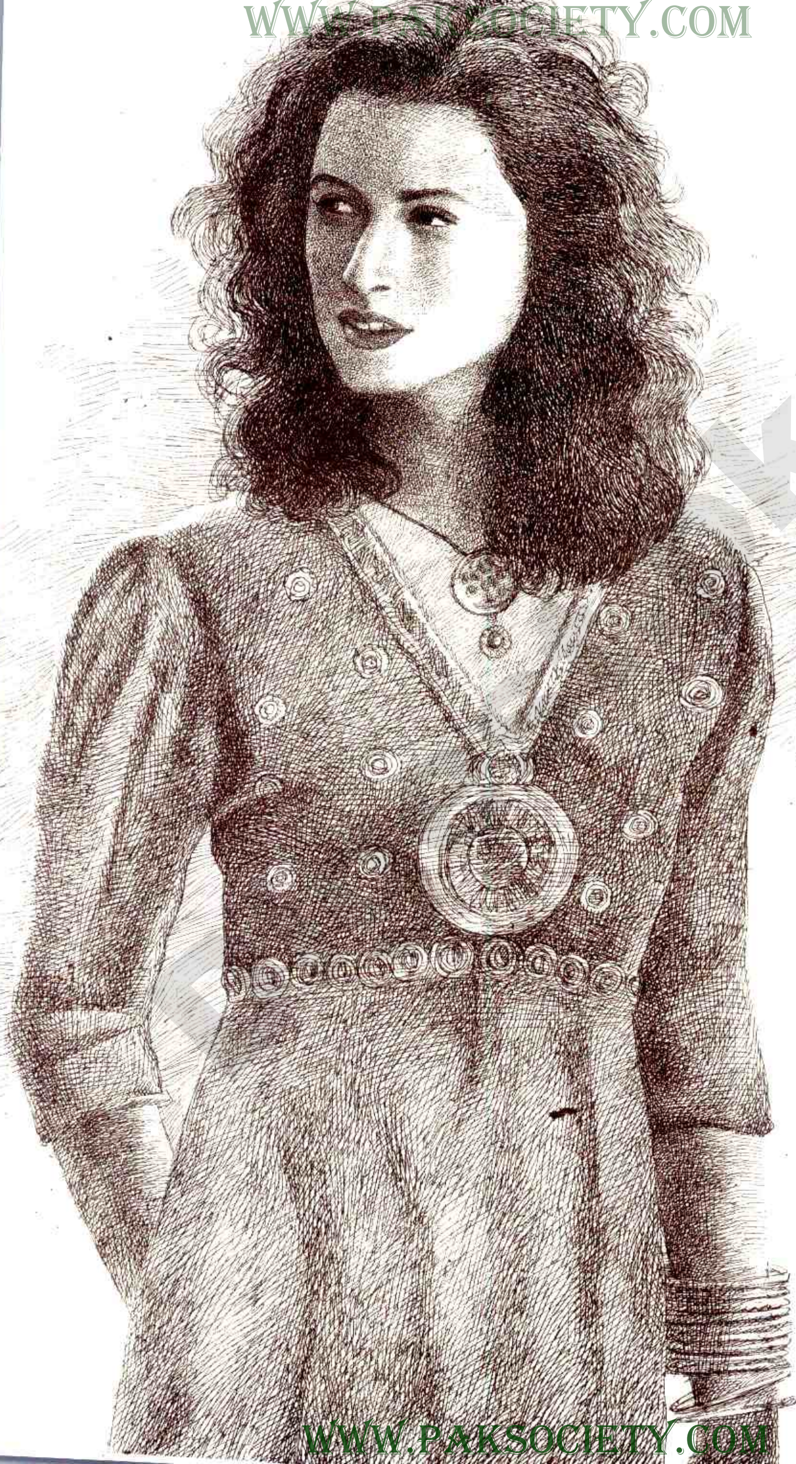
—۳۱—
اکتیسویں قسط

"لیکن وہ انکل کو کیوں شوٹ کرنا چاہتا تھا، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" ابراہیم نے سر ہلا کر کہا۔ "وہ جتنا بھی ناقابل فہم ہے، پھر بھی اس سے میں یہ توقع تو کر ہی نہیں سکتا۔"

"تم سمجھنے کی کوشش بھی کرو گے تو شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

ماہ نور نے گردن موڑ کر پیچھے کھڑے ابراہیم کو جواب دیا اور پھر دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں کے





سامنے دور دور تک سرسبز کھیت پھیلے تھے۔ دھان کی فصل ہری تھی اور اس کے پیروں میں کھڑے پانی سے حبس زدہ باس اٹھ رہی تھی۔ زمین پر دن بھر اپنی روشنی اور تمازت پھیلائے رہنے کے بعد سورج آہستہ آہستہ غروب کے سفر پر رواں تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں رکی بادلوں کی ٹکریاں ڈوبتے سورج کی روشنی میں شنگرفی ہو رہی تھیں۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر کھڑے پرانے اور بوڑھے درخت کی شاخیں اور ان سے نکلتی بھوری ٹہنیاں جٹا دھار جوگی کی طرح جیسے آلتی پالتی مارے بیٹھی نروان کے لیے "آشتی کی خاطر کوئی چلہ کاٹتی معلوم ہوتی تھیں۔

"یہ ہی وہ درخت ہے جس کے نیچے نور فاطمہ کے بچوں کی بے شناخت قبریں ہیں۔ ان پر کسی کا نام ہے نہ کوئی نشان، تین چھوٹے چھوٹے ایسے پتھر جو کسی بھی آنے جانے والے کے قدموں کی زد میں آکر ادھر ادھر ہو سکتے ہیں۔ کسی اور کو ان قبروں کی نشان دہی کی کیا ضرورت۔ یہ پتھر تو شاید اس پوری دنیا میں صرف اور صرف نور فاطمہ کے دل کی تسلیاں ہیں۔" اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے سوچا اور اپنے بازو سامنے باندھ لیے۔

"اسی درخت کے نیچے رکھے ان پتھروں کے گرد وہ پانی کا چھڑکاؤ کرتی ہوگی۔ ان ہی کے قریب ایک ایک گلاب کا پھول رکھ کر وہ اپنے بچوں کی یاد منالیتی ہوگی.... اف کس قدر مشکل ہے اپنے بچوں کے مرقد کے قریب دن رات گزارنا۔" اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس نے چھوٹے سے کچے صحن میں ایک طرف بنی کچی کوٹھڑی سے چولہے میں جلانے کے لیے اپلے اور خشک ٹہنیاں نکالتی نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "کیسے مضبوط دل کی مالک ہے یہ عورت ' بظاہر پرسکون نظر آتی ہے اپنے دکھوں پر واویلا نہیں کرتی۔ مگر اپنی سادگی اور انجان پن میں کیسی کیسی پتے کی باتیں کرجاتی ہے۔" اس نے دل میں اعتراف کرتے ہوئے سوچا۔

"میں عام اور ان پڑھ لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہوں ' ان کی سنتا ہوں اور سنتا ہی چلا جاتا ہوں ' ان عام لوگوں کی باتوں میں بہت پتے کی باتیں ہوتی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کبھی تم بھی ان سے کراہیت محسوس کرنے کے بجائے ان کے قریب بیٹھ کر ان کی باتیں سنو ' تمہیں اس میں فوک وزڈم نظر آئے گی۔"

اس نے سر جھٹکا اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس بوڑھے درخت کو پھر سے دیکھنے لگی۔

"مجھے ان درختوں کی پہچان نہیں۔ پتا نہیں یہ برگد کا درخت ہے یا پیپل کا لیکن یہ جو بھی درخت ہے ' اسی کے نیچے بیٹھ کر تو تم نے نور فاطمہ کا درد سنا ہوگا اور اس کا درد بٹایا ہوگا ' تم بھلا کہاں بیٹھے ہوگے۔" وہ کچی چار دیواری کے حصار سے باہر نکل آئی اور تین پتھروں کی نشانیوں کے قریب پاؤں کے بل بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔

"کیا کبھی تم جان پاؤ گے کہ آج میں بھی اسی جگہ پر بیٹھی نور فاطمہ کے غم کو اسی طرح محسوس کر رہی ہوں جیسے اس روز تم نے کیا تھا۔ نور فاطمہ نے تو اپنے بچوں کی یاد میں ان پتھروں کو نشانیاں بناڈالا۔ کاش! تم مجھے یہ بھی بتا جاتے کہ دل میں بسی تمہاری محبت کو میں کہاں دفن کروں اور اس کی یاد میں کس چیز کو نشانی بناؤں۔" آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک کر کچی زمین میں جذب ہو گئے۔

"توں ایتھے آکے کیوں بیٹھ گئی ایں!" نور فاطمہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ "ہائے نی جھلیے! رونے کیوں لگ گئی ایں؟" اسے اگلی نظر میں ہی ماہ نور کے آنسو نظر آچکے تھے۔ "دیکھ میرے ول میں تے نئیں روندی۔" اس نے ماہ نور کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"جنہاں گلاں دا رون ساری عمر دا ہووے ' اونہاں تے روز روز کی رونا۔ چل میری دھی! ایتھوں اٹھ ' پیر تھک جان گے نی تسی کرسیاں ' صوفیاں تے بہن والے لوک.... اٹھ شاباش اندر چل کے بیٹھ۔ میں تینوں اوہ ای پیڑھی کڈھ کے دیندی آں ' جدھے تے اونہوں بٹھایا سی ' خورے جے تینوں اوس پیڑھی تے بیٹھ کے ہی سکون آجاوے۔"

ماہ نور نے حیرت سے نور فاطمہ کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ مسکرا دی اس ہلکی مسکراہٹ نے بھی اس کے اونچے دانت نمایاں کر دیے تھے۔

"جھلا کہندا سی 'او تے تیری ایس گلی وچ کدی نہ آوے گی' او تے تیرے بھانڈیاں وچ روٹی کدی نہ کھاوے گی۔ او تے ایس چٹائی تے سویں گی۔۔۔ اج ہوندا کدھرے نیہڑے تے دیکھ لیندا تے فیر کہندا بے بے! توں سچ آکھیا سی۔ جو توں ایں او وی توں ہی ہو جاوے گی۔"

ماہ نور، نور فاطمہ کی یہ بات سن کر بھل بھل رو دی۔

"نہ میری دھی!" نور فاطمہ نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور وہ آرام سے اس کے گلے لگ گئی۔ اس وقت اسے نور فاطمہ کے جسم سے پسینے کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی نہ ہی اس کے کپڑے میلے لگ رہے تھے۔

"نا میری سوہنی دھی! رون تیرے دشمن، توں چپ کر جا، مینوں یقین اے۔ او جتھے وی اے تینوں، تیرے نالوں بوہتا یاد کردا پیا ہووے گا۔ او نہوں ہور ساریاں گلاں توں بوہتی تیری فکر ہووے گی، تے جدھوں وی او واپسی دی راہ پھڑے گا، او دھے پیر تیرے رستے ول ہی ٹرن گے، کسی ہور پاسے نئیں جان گے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر ماہ نور کو پچکارا۔

اس نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور جھونپڑی کی طرف چل دی۔

"یہاں ایک رات گزارنا ناممکن بات ہے ماہ نور!" ابراہیم نے ماہ نور کو واپس آتے دیکھ کر کہا۔ وہ پریشان چہرہ لیے نور فاطمہ کی جھونپڑی کے آگے کھڑا تھا۔

"یہاں کوئی باتھ روم نہیں ہے اور اردگرد پھیلی فصلوں کی وجہ سے حبس ہے۔ فصلوں میں کھڑے پانی کی وجہ سے مچھروں کی بہتات ہے۔ یہاں بجلی ہے نہ ہی گیس، نہ کوئی سیوریج کا انتظام، میرا خیال ہے واپس چلیں، تم نے سعد کی خواہش کی تکمیل تو کر دی۔" وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

"توں بھانویں کیہڑی زبان وچ گٹ مٹ کریں مینوں سمجھ لگ گئی اے، توں میری دھی نوں کہندا پیا اے چل ایتھوں ٹر چلیے۔" نور فاطمہ جو کولہوں پر ہاتھ رکھے ابراہیم کی طرف دیکھ رہی تھی بولی۔

ابراہیم نے اکتائی ہوئی رحم مانگتی نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"ابراہیم کاروباری آدمی ہے بے جی! اسے اپنے کام کی فکر ہے۔" ماہ نور نے ابراہیم کی طرف داری کی۔ "میرے ساتھ یہاں آنے کے لیے اس نے اپنا خاصا وقت ضائع کیا۔"

"ہوں!" نور فاطمہ نے ہاتھ کولہوں سے نیچے گرائے اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہلا فیر چل کے دونویں جی روٹی تے کھا لوو۔"

ماہ نور نے ابراہیم کو کچھ دیر اور رکنے کے لیے کہا اور نور فاطمہ کے ساتھ ہینڈ پمپ کی طرف چل دی۔

"اج میں چوچا پکایا اے تیرے لئی، او شودھا جدھوں آیا او س دن تے میرے کول کوئی شے ہی نئیں سی پکان لئی۔" نور فاطمہ نے ماہ نور کی پلیٹ میں بھنے مرغ کا سالن ڈالتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی وہی دے دیتیں جو اس کو دیا تھا۔" ماہ نور نے آہستہ آواز میں کہا۔ "او وی گھوٹیا اے، لے اے وی چکھ۔" نور فاطمہ نے پسی چٹنی اس کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"مینوں یقین سی او تینوں لے کے میرے ول ضرور آئے گا۔" نور فاطمہ نے ان دونوں کو کھانا کھاتے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تاں ہی تے میں میلے تے جا کے ایہہ برتن بھانڈے لے آئی ساں۔ کدھرے توں ساڈھیاں مٹی دیاں کولیاں توں نفرت کھاویں۔" اس نے پلاسٹک کی اس پلیٹ کی طرف اشارہ کیا، جس میں ماہ نور کھانا کھا رہی

تھی۔

"اس نے مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رکھا تھا!" ماہ نور نے ابراہیم سے کہا۔

"سچ کہو کیا تم یہاں خود کو ثابت کرنے نہیں آئیں۔" ابراہیم جو رغبت سے نور فاطمہ کے ہاتھ کا بنایا ہوا سالن کھا رہا تھا مسکرا کر بولا۔ "تاکہ جب کبھی وہ ملے تم اسے بتا سکو کہ تم اس امتحان میں بھی پوری اتریں۔"

"بکواس نہ کرو۔" ماہ نور دل کا چور پکڑے جانے پر خفا ہو گئی۔ "میں تو صرف اس لیے یہاں آئی ہوں کہ دیکھوں آخر نور فاطمہ کی جھونپڑی میں کیا ہے، جو اس نے اتنا زور دے کر اس کا ذکر کیا اور اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ مجھے یہاں آنا چاہیے۔"

"اچھا!" ابراہیم نے یوں کہا جیسے اسے ماہ نور کی توجیہہ پر یقین نہ آیا ہو۔ "پھر یہ ہی بتا دو کہ کیا پتا چلا تمہیں یہاں آکر؟"

"یہ کہ حوصلے، صبر، توکل اور عجلت، بے صبری، لالچ میں کیا فرق ہوتا ہے اور دونوں قسم کی عادتیں انسان کو کس انجام تک پہنچا دیتی ہیں۔" ماہ نور نے اپنی اور ابراہیم کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" ابراہیم نے احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھا۔

"سمجھنے کی کوشش بھی مت کرنا، کیونکہ تمہاری سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے یہ۔" وہ برتن اٹھائے ہینڈ پمپ کی طرف چلی گئی جہاں نور فاطمہ بیٹھی دیگچیاں مانجھ رہی تھی۔



اس نے پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ گھڑی شام کے چار بجا رہی تھی۔ نادیہ کی واپسی میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے کتاب میز پر رکھ دی اور انگڑائی لے کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ دو قدم پر ہی نادیہ کا چھوٹا سا اوپن کچن تھا جس کے چھوٹے سے کاؤنٹر پر انتہائی ضرورت کی چند چیزیں رکھی تھیں۔ نادیہ ان ہی چیزوں کے استعمال کے ساتھ پیٹ بھرنے کے ایسے لوازمات بنا لیتی تھی، جو انتہائی سادہ ہوتے تھے اور وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ خود کو ایسے کھانے کا عادی بنا لے۔ اس وقت اسے شدت سے کافی کے ایک کپ کی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن نادیہ کے کچن میں کافی کا ڈبا موجود نہیں تھا۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا، تین دن سے جاری بارش اس وقت بھی اسی تواتر سے برس رہی تھی۔

"اگر یہ بارش نہ برس رہی ہوتی تو میں کہیں جا کر کافی تو پی ہی آتا۔" اس نے سوچا۔ اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا تھا۔ "لندن جیسے شہر میں بارش کو بہانہ بنا کر کسی کام کے ارادے کو ملتوی کر دینا کتنی عجیب بات لگتی ہے، جبکہ اسی بارش نے یہاں کے معمولات زندگی کو ذرا برابر بھی متاثر نہیں کیا۔

پھر کیا ایسا ہے کہ میں باہر نکلنے اور لوگوں کا سامنا کرنے سے کترانے لگا ہوں۔ خواہ وہ لوگ مکمل اجنبی ہی کیوں نہ ہوں۔" وہ اپنے معاملے کو سوچتے سوچتے سنجیدہ ہو گیا۔

"اور یقیناً" ایسا بھی ہے کہ میں اور میرا مزاج دوسروں کے لیے گستاخانہ اور سخت ہوتا چلا جا رہا ہے۔" سنجیدہ سوچ اسے خود احتسابی کی طرف لے گئی "میں اس زندگی کو ایسے گزار رہا ہوں۔ جیسے دوسروں پر احسان کر رہا ہوں نادیہ جتنا مجھے خوش رکھنے اور حوصلہ دینے کی کوشش کرتی ہے، اتنا ہی اس کے ساتھ میرا رویہ ایسا ہوتا جا رہا ہے، جیسے میں زندہ رہ کر اس پر احسان کر رہا ہوں۔ کتنی احمقانہ بات ہے کہ وہ صرف ایک انسیت اور اپنی ہمدرد فطرت کے تحت ایسا کرتی ہے اور میں اس کے سر پر چڑھا جاتا ہوں۔ آخر میں کر کیا رہا ہوں، چاہ کیا رہا ہوں۔

کیا مجھے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرلینا چاہیے کہ میں اس چھوٹے سے ایک کمرے کے فلیٹ میں رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ ایسی کم وسائل زندگی میری عادت نہیں۔ یہ ملک جہاں پہلے میں کبھی تفریح کی خاطر اور کبھی کاروبار کے سلسلے میں آیا کرتا تھا۔ اب مجھے اجنبی لگتا ہے اور میرا یہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے اپنا نارمل لائف اسٹائل، من مرضی کی زندگی آزادی اور سیلانی پن یاد آتا ہے تو میں ایک اذیت ناک احساس تنہائی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ مجھے الجھن اور بیزاری محسوس ہوتی ہے۔ میں لوگوں کے ساتھ گستاخ ہو جاتا ہوں۔ اور بھلا یہاں میرے مخاطب لوگ ہیں ہی کتنے۔" اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "نادیہ، ڈاکٹر رضا اور کبھی کبھار وددن زادے .... کیا میں نے کبھی سوچا تھا کہ دنیا بھر میں ہزاروں کانٹیکٹس رکھنے والا شخص صرف تین رابطوں پر اکتفا کرنے لگے گا۔" اسے خود پر ہنسی آنے لگی۔

"چوروں جیسی یہ زندگی کبھی بھی میری ترجیحات میں نہیں تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہو چکا ہے اور اس وقت تک ایسا ہی رہے گا۔ جب تک میں اپنی کوئی نئی شناخت نہیں بنالیتا۔ پرانی شناخت سے واقف لوگ مجھے اسی پس منظر میں ملیں گے جس سے ملتے رہے ہیں اور وہ میں کبھی نہیں چاہوں گا۔" فطری غصہ، انا اور رنج ایک بار پھر اس پر حاوی آنے لگا۔ اس نے خود احتسابی کا سلسلہ ترک کر کے واپس کتاب اٹھالی۔ تب ہی دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے ایک بار پھر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

آنے والا ایک اجنبی چہرہ تھا جو نادیہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور اپنا نام چندر شیکھر بتا رہا تھا۔



بلال سلطان کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ان کے ہونٹ خشک اور سفید ہو رہے تھے۔ چوہدری سردار نے ان کے چہرے پر نرمی سے ہاتھ پھیرا اور اپنی انگلیوں سے ان کی پیشانی تھپتھپائی۔

"بلال صاحب! کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا۔

"بھائی صاحب، بھائی جی! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" مولوی سراج بے چین ہو کر ان کے قریب آگئے اور اپنا صافہ اتار کر ان کے چہرے پر پھیرنا چاہا لیکن پھر رک کر ایک مرتبہ اپنے صافے کی طرف دیکھا جو پرانا تھا اور سفید ہونے کے باوجود اجلا اجلا نہ لگ رہا تھا۔ انہوں نے صافہ دوبارہ شانے پر رکھ لیا اور بلال کے کندھے دبانے لگے۔

"سراج! مجھے پانی کا ایک گلاس چاہیے۔" چند لمحوں کے بعد بلال کے منہ سے الفاظ نکلے۔ گھبرائے ہوئے مولوی صاحب نے میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا۔ احساس مرعوبیت سے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد بلال کی طبیعت قدرے سنبھلی تھی۔ نظر اٹھا کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ فلزا اپنے سینے پر بازو باندھے کھڑی زہر آلود نظروں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"اب پتا چلا بلال سلطان ڈراما کیسا ہوتا ہے؟" وہ ان سے نظریں ملنے پر بولی۔ "حقیقت سے نظریں چار ہو جانے پر وہ چار کے بجائے آٹھ کیسے ہو جاتی ہیں۔"

"تم!" بلال سلطان نے کمزور مگر پر اعتماد آواز میں کہا۔ "تم میری بہت بڑی مجرم ہو فلزا۔"

فلزا نے رابعہ کلثوم کی طرف دیکھا۔ "چور جب الٹا کوتوال کو ڈانٹتا ہے تو کیسا لگتا ہوگا، خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو بہن!"

"دیکھ رہی ہوں، سن رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں۔" رابعہ کلثوم کا لہجہ بھی فلزا کے لہجے سے مختلف نہیں

تھا۔

"بھائی صاحب! پانی اور پی لیجیے۔" مولوی سراج سرفراز دونوں خواتین کی گفتگو کی طرف سے کان بند کیے بندگی نبھانے پر تلے ہوئے تھے۔

"چوہدری سردار صاحب!" بلال نے مولوی سراج کا بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے کی مشرقی کھڑکی کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ "آپ نے کبھی پرانے بند قلعوں کے اردگرد بنے بلند حصار دیکھے ہیں؟"

"بالکل دیکھے ہیں۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"کبھی ان محصور قلعوں کا حال دیکھا ہے؟" بلال نے دوسرا سوال کیا۔

"جی ہاں' دراڑیں پڑے' شکستہ ہوئے' رنگ اڑے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"نہیں ایسے نظر نہیں آتے وہ' کیونکہ جو حکومتیں ان کی حفاظت پر مامور ہوتی ہیں' وہ ان کی رینوویٹ (مرمت) کراتی رہتی ہیں۔ دراڑیں بھر دی جاتی ہیں۔ شکستگی کا علاج کروا دیا جاتا ہے۔ اڑے رنگ دوبارہ پھروا لیے جاتے ہیں۔ یوں بظاہر ان قلعوں کی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ قائم رہتا ہے۔ دیکھنے والے قلعوں میں گھوم پھر کر دیکھ تو لیتے ہیں لیکن ان کے اردگرد کھڑے' بلند و بالا حصار کسی کو قلعے ایکسپلور کرنے کی ہمت نہیں کرنے دیتے۔ تاریخ دان' محقق' آثار قدیمہ کے ماہرین' سیاح سب اپنی اپنی ڈائریاں لکھتے وقت ان کے متعلق قیاف ہی لگاتے ہیں۔ کسی کو ٹھیک سے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ ان رینوویٹڈ قلعوں کے اندر دراڑیں کتنی ہیں۔ یہ درحقیقت اندر سے کتنے شکستہ ہیں اور ان پر اب تک کتنی بار رنگ روغن کا کام ہو چکا ہے۔"

"شاید آپ درست کہہ رہے ہیں۔" چوہدری صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"شاید نہیں میں واقعی درست کہہ رہا ہوں۔" بلال نے کہا۔ "اور ایسے ہی قلعوں جیسی ایک مثال میں ایک انسان بھی ہوں۔" انہوں نے سب حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "بلند و بالا فصیلوں میں چھپا ہوا بظاہر عظیم الشان قلعہ۔" وہ لمحہ بھر کو رکے اور ایک تمسخرانہ ہنسی ہنسنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

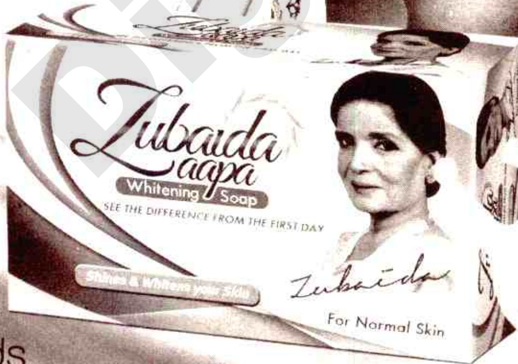
"ہر سال چھ مہینے بعد خود کو رینوویٹ کروا لیتا ہوں اپنی شکستگی چھپانے کے لیے۔ دراڑیں بھروانے کے لیے اپنی شخصیت پر رنگ و روغن کروانے کے لیے بہت سارا پیسہ خرچ کر لیتا ہوں۔ پیسہ۔۔۔ یو نو چوہدری صاحب! جو انسان کی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے' بلکہ شاید سب سے بڑی۔ یہ پیسہ' درحقیقت میرے پاس میرے اپنے اندازے سے بھی کہیں زیادہ ہے' اتنا زیادہ کہ کئی بار تو سمجھ نہیں آتا کہاں خرچ کروں؟"

چوہدری سردار نے بلال کی بات سن کر ایک طویل سانس لیا اور دوبارہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"لیکن ایسا ہمیشہ سے نہیں ہے چوہدری صاحب! ایک وقت تھا جب میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔ میں پائی پائی کمانے اور دھیلا دھیلا جوڑنے کی جنگ میں مصروف تھا۔ اور یہ سب۔" انہوں نے مولوی سراج' رابعہ کلثوم' اور فلزا ظہور کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے اس وقت کے ہم نشین ہیں' یہ گواہ ہیں میرے اس وقت کہ جب میرے لباس پر خفیہ پیوند ہوا کرتے تھے اور ایک وقت کے معمولی کھانے پر پورا دن گزار دیتا تھا۔"

"وہ خفیہ پیوند نہیں تھے۔" رابعہ کلثوم نے بلند آواز میں کہا "میری بدنصیب سہیلی جو بدقسمتی سے ان کی بیوی تھی' ہاتھ سے کپڑے کی رفوگری میں کمال رکھتی تھی۔ ایسی رفوگری کہ محدب عدسے سے بھی دیکھو تو رفو نظر نہ آئے۔"


Zubaida aapa
Whitening Soap
SEE THE DIFFERENCE FROM THE FIRST DAY
Shines & Whitens your Skin
Zubaida
For Normal Skin

"شکر ہے رابعہ بی بی! تمہیں اتنا تو یاد ہے کہ وہ میرے کپڑوں میں پیوند نہیں لگاتی تھی انہیں رفو کیا کرتی تھی۔ ایسی رفوگری کہ محدب عدسے سے بھی نظر نہ آئے۔" بلال سلطان کی آواز میں طنز اترا۔

"ایسی ہی رفوگری چوہدری صاحب! اس نیک عورت نے میری اور اپنی زندگی کی بھی کی تھی ایسے ایسے رفو کہ قریب رہنے والے سراج اور رابعہ بی بی کو بھی نظر نہ آئے۔" انہوں نے چہرے کا رخ دوبارہ چوہدری سردار کی طرف موڑا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بلال صاحب! لیکن رابعہ بہن نے تو کنفیوژن کی انتہا کردی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کے اور مرحومہ کے آپس کے تعلقات ختم ہو چکے تھے۔ پھر کھاری کا چکر کیا ہے۔ یہ بے چارہ کون ہے آخر میرا تو دماغ گھوم رہا ہے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ارے چوہدری صاحب آپ کس کی باتوں میں آرہے ہیں۔" فلزا بلال اور چوہدری صاحب کے درمیان آن کھڑی ہوئی۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ یہ شخص بلا کا ڈرامہ باز ہے۔ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی کہانی گھڑ سکتا ہے۔"

"باقی سب سوالوں کا جواب تو میں بعد میں دوں گا' پہلے تو تم سے حساب کتاب کرلوں۔" بلال نے دانت پیستے ہوئے اچانک فلزا کا بازو پکڑا۔

"تم نے کہا تھا۔ وہ مرگیا۔ بتاؤ' تم نے ایسا کہا تھا یا نہیں؟" انہوں نے فلزا کا بازو زور سے جھنجھوڑا۔ "کیوں کہا تھا۔ کیوں کیا تم نے ایسا میرے ساتھ؟"

"یہ تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میرے حساب سے اسے زندہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" فلزا نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب! میں نے اپنا نوزائیدہ بچہ اس عورت کے حوالے کیا تھا' وہ اس کے پاس میری امانت تھی۔" بلال نے ایک مرتبہ پھر چوہدری صاحب کی طرف دیکھا "میں ایک بڑے حادثے کے درمیان کھڑا تھا۔ میرا خیال تھا جیسے اس نے شہناز کو پہچان لیا' جیسے اس کے دل میں میرے لیے اچھے جذبات تھے' اس سے بہتر اس بچے کا کوئی دوسرا محافظ نہیں ہو سکتا تھا مگر اس نے..." ان کی آواز بھرائی "اس نے مجھے بتایا اس نے اسے بس سٹاپ پر رکھ دیا تھا اور بچے کو بعد میں آوارہ کتے کھا گئے۔"

"فلزا بی بی! بچہ رکھنے کے کچھ ہی عرصے بعد میں نے آپ سے رابطہ کیا تھا اور آپ سے پوچھا تھا کہ آپ بچے کو کیوں اس طرح بس اسٹاپ پر رکھ آئی تھیں؟" چوہدری صاحب نے فلزا سے پوچھا۔ "تو آپ نے سارے واقعے سے لاعلمی کا اظہار کردیا تھا۔"

"کاش! اس وقت آپ مجھے یہ بتا دیتے کہ بچے کو آپ وہاں سے زندہ سلامت اٹھا لائے تھے۔" فلزا کی آواز پست ہوئی۔ "آپ اسی بات پر اصرار کرتے رہے کہ آپ نے خود مجھے بچہ وہاں رکھتے دیکھا تھا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ آپ مجھے ایسی ظالم نہیں سمجھتے تھے کہ ایک نوزائیدہ بچے کو کتے بلیوں کی خوراک بننے کے لیے کہیں بھی رکھ دوں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ 'یہ پولیس کیس بن سکتا ہے۔"

"بالکل! میں نے ایسا ہی کہا۔" چوہدری صاحب نے اعتراف کیا۔ "میں چاہ رہا تھا کہ آپ ذرا دباؤ میں آکر اعتراف کرلیں بچہ آپ نے رکھا تھا تو میں بچے کو آپ کے حوالے کردوں' لیکن دو دفعہ رابطے کے بعد آپ یوں غائب ہوئیں کہ کوئی پتا نشان نہیں چھوڑا....."

"آپ کے خیال میں مجھے اور کیا کرنا چاہیے تھا؟" فلزا کے لہجے میں بے بسی اُتری۔ "بچہ کتے بلیوں کا شکار ہو گیا' پولیس کیس بن سکتا تھا' میری عمر اس وقت کم تھی' میں غیر شادی شدہ تھی' اس خوفناک رات کا تذکرہ کسی

سے کر سکتی تھی نہ ہی کسی سے مدد مانگ سکتی تھی۔ میرے بہن بھائی' میرا خاندان۔ میرا کیریر... سب کے سامنے میرا وجود ایک سوالیہ نشان بن سکتا تھا۔ میں ڈر گئی۔ میں نے قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا مگر میں جائے وقوعہ پر موجود تھی۔ میں نے گردن کٹی لاش دیکھی تھی اور خون کی ندی بھی۔ میں نے آلہ قتل قاتل کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور میں نے وہ سارا دن قاتل کے ساتھ گزارا تھا۔ کیا کیا خوف' کیسے کیسے اندیشے نہ ہوں گی میرے سامنے۔ ایسے میں آپ ہی بتائیے! غائب ہو جانے سے بہتر راستہ میرے پاس کیا تھا۔ ایک بچے کی لاش سے چلتے پولیس کے قدم بلال سلطان کے ہاتھوں ہونے والے قتل تک پہنچتے اور میں کہاں کہاں نہ پھنستی۔ آپ ہی بتائیے میرے پاس کوئی دوسرا راستہ تھا کیا؟"

"تمہیں پتا ہے تمہارے اس من گھڑت مفروضے نے میرا کیا حال کیا؟" بلال سلطان فلزا کی وضاحت پر ایک مرتبہ پھر دانت پیستے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔

"تم جانتی ہو! میں نے اس بس سٹاپ جس کا تم نے بتایا تھا... اور اس کے اردگرد کا سارا علاقہ چھان مارنے میں کتنا وقت صرف کیا۔ تمہیں کیا معلوم اس بس اسٹاپ پر کتنے ہی سال گھنٹوں بیٹھ کر میں اپنے اس معصوم بچے کو کتنا رویا ہوں' جس کی دنیا میں آمد کا مجھے کس شدت سے انتظار تھا اور جس کی میں شکل بھی ڈھنگ سے نہ دیکھ سکا تھا۔ کبھی موقع ملے تو جا کر دیکھیے گا چوہدری صاحب! اس پس ماندہ' غیر آباد' غیر معروف علاقے کے اس بس اسٹاپ کو اپنے بچے کی یاد میں میں نے کیا سے کیا بنا دیا۔ مسافر خانہ' ریسٹورنٹ' فلٹرڈ پانی کے الیکٹرک کولر' مسجد قیمتی ترین ٹائلز سے سجے فٹ پاتھ' بس سٹاپ کی انتظامیہ کو ہر ماہ فقیروں اور ناداروں کے لیے نجانے کتنی رقم' ہر ماہ کی اس تاریخ کو جب وہ بچہ پیدا ہوا اسی بس اسٹاپ پر دیگیں پہنچ جاتی ہیں اور کھانا تقسیم ہوتا ہے۔"

انہوں نے شدت غم سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک مجبور' بے بس' ترسا ہوا باپ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے اپنے بچے کے لیے۔

کمرے میں موجود ہر شخص کے ہونٹ یکدم جیسے سل سے گئے تھے۔

"میرا خیال ہے!" چوہدری صاحب نے گلا کھنکھارنے کے بعد بات شروع کرتے ہوئے اس سناٹے کو توڑا۔ "فلزا بی بی! آپ سے نادانستگی میں خاصی بڑی غلطی ہو گئی۔"

"آپ نہیں جانتے چوہدری صاحب! اسے اس بچے کی پروا کچھ عرصے تک تو رہی ہو گی' اس کے بعد یہ فرعون بن گیا۔ فرعون سمجھتے ہیں آپ؟" فلزا نے بلال کی طرف دیکھا' جو اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جن کا مفہوم وہ سمجھ نہیں پائی۔

"عجیب بات ہے' میرے الفاظ پر کوئی دھیان ہی نہیں دے رہا... آخر وہ بچہ کس کا تھا۔ شہناز کا تو نہیں ہو سکتا کبھی بھی۔" رابعہ کلثوم نے گفتگو میں ایک مرتبہ پھر دخل دیا۔

"ہاں... تمہارے الفاظ یہ ہی ہونے چاہئیں رابعہ بی بی! تمہارے سوال بھی درست ہیں" اب کے بلال نے رابعہ کی طرف دھیان دیا "کیونکہ تم اپنے خاندانی پیشے کے زیر اثر کسی بھی بات کا ڈھول پیٹے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ پہلے بھی یہ تمہاری مجبوری تھی اور آج اتنے سال بعد بھی یہ ہی مجبوری ہے تمہاری۔"

"میں!" رابعہ کلثوم نے کچھ کہنا چاہا۔ بلال سلطان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔ "تمہاری اسی عادت کی وجہ سے میں نے شہناز کو منع کیا کہ میں جو اتنے عرصے بعد اس سے دوبارہ ملا تھا تو اس کا تذکرہ تم سے ہرگز نہیں کرے۔ تمہارے ہونٹوں سے نکلی سیدھی طیفے لاٹ کے کوٹھے پر جا چڑھنے کا اندیشہ تھا۔"

"آپ دوبارہ آن ملے شہناز سے؟" رابعہ نے طنزیہ نظروں سے انہیں دیکھا "یہ کب کا واقعہ ہے خیر سے؟"

"یہ ان ہی دنوں کا واقعہ ہے سراج! جب رابعہ بی بی تم سے کہا کرتی تھیں کہ شہناز کو سرسام ہو گیا ہے۔ جب

ہی وہ راتوں کی تنہائی میں کمرے میں اکیلی بیٹھی خود سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ ہنستی ہے اور گنگناتی بھی ہے۔" بلال نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ رابعہ کلثوم کا منہ حیرت سے کھلنے لگا۔

"اور یہ ان ہی دنوں کا قصہ ہے جب تم شہناز سے کہا کرتی تھیں کہ پاؤں تو تمہارا بھاری ہوا ہے 'کھٹی اور چٹپٹی چیزیں کھانے کو اس کا دل کیوں چاہنے لگا ہے؟" رابعہ کلثوم کا منہ کچھ اور کھل گیا۔

"اور یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب تم اس سے سوال کیا کرتی تھیں کہ مکان کا کرایہ مالک مکان کے پاس کب اور کیسے پہنچا' گھر میں تازہ ترکاری اور گوشت کہاں سے آنے لگا' پھل اور دودھ کی شکل کیسے دکھائی دینے لگی ہے اور بجلی' گیس کے بل کہاں سے دیے جا رہے ہیں؟"

رابعہ کا ذہن جیسے گزری ساری باتوں کے سرے آپس میں جوڑنے میں مصروف تھا۔

"ان ہی دنوں شہناز نے تم دونوں کو بصد اصرار لاہور سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ اس کے اس عمل کی وجہ ہم دونوں کا دوبارہ ملن تھا۔ جسے طیفے لاٹر سے چھپانا مقصد تھا۔ میں شہناز سے دوبارہ آملا۔ طیفے کو پتا چل جاتا تو اس کا چھرا اسی وقت ایک یا دو گردنیں تو ضرور کاٹتا' تم دونوں کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔ طیفا تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے اس ڈر سے تم دونوں کو لاہور سے نکل جانے پر مجبور کیا۔" بلال نے سراج سرفراز سے کہا۔

"مگر بھائی صاحب! آپ کی واپسی ہم سے کیوں چھپائی آپا جی نے؟" سراج سرفراز اٹک گئے۔

"نہ تمہاری زبان چوکوں چوپالوں میں رکتی تھی' نہ ہی تمہاری زوجہ کی' ڈر تھا تم دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کسی محلے دار کے سامنے ذکر کر دے گا۔"

بلال کی بات سن کر سراج سرفراز نے سر پر بندھا کپڑا اتار کر سر کھجایا اور کپڑا دوبارہ باندھنے لگے۔

"ہائے ہائے!" رابعہ کلثوم نے اپنے پرانے انداز میں ہاتھ ملے "ہمیں بھی نکلوا دیا' خود بھی آنے لگے' بچہ بھی آنے والا ہو گیا تو پھر اس کم نصیب کا گلا کیوں کاٹ دیا آخر میں.... اس لیے کہ وہ اپنی خوب صورتی کھو چکی تھی اس لیے کہ طیفا اس کا عاشق تھا اور تم اس سے حسد کھاتے تھے؟"

"جتنی انسان کی عقل ہو' اس سے بڑھ کر وہ سوچنے لگے تو اصل کائنات کا نظام درہم برہم نہ ہو جائے۔" بلال نے رابعہ کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

"بھائی صاحب! اگر آپ خود ہی مرحومہ کے قتل کا منظر نامہ' محرکات اور تفصیلات بیان کر دیں تو یہاں موجود کوئی بھی شخص اپنی عقل یا بے عقلی کا مزید مظاہرہ نہ کرے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"وہ صرف میری بیوی ہی نہیں تھی' وہ میری محبوبہ بھی تھی۔ کیوں سراج! تم اس بات کی گواہی تو دو گے نا؟" انہوں نے مولوی سراج سے پوچھا۔

"جی بھائی صاحب!" سراج سرفراز نے فوراً" سر ہلایا۔

"ارے ان کی گواہی' خواجہ کی گواہی کے برابر ہے۔" رابعہ کلثوم نے چڑ کر کہا۔

"بس رابعہ بی بی! اب تم ایک لفظ بھی نہیں بولو گی۔" بلال ڈپٹ کر بولے۔ "کہیں تمہیں اپنے الفاظ پر رونا نہ پڑ جائے۔"

رابعہ کلثوم جواب دینا چاہ رہی تھیں کہ فلزا نے ان کا ہاتھ دبا کر انہیں خاموش کر دیا۔

"آپ کی محبوبہ اور بیوی کے ساتھ ہوا کیا یہ تو بتائیے۔" چوہدری صاحب کا صبر جواب دینے لگا۔

"ریڈیو پاکستان کے ماضی کی ایک ایسی مغنیہ تھی وہ جو اپنی خوب صورت آواز کی وجہ سے شہرت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع ہی ہوئی تھی کہ اس کے والد نے اس کے اس شوق پر سخت پابندی لگانے کی کوشش کی اور اس نے

اس کوشش کو قبول نہیں کیا۔ الٹا بغاوت کردی' وہی ایک روایتی کہانی۔" بلال رک کر استہزائیہ انداز میں ہنسے۔
"یہ اضافہ بھی ساتھ میں کرلیجئے چوہدری صاحب! کہ اس کا باپ ایک انتہائی معزز' تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان کا فرد تھا۔" فلزا نے درمیان میں ٹکڑا لگایا۔
"میں نے اس حقیقت سے انکار تو نہیں کیا فلزا بی بی!" بلال نے نیچی آواز میں کہا۔
"لیکن اس کی ایک خواہش کی ۔ اس معزز' تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان نے اسے بڑی کڑی سزا نہیں دی' کیا خیال ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔
"وہ ان کے اپنے اصول تھے' جو آڑے آگئے۔" فلزا جانتی تھی' اس کی دلیل بودی تھی۔
"چلو مان لیتے ہیں۔" بلال نے خلاف توقع بحث نہیں کی۔ "بس اس کی بغاوت کے نتیجے میں اسے عاق کردیا گیا۔ پورے خاندان نے اس سے قطع تعلق کرلیا۔ بقول اس کے اگر کبھی کہیں سر راہ خاندان کے کسی فرد سے مڈبھیڑ ہو بھی جاتی تو وہ یوں راستہ بدل لیتا جیسے کسی اچھوت سے سامنا ہو گیا ہو۔"
"سیڈ!" چوہدری صاحب نے زیر لب کہا۔
"اس زمانے میں ایسی بغاوتوں سے یونہی نمٹے جانے کا رواج تھا شاید' والد بزرگوار سوچتے ہوں گے اس قطع تعلق کے نتیجے میں وہ غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگ کر ان کی قدموں میں جاگرے گی' لیکن وہ بھی ان ہی کی بیٹی تھی۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہاں ایک وار اس پر اور بھی کیا گیا' اثر و رسوخ اور تعلقات استعمال کرکے اس کا وہ کیریر جو ابھی آگے بڑھنے کی دوسری تیسری سیڑھی پر ہی کھڑا تھا۔ ختم کرا دیا گیا۔ کوئی میوزک ڈائریکٹر' کوئی ریڈیو پروڈیوسر' کوئی میوزک مینٹر اس کی سرپرستی کرنے پر راضی ہوتا تھا نہ ہی اسے کہیں آگے بڑھنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ شخص بھی جو کسی مقابلے میں اس کے گلے کا سر دیکھ کر اسے انگلی سے لگا کر اس میدان میں لے کر آیا تھا اور اس وقت تک اس کا ساتھ بھی دے رہا تھا' رفو چکر ہو گیا اور یہ محترمہ تن تنہا رہ گئیں۔"
"پھر کیا ہوا' اس سے آگے کے معاملات انہوں نے کیسے چلائے؟" چوہدری صاحب تجسس میں تھے۔
"میں اس اسٹرگل کا چشم دید گواہ تو نہیں ہوں' سنی ہوئی بات یہ ہی ہے کہ ایک ایسے موسیقار و گلوکار جو خود ضعیف ہو چکے تھے۔ انہوں نے اسے سہارا دیا اور کہا تم نجی محفلوں میں فن کا مظاہرہ کیا کرو' تمہاری آواز اچھی ہے اور اچھی آواز کے قدردان بہت لوگ تمہیں سننے ضرور آئیں گے۔ سو اسی مشورے کے نتیجے میں اندرون لاہور کے اس محلے میں وہ گھر لیا گیا' جہاں آپ رابعہ بی بی! ان سے اتفاقاً" آن ٹکرائیں اور آپ نے ان کی صحبت میں تہذیب کے چند قدم چلنا سیکھ لیے۔" بلال کے لہجے میں ایک مرتبہ پھر تلخی اور طنز اتر آیا۔
"میری خوش قسمتی تھی وہ اتفاقاً" ٹکراؤ۔ میری زندگی سنور گئی اور آج تک جو صراط مستقیم میرا راست ہے' وہ اسی نیک روح کی صحبت کا نتیجہ ہے۔" رابعہ نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔
"اچھا!" بلال استہزائیہ انداز میں بولے۔ "خیر اس چھوٹے سے کرائے کے مکان کے صحن میں محافل موسیقی سجتیں اور فن کے قدردان حاضرین بننے لگے' جہاں ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور وہ مسئلہ تھے اہل محلہ۔ چوہدری صاحب! آپ محلے والوں کی طاقت سے تو واقف ہی ہوں گے' ایک بہت بڑا فیکٹر بن جاتی ہے یہ طاقت انسانوں کی زندگیوں میں۔"
"بالکل!" چوہدری صاحب نے سرہلایا۔
"اس طاقت نے شہناز کے سر پر منڈلانا شروع کردیا۔ اس پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ شریفوں کے محلے میں گانا بجانا نہیں چلے گا۔ شریفوں کا محلہ سمجھتے ہیں نا آپ چوہدری صاحب؟" ایک بار پھر بلال نے چوہدری صاحب سے

"بالکل' بالکل۔" چوہدری صاحب نے سرہلایا۔

"یہ اور بات کہ شریفوں کے اس محلے پر اصل حکومت بدمعاش کررہے ہوں اور بدمعاشوں کی سرپرستی میں سب دھندے خفیہ شریفوں کے ہی اسی محلے میں چل رہے ہوں۔" بلال نے کچھ یاد کرتے کرتے سر جھٹکا۔

"بس ایسا ہی کچھ حال شریفوں کے اس محلے کا بھی تھا' جس کی سرپرستی لطیف عرف طیفا لاٹ کررہا تھا۔ شہناز کو اہل محلہ نے دھمکانا شروع کیا اور طیفا لاٹ' شہناز اور اہل محلہ کے درمیان آگیا۔ اس نے اہل محلہ کی شرافت کو چپ کا روزہ رکھوا دیا اور شہناز کو ہر طرح فیسی لیٹ (زیر احسان) کرتے ہوئے اس کے کاروبار زندگی کا سرپرست بن گیا۔"

"اللہ کی مار پڑے موئے پر' آگ لگ جائے اس کے اگلے پچھلوں کو' مرتے پانی نصیب نہ ہو کلموئے کو۔" رابعہ کلثوم یہاں خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔

"حیران مت ہوں چوہدری صاحب! رابعہ بی بی اپنی آبائی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ ان کے ابا یا تو دوسرے لوگوں کی پگڑیاں سنبھالنے کا کام کرتے تھے یا پگڑیاں اچھالنے کا۔ وہ ہی کام ان کو بھی آتے ہیں۔ لوگوں کے بھاگ لگے رہنے کی دعا یا ان کے جہنم واصل ہوجانے کی بددعا۔ دونوں طرف انتہا ہے۔" بلال نے کہا۔

رابعہ بی بی نے ایک مرتبہ پھر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا' مگر فلزا کے اشارے پر خاموش رہ گئیں۔

"وہ تو مرحومہ کا سرپرست بن گیا۔ یہ بتایئے آپ کی 'آمد' کس طرح ہوئی ان کی زندگی میں؟" چوہدری صاحب نے سوال کیا۔

"میں ایک مسکین سی زندگی گزار رہا تھا۔ یتیم یسیر دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والا بچہ تھا' جو بڑا ہوا تو اپنے پیروں پر خود کھڑے ہونے کی تلقین کرکے گھر سے نکال دیا گیا۔ ایک سے دوسری نوکری کو سوچ کرتا۔ روزگار کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا' میں ایک ایسے شخص سے دوستی اختیار کرچکا تھا جس کے پاس تھوڑا بہت ایسا سرمایہ تھا جس سے وہ کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے میرے جیسے ذہین اور تیز طرار شخص کی ہی ضرورت تھی۔ ہم دونوں اس متوقع کاروبار کی تفصیلات ڈسکس کرتے رہتے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص اس مغنیہ کی غزل سننے ہر رات اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ جس کی ایک غزل میں نے بھی ریڈیو پر سنی تھی اور دوبارہ سننے کی خواہش ہی کرتا رہ گیا تھا۔ میرے شوق اور پسند کو دیکھتے ہوئے میرا دوست ایک رات مجھے بھی وہاں لے گیا۔ ایک بار کا وہ جانا' بار بار جانے کا پیش خیمہ بن گیا۔ میں آواز کا مداح تھا۔ زلف کا اسیر ہوا اور شناسائی بڑھانے کا متمنی ہونے لگا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ دوسری طرف کی نظروں نے بھی مجھے خود میں بسالیا۔ اس طرح دونوں طرف آگ برابر لگ گئی اور اپنی اس لگن میں ڈوبے ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کوئی اور بھی ہے' جو میری طرح اس کی زلف کا اسیر ہوچکا تھا اور اسی لیے سرپرستی پر بھی مامور ہوا تھا۔"

"یعنی وہ ہی بدمعاش اعلا طیفا لاٹ۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"جی وہی۔" بلال نے سرہلایا۔ "ادھر معاملہ بڑھا اور بڑھ کر زندگی بھر کے ساتھ تک پہنچ گیا۔ ہمارا نکاح ہوگیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ موصوف لاٹ صاحب اپنے اور مطلوب کے درمیان آنے والی ہر دیوار ڈھا دینے کے درپے ہوچکے تھے۔ اس وقت میرے مالی حالت یہ تھے کہ راولپنڈی میں دوست کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کرچکا تھا۔ کبھی نفع' کبھی نقصان کا چکر شروع ہوچکا تھا۔ ہفتے کے چھ دن پنڈی میں گزارتا تھا اور جمعرات کی رات لاہور پہنچتا تھا۔ یہ وہی دن تھے' جب لباس کی رفوگری اور دل کی دل بستگی کا آغاز ہوا تھا۔ کسی کے ساتھ میں' کسی کے دل میں بس جانے کا کیا مزا ہوتا ہے' محسوس ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کسی کی آنکھ میں میرے لیے خون

بھی اُتر چکا ہے۔ رابعہ بی بی اور سراج سرفراز اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کے عینی گواہ ہیں۔ بلکہ ان دنوں جب طیفے لاٹر کی موشگافیوں اور ذہنی حالت کی اطلاعات ملنی شروع ہوئیں۔ یہ رابعہ ہی تھی جو مجھے اپنی حفاظت کرنے اور طیفے سے بچ کر رہنے کی تلقین کیا کرتی تھی۔"

بلال نے رابعہ بی بی کی طرف دیکھا جنہوں نے یہ بات سن کر ناگواری سے سر جھٹک کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

"یعنی وہ آپ کے قتل کے درپے تھا؟" چوہدری صاحب نے کہا۔

"ظاہر سی بات ہے' دشمنی ہمیشہ رقیب روسیاہ سے ہی ہوتی ہے' کسی راہ چلتے سے نہیں ہوتی۔"

"پھر آپ بچ کیسے گئے؟"

"بچ اس لیے گیا کہ اللہ کو میری زندگی منظور تھی' ورنہ اس شخص نے کوشش تو کئی بار کی۔"

"آپ سمجھ چکے تھے کہ آپ کو اس سے جان کا خطرہ تھا۔ آپ نے کہیں شکایت کیوں نہیں کی۔ کہیں کوئی درخواست کیوں نہیں دی؟"

"چوہدری صاحب! میں نے بتایا کہ اس زمانے میں میرا ذریعہ معاش غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھا۔ گھر والی اور آنے والے بچے کے احساس نے مجھے لاپروائی چھوڑ کر سنجیدگی سے اپنے قدم جمانے کی کوشش میں تو لگا دیا تھا۔ مگر پھر بھی میں ابھی ایک غریب آدمی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بد قسمتی سے شریف بھی تھا اور طیفا اس زمانے کے جوا مافیا والوں کا بندہ تھا۔ سلطانہ ڈاکو ٹائپ شخص' امیروں کے ساتھ جرم اور غریبوں کا ہمدرد قسم کا انسان' کسی کو قتل کرنا' کسی کو اغوا کرالینا' بھتے لینا اور جگہ جگہ دھندوں کے اڈے چلانا' اس زمانے میں تازہ تازہ وارد ہوئی ہیروئن کی اسمگلنگ اور کاروبار میں ملوث' وہ شخص ویسا ہی تھا جسے عرف عام میں کن ٹٹا کہتے ہیں۔"

"اوہ!" چوہدری صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اب میں ایک بے یار و مددگار شخص اس سے متھا لگانے پر قادر نہیں تھا۔ اوپر سے بیوی کی نصیحتیں اور مشورے۔ طیفے سے بچ کر رہو' چاہے اس کے لیے میرے پاس آنا چھوڑ دو' کیونکہ طیفے نے اپنے جاسوس محلے میں چھوڑ رکھے تھے۔ جیسے ہی میری وہاں آمد کی بھنک اسے پڑتی۔ وہ چھرا لہراتا کہیں نہ کہیں سے آوارد ہوتا اور مجھے اپنی جان بچانے کے لیے چھپنا پڑتا۔"

"محلہ بدل لیتے آپ۔ آسان حل تھا۔"

"وہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ محلہ بدلا۔ سراج کو چوکیداری پر بٹھایا۔ کچھ عرصہ سکون کا گزرا' لیکن پھر موصوف نے اس محلے کا بھی سراغ لگا لیا اور اس سراغ لگا لینے کا بڑا سبب سراج جیسی بڑی نشانی کا ساتھ ہوتا تھا۔ مرد آدمی تھا۔ گھر میں چھپا بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ باہر دکانوں پر' تھڑوں پر' مسجد میں بیٹھنے اٹھنے لگا اور ہم پکڑے گئے۔"

"گویا نئے مکان پر بھی چھرا لہرایا گیا۔"

"بالکل لہرایا گیا۔ لیکن وہاں ایسا بھی ہوا کہ میرے بیٹے کی پیدائش کے ساتھ ہی وہ کاروبار جو شروع کیا تھا' اس کے چل پڑنے کی امید پیدا ہو گئی اور میرا زیادہ وقت پنڈی میں گزرنے لگا۔"

"گویا سعد آپ کے لیے سعد ہی ثابت ہوا۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں جبکہ میرا اس وقت خیال مختلف تھا۔ سعد ابھی بہت چھوٹا تھا۔ جب مجھ پر بس نہ چلنے پر طیش میں آکر طیفے نے محبوبہ کو ہی نشانہ بنایا اور کسی بہانے اسے زہر آلود کانجی پلوا دی۔"

"اوہ۔۔۔ زہر آلود کانجی۔۔۔ وہ اس حملے میں بچ گئیں کیا؟" چوہدری صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔ وہ بچ گئی۔" بلال کے لہجے میں افسردگی اتری۔ "اور اسے بچ ہی جانا تھا' کیونکہ طیفے کا مقصد اسے

جان سے مار دینا تو تھا ہی نہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں شہناز کی صورت اور گلے کے سُر کا اسیر تھا۔ اس نے ان دونوں کو نشانہ بنایا۔ زہر خورانی کے نتیجے میں اس کے گلے کا سُر بھی گیا اور چہرے کی خوب صورتی بھی۔ چہرہ پہلے زخم زخم ہوا اور زخم مندمل ہو جانے پر داغ دار ہو گیا۔

"آہ!" رابعہ کلثوم کے منہ سے آہ نکلی اور ساتھ ہی جیسے انہوں نے وہ چہرہ یاد کرتے ہوئے شدت کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"اوہ مائی گاڈ!" چوہدری صاحب نے رابعہ کلثوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آپ اپنی بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ پنڈی کیوں نہیں لے گئے تھے۔"

"میں یہی کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ پنڈی میں اس وقت میں چند لوگوں کے ساتھ ایک گھر شیئر کر رہا تھا۔ فیملی کو ساتھ رکھنے کے لیے کرائے کا مکان الگ سے لینا پڑتا' دیگر ضروریات بھی پوری کرنے کے لیے ماہانہ مسلسل آمدنی درکار تھی جو اس وقت میرے پاس مستقل نہیں آرہی تھی۔ شروع کی آمدنی سے میں نے ایک سیکنڈ بلکہ تھرڈ ہینڈ گاڑی خریدی جو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر بیوی کو تحفتاً پیش کردی۔ آپ جانتے ہیں محبت کے اولین اظہار... اس وقت صرف رومانس یاد ہوتا ہے۔ غم روزگار کا ہوش تو بہت بعد میں آتا ہے۔ گاڑی خریدنے کے نتیجے میں 'میں مقروض بھی ہو گیا اور آمدنی کا بیشتر حصہ وہ قرض اتارنے میں صرف ہونے لگا۔ لہٰذا میں فیملی کو ساتھ رکھنے کی خواہش کے باوجود ابھی تک اسے اپنے ساتھ لے جا نہیں سکا۔"

بلال دم لینے کو رکے' رابعہ کلثوم نے ایک بار پھر سر جھٹک کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"یہاں وسائل اور پیسے کی کمی ایک اور ستم ظریفی ساتھ لے آئی چوہدری صاحب' بیوی کا چہرہ اور آواز گئی اور بچے نے بلوغت کا سفر شروع کرنے کے ساتھ ہی ماں کو دیکھ کر ڈرنا شروع کر دیا۔"

"اس قدر خراب حالت ہو چکی تھی کیا چہرے کی؟ آخر ملایا کیا گیا تھا اس کا نجی میں لیب ٹیسٹ نہیں کروایا آپ نے اس کا؟ سیندور پلا کر آواز بٹھانے کے قصے تو میں نے سن رکھے ہیں' مگر یہ کس قسم کا زہر تھا جو چہرہ بھی بدنما کر گیا۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ زہر کیسا تھا۔ مجھ پر تو وہ وقت ہی بہت کڑا تھا۔ بیوی زخم زخم چہرہ اور گلا لیے سرکاری ہسپتال میں پڑی تھی۔ بچہ روتا چیختا چلاتا تھا اور کاروبار کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ میرا ایک پاؤں لاہور دوسرا پنڈی میں رہنے لگا۔ علاج معالجے کا خرچا الگ سر پر آن پڑا تھا۔ پیسہ' چوہدری صاحب! پیسہ دنیا کی اتنی بڑی حقیقت ہے میں نے ان دنوں اس پیسے کی کمی کے ہاتھوں خود کو کیسا بے بس اور مجبور محسوس کیا' یہ میں ہی جانتا ہوں۔ کہاں سے اتنا ڈھیر پیسہ لاتا جو سارے مسائل جادو کی چھڑی سے ختم کر دیتا۔ سراج! تمہیں یاد تو ہوں گے وہ دن؟" بلال نے سراج سرفراز کی طرف دیکھا۔

"الامان! الامان!" سراج سرفراز نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "آپا جی کے چہرے کے زخموں میں پیپ پڑ گئی۔ اور بدبو ایسی آنے لگی تھی کہ قریب کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ اس وقت تو رابعہ بیگم ہی کا حوصلہ تھا کہ خدمت کی اور جی جان سے کی۔"

رابعہ کلثوم نے آنسوؤں کی بہتی قطار کو پونچھا۔

"بس چوہدری صاحب! ان سب المیوں پر بھاری وہ المیہ تھا جب بچے نے ماں کی شکل دیکھ کر ڈرنا' بدکنا اور رونا شروع کر دیا۔ وہ ممتا کی ماری اسے گود میں لینے کی تمنا کرتی۔ بچہ رابعہ بی بی کی گود سے نکلنے کا نام نہ لیتا۔ ایسا چیختا' چلاتا کہ مجبوراً" اسے ماں کے سامنے سے دور لے جانا پڑتا۔"

"چچ... چچ... اور وہ کم بخت طیفا لاٹ... اس کا کیا ہوا؟"

"درمیان میں کچھ عرصہ وہ غائب رہا۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ منشیات کے کسی کیس میں گرفتار ہو گیا تھا۔"
"تو پھر تو چین کے دن ہوں گے آپ کے لیے؟"
"ہوتے ضرور ہوتے' اگر بچہ یوں تنگ نہ کرنے لگ جاتا۔ بچے کی دن بدن بڑھتی چڑچڑاہٹ اور خود سے گریز دیکھ کر ماں نے دل پر پتھر رکھ کر مجھ سے کہا۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ' میرے قریب تو آتا نہیں' تمہارے ساتھ رہے گا تو کم سے کم باپ سے مانوس تو ہو ہی جائے گا۔ یہ بڑی کڑی فرمائش تھی۔ میں پنڈی میں آزاد وقت گزارتا تھا۔ دن کا نکلا رات کو سونے کے لیے گھر آتا تھا۔ وہاں میرے سر پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ لیکن اس بے چاری کا دکھ بھی سمجھتا تھا۔ بچہ سامنے رہتا اور اس کے پاس آنے سے انکاری ہوتا تو اس کے دل پر کیا گزرتی تھی شاید اسی لیے خود سے دور لے جانے کا کہتی تھی۔ اس کے اصرار اور ضد پر میں نے ویسا ہی کرنے کا ارادہ کرلیا' جیسا وہ چاہتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے وعدہ کرکے اٹھا کہ جلد ہی اتنا پیسہ اکٹھا کرلوں گا کہ اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرا کر اس کو دوبارہ وہی شکل لوٹا سکوں جسے دیکھ کر بچہ نہ بدکے گا' نہ روئے گا۔"
"گویا وہ حادثہ ان سے آپ کی محبت پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ دشمن کا وہ وار بھی رائیگاں گیا۔" چوہدری صاحب ذرا سا مسکرا کر بولے۔
"محبت چہروں اور آوازوں سے تھوڑی کی جاتی ہے چوہدری صاحب۔ محبت تو روح سے کی جاتی ہے۔ دل سے کی جاتی ہے۔ انسان سے کی جاتی ہے۔ اس کی خوبیوں سے کی جاتی ہے۔ محبت انسان کی غیر مرئی خصوصیات سے کی جاتی ہے چوہدری صاحب! محبت ظاہری چیزوں سے نہیں کی جاتی' کیونکہ یہ سدا رہنے والی چیزیں نہیں ہوتیں' یہ تو کبھی بھی کسی بھی وقت ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔"
بلال کہہ رہے تھے اور پہلی مرتبہ فلزا اور رابعہ دم بخود ہو کر ان کو سن رہی تھیں۔
"صرف باتیں..." چند ساعتوں کے بعد رابعہ کلثوم نے بلال کی گفتگو کے سحر سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آتے ہوئے فلزا سے کہا۔ فلزا نے ان کا ہاتھ دبایا۔
"بہت خوب۔" چوہدری صاحب نے بلال سلطان کی بات کو سراہا۔
"میں بچے کو پنڈی لے گیا۔ بچے کو فضل حسین اور میمونہ بی جیسے فرشتہ صفت لوگوں کے پاس چھوڑا جو اتفاق سے میرے پارٹنر کے گھریلو ملازم تھے اور انہیں اس نے اپنے گھر میں ایک کوارٹر دے رکھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں میاں' بیوی انتہائی مہذب' شائستہ اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ ان دونوں کے پاس سعد کو چھوڑ کر میں مطمئن ہو گیا۔ لیکن کم بختیاں ابھی باقی تھیں۔ سعد کو لے آنے کے بعد دوبارہ لاہور جانے سے پہلے ہی نجانے کہاں سے طیفا میرا پیچھا کرتے پنڈی پہنچ گیا۔ انجانے میں اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ وہ تو مجھے مار ڈالنے کے لیے آیا تھا۔ لیکن وہی کہ اللہ کو میری زندگی منظور تھی۔ اس نے مجھے بچا لیا۔ میں شدید زخمی ہوا اور کتنا ہی عرصہ ہسپتال میں پڑا رہا۔ مائنڈ یو اس زمانے میں موبائل فونز نہیں ہوتے تھے۔ لینڈ لائن فون بھی گھر گھر نہیں ہوا کرتے تھے۔ ڈائریکٹ ڈائلنگ کی سہولت بھی صرف بڑے شہروں کے لیے تھی اور فون کال بہت مہنگی پڑتی تھی۔ بدقسمتی سے میری بیوی کے پاس لینڈ لائن نمبر بھی نہیں تھا اور میں زخمی اس سے رابطہ کرتا تو کرتا بھی کہاں۔"
رابعہ کلثوم نے چونک کر فلزا کی طرف دیکھا۔ جس نے آگے سے یوں شانے اچکائے جیسے ان حالات سے یکسر ناواقف ہو جو بلال بیان کر رہے تھے۔
"یہیں ہمارے رابطے میں تعطل آیا اور اتنا لمبا آیا کہ کچھ لوگوں نے مجھے گالیاں کوسنے اور بددعائیں دینا شروع کردیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے بقول میں بے وفا' ہرجائی حسن و آواز کا پجاری اپنا بچہ لے کر ایک بے بس' بے سہارا' نیک دل عورت کو چھوڑ کر بھاگ لیا تھا۔" بلال نے طنز بھری نظر رابعہ کلثوم پر ڈالی جو یہ بات سن کر لاشعوری

طور پر سمت کر بیٹھ گئیں۔

"لمبا عرصہ میری کوئی اطلاع نہ ملنے ' بچے سے دوری ' اپنی حالت زار۔۔۔ ان سب چیزوں نے مل کر میری بیوی کے ذہن پر ایسا اثر ڈالا کہ دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ ایسی ماہیت قلب ہوئی کہ دنیاوی چیزوں سے منہ موڑ کر اللہ سے لو لگالی۔ اپنا قیمتی سامان بیچ باچ کر سراج اور رابعہ کے ساتھ پانی کے جہاز پر بیٹھ کر حج بیت اللہ کر آئیں اور واپسی پر ایسی درویشی اختیار کرلی کہ جو سامان حج سے ساتھ لے کر آئی تھیں گھر کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر اسے بیچ کر گزارہ کرنے لگیں۔"

"عجوہ کھجوریں ' آب زم زم میں بھگوئی تسبیحاں ' جاء نمازیں۔" رابعہ کے کانوں میں ماضی کی آوازیں باز گشت کرنے لگیں۔

"یہاں ایک بات بتانا بھول گیا۔ حج پر جانے سے پہلے سراج اور رابعہ کا نکاح انہوں نے بصد اصرار کرایا ' کیونکہ نئے محلے والے سراج کی دونا محرم خواتین کے ساتھ موجودگی پر انگلیاں اٹھانے لگے تھے۔"

"بصد اصرار۔۔۔" چوہدری صاحب نے مولوی سراج اور رابعہ بیگم پر باری باری نظر ڈالی۔ "ہوں۔۔۔ اب سمجھ میں آیا۔" انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

"جی بصد اصرار۔" بلال سلطان نے چوہدری صاحب کے دل کی بات پڑھتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے بعد کی کہانی مختصرا" یہ ہے کہ جیسے ہی میں ہسپتال سے اٹھا۔ ایک رات کے اندھیرے میں لاہور جا پہنچا۔ گھر کی بیرونی دیوار سے رسی کی سیڑھی اٹکا کر چھت پر چڑھا اور زوجہ کے کمرے کی کھڑکی کے ذریعے اس تک جا پہنچا۔"

"ایسا آپ نے طیفے لاٹ سے بچنے کی خاطر کیا ہوگا؟"

"اس سے بچنے کی خاطر بھی اور ان سے بچنے کی خاطر بھی۔" بلال نے رابعہ اور مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ "انسان اپنی فطری جبلت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے چوہدری صاحب! ان دونوں کے منہ سے ضرور میرے دوبارہ اس کی زندگی میں آجانے کی بات نکلتی اور میں پھر سے نظروں میں آجاتا۔ اس بار میں بہت محتاط رہنا چاہتا تھا۔"

"آپ کی زوجہ نے یوں غائب ہو جانے پر آپ کو دھتکارا نہیں۔"

"نہیں اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔" بلال سلطان کچھ یاد کرکے مسکرائے۔ "وہ مجھ سے بدگمان نہیں ' ناراض تھی ' حالانکہ اسے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔" رابعہ نے ایک بار پھر منہ پھیرا۔

"وہ خوف خدا رکھنے والی باوفا عورت تھی چوہدری صاحب! اور اس وقت تو ماہیت قلب ہو جانے کی وجہ سے اور بھی زیادہ خدا خوفی اس کے دل میں اتر چکی تھی۔ گانے بجانے ' باپ سے بغاوت اور طیفے جیسے شخص کو روزی روٹی کے ذریعے کا سرپرست بنا لینے پر گھنٹوں پچھتاتی اور دنوں رویا کرتی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ شوہر پرستی ' مسلمان عورت پر لازم ٹھہری ہے۔ لہٰذا شوہر کے خلاف کوئی بات منہ سے نکالنا سخت گناہ کی بات ہے۔ کیوں رابعہ بی بی۔۔۔ اتنا تو یاد ہوگا آپ کو؟"

رابعہ نے جواب نہیں دیا۔ ان کا ذہن کسی جمع تقسیم میں الجھ گیا تھا۔

"میں نے یوں ہی چوروں کی طرح آنا جانا شروع کر دیا اور اسے اکسایا کہ رابعہ اور سراج سے کہے ' اپنا ٹھکانا بدل لیں۔ ان دونوں کے ہاں ولادت متوقع تھی۔ یہ دونوں بے گناہ ہمارے ساتھ طیفے کی نظروں میں آئے ہوئے تھے۔ سراج بے چارہ تو اس کے ہاتھوں پٹ بھی گیا اور چھرے کے وار بھی سہے اس نے۔ اسی لیے اس نے ان دونوں کو یزمان منڈی جانے پر مجبور کیا۔ یہ دونوں چلے گئے ' پیچھے وہ اکیلی جس سے جب میں ملنے جاتا اسے کھل کر مجھ پر نثار ہونے کا موقع ملنے لگا۔ رابعہ اور سراج کی رخصتی سے پہلے اس نے مجھے بتایا۔ وہ امید سے تھی۔ یقین جانیے

چوہدری صاحب! اتنی خوشی مجھے سعد کی آمد کی خبر سن کر نہیں ہوئی جتنی اس بچے کی خبر سن کر ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس وقت میں معاشی طور پر بدحال اور عمر میں بھی کم تھا۔ سعد کے آنے کا سن کر مجھے لگتا تھا' عجیب سی ذمہ داریاں سر پر آن پڑیں گی' مگر اس بچے کی دفعہ میرے قدم جم رہے تھے۔ پیسہ جو ہمیشہ میرا وقت مجھے دینے سے انکار کر دیتا تھا۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں آنے لگا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا' سعد کا نام تو ہم نے یوں ہی سعد رکھ دیا۔ اصل میں تو یہ بچہ سعد ہو گا۔" بلال نے سر جھکا۔

"میری قسمت۔۔۔۔ وہ بچہ دنیا میں آ کر بھی میرا نہ رہا۔" بلال کی آواز بھر آگئی۔

"میں نے پلان بنایا۔ شہناز کے ہاں ولادت ہونے تک میں پنڈی میں گھر لے کر اسے سنوار بنا چکا ہوں گا۔ سعد کو فضل اور میمونہ سمیت وہاں لے آؤں گا اور پھر آنے والے بچے کو بھی ان دونوں کے حوالے کر کے خود شہناز کو لے کر بیرون ملک جاؤں گا۔ اس کا علاج کروانے۔ میرے دن پھر رہے تھے' مگر میں کنجوسی کرتے ہوئے پیسہ جمع کر رہا تھا۔ وہ پیسہ جو مستقبل کے اچھے دنوں کی نوید تھا۔ میں نے دن میں بھی خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ میری زندگی کا وہ وقت سنہری ترین تھا جسے اب بھی میں دوبارہ پانا چاہتا ہوں' مگر اس کی طرف لپکے ہوئے میرے ہاتھ خالی ہی رہ جاتے ہیں۔

فلزا!" انہوں نے فلزا کی طرف دیکھا۔ "ان ہی دنوں میری زندگی میں تمہاری بھی آمد ہوئی تھی۔ تمہیں میرے وہ دن یاد تو ہوں گے۔ ذرا' ذرا سی خوش حالی میرے حلیے سے ٹپکتی ہوگی اور ذرا' ذرا سا ارسٹو کریٹ میں نظر آتا ہوں گا۔ فلزا نے آنکھیں میچ لیں۔ شاید اسے بھی کچھ یاد آگیا تھا۔

"عرصے کے بعد میں خوش رہنے لگا تھا۔ قدم قدم بڑا ہوتا سعد مجھے جی جان سے پیارا لگنے لگا تھا۔ وہ میری بات نہیں سمجھتا تھا' پھر بھی میں اسے آنے والے اچھے دنوں کی باتیں سنانے لگا تھا۔ فلزا جیسے مصوروں' دانشوروں اور ادیبوں کی محفلوں تک میری رسائی ہونے لگی تھی۔ زندگی بوجھ' پریشانی' مسلسل دباؤ سے آزاد ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔ اپنے سامنے وہ زندگی نظر آنے لگی تھی جو میرا خواب تھی۔ ویسی زندگی جیسی میں چاہتا تھا۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکے۔ "خواب اور آدرش' سپنے اور خواہشات یوں پوری ہو جانا میرا مقسوم ہی نہ تھا۔ خواہشوں اور خوابوں کی سرزمین سے عمر بھر کی جلاوطنی ہی میرا مقدر تھا۔"

انہوں نے رک کر دیکھا سب کے چہرے افسردہ ہونے لگے تھے اور ہونٹ خاموش تھے۔ جیسے کسی المیہ فلم کے کلائمکس تک پہنچتے پہنچتے دیکھنے والوں کے ہو جاتے ہیں۔

"فلزا بی بی کو وہ رات یاد ہے اور میں جانتا ہوں کہ کیوں یاد ہے؟" توقف کے بعد بلال سلطان کی آواز دوبارہ گونجی۔

"فلزا ظہور۔۔۔۔ تم مجھ پر غصہ کرنے اور مجھے واجب القتل قرار دے دینے میں شاید حق بجانب تھیں۔" انہوں نے فلزا کو براہ راست مخاطب کیا۔ "مگر میرا اللہ گواہ ہے' میں تمہیں کوئی دھوکا نہیں دے رہا تھا۔ میں واقعی صرف تمہارے من کا قدردان تھا۔ تم اتنا ہنر رکھتے ہوئے بھی گمنامی کی زندگی گزار رہی تھیں' میں تازہ تازہ کمائے پیسے اور تعلقات کے سر پر تمہیں لائم لائٹ میں لانا چاہتا تھا' کیونکہ میں جانتا تھا کہ انسان صلاحیت رکھتے ہوئے بھی گمنام رہے تو اس کی زندگی کیسا بڑا المیہ بن جاتی ہے۔ میں اسی مقصد کے لیے تمہیں اس رات لاہور لے کر گیا تھا۔ وہ نصف شب' جو تمہارے لیے مڈ نائٹ ان ہیون ہوئی تھی اور میرے لیے نئی صبح کی نوید اور میرے درمیان آخری ساعت تھی۔

شہناز کو مڈوائف نے ان ہی دنوں ولادت کا بتا رکھا تھا اور نجانے کیوں میرا دل کہتا تھا' وہ دن اس نصف شب کی کوکھ سے نکلنے والا دن ہی تھا۔ میں نے اسے لینڈ لائن فون لگوا کر دے دیا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس سے بات کی' اس

نے بتایا۔ وہ ٹھیک تھی۔ میں نے سوچا۔ تمہیں دوستوں کی محفل میں متعارف کرواکر اور سامان مصوری دلوا کر کہیں ٹھہراؤں گا اور خود شہناز کے پاس چلا جاؤں گا۔ لیکن اسی شام اس سے فون پر رابطہ کرنے پر معلوم ہوا اچانک اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور مجھے فوراً" اس کے پاس جانا تھا۔ محلے میں موجود مڈوائف اسی روز کسی فوتگی پر چلی گئی تھی اور وہ اکیلی تھی۔ اس ایمرجنسی میں تم نے بتایا' تم تولاہور میں کسی کو جانتی تک نہیں۔ وہ تمہاری غلط بیانی تھی' لیکن تمہیں اس بات کا مارجن دیا جاسکتا ہے کہ تم دل کے ہاتھوں مجبور تھیں کہ تم میرے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھیں۔ تم ناواقف تھیں کہ آنے والے وقت کا کیا پتا' رومانس سے بھرپور ہویا خون آشام نکل آئے۔ اسی لیے بناسوچے سمجھے میرے ساتھ چل دیں۔

وہ ڈھلتی شام' اترتا اندھیرا یاد ہوگا تمہیں جب میں دیوانہ وار اس محلے کی گلیوں میں بھاگ رہا تھا اور تم میرے پیچھے آرہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں شہناز کو اٹھا کر کسی بہترین ہسپتال میں لے جاؤں گا۔ لیکن جب تک میں اس تک پہنچا مجھے دیر ہو چکی تھی۔

وہ اکیلی ہی تخلیق کا درد سہ سہ کر بے حال ہو چکی تھی اور نئی جان کے وجود میں آنے میں شاید کچھ ہی دیر باقی تھی۔ میں پہلے ہی گلیوں سے بھاگ کر آنے کی بے احتیاطی کر چکا تھا۔ باہر نکل کر کسی محلے دار خاتون کو بلانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ جب ہی میں نے کوئی تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ کام خود سرانجام دینے کا فیصلہ لمحوں میں کرلیا۔ فلزا جانتی ہے' وہ صورت حال کیا تھی۔ اس کو بھی میں نے اپنی مدد کے لیے کہا۔ اس وقت یہ شہناز کو پہچان چکی تھی' لیکن شناسائی پر رقابت غالب آگئی اور یہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ جیسے تیسے ولادت ہوگئی۔

میں نے بچے کو ہاتھوں میں اٹھایا ہی تھا کہ مجھے اپنی قمیص پیچھے سے کھنچتی محسوس ہوئی۔ میں نے بچہ چارپائی پر رکھا اور مڑ کر دیکھا' وہ ازلی وابدی منحوس شخص میرے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھرا تھا اس وقت مجھے موت سے شاید کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ میری نظروں کے سامنے میرے خوابوں کی وادی جل کر خاک ہو جانے کا منظر گھومنے لگا۔ میری طرف ایک وار آیا' میں نے ٹرانس کی کیفیت میں ہی اس وار کو روک لیا اور پھر باقاعدہ جیسے ایک کشتی سی شروع ہوگئی۔ موت ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی اور میں زندگی کی لڑائی لڑنے کے لیے ذہنی طور پر لمحوں میں تیار ہو چکا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ہاتھوں اور بازوؤں میں اس رات اتنی طاقت کیسے آگئی کہ میں نے اس کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہوا میرے قدموں میں گرا اور میں نے ایک لمحاتی غلطی کر ڈالی' میں اپنی نیم عریاں بیوی پر چادر ڈالنا چاہتا تھا جو اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر کراہنا تک بھی بھول چکی تھی۔ میں نے چادر کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی اور اسی ایک لمحے میں وہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ اس رات مجھ پر اس کا بس چلنے والا نہیں تھا۔ اس نے زمین پر گرا چھرا اٹھایا اور بھرائی' تھکی ہوئی آواز میں بولا۔

"لے پھر آج سے یہ اگر میری نہیں تو تیری بھی نہیں۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا' اس نے چھرا شہناز کی گردن پر پھیر دیا۔ لہو کا ایک سمندر تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے بہنے لگا تھا۔ نہ کوئی آہ' نہ کراہ' میری زندگی جاگنے سے پہلے سو چکی تھی۔ خون کے سمندر نے میری آنکھوں میں بھی خون اتار دیا تھا۔ میں اس کی طرف پاگلوں کی طرح بڑھا۔ وہ کائیاں آدمی تھا' جانتا تھا اب میں ہر کرنی کر گزروں گا۔ اسی کھڑکی کے راستے جس سے وہ اندر آیا تھا۔ سرعت سے باہر کود گیا۔ اس کا چھرا وہیں گر گیا جسے اٹھا کر میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا کہ بچہ رونے لگا۔ میری توجہ بچے کی طرف منتقل ہوگئی۔

اس وقت نجانے کیا معجزہ تھا کہ میری تمام حسیات سوفیصد کام کرنے لگی تھیں۔ میرے سامنے بیوی کی سرکٹی لاش تھی۔ قاتل فرار ہو چکا تھا۔ نوزائیدہ بچہ تھا اور آگے پیش آنے والے حالات کا خاکہ ناچ رہا تھا۔ اس وقت فوری خیال بچے کو محفوظ ہاتھوں میں پکڑانے کا آیا تھا۔ فضل حسین اپنے کسی کام سے لاہور آیا ہوا تھا۔ اسے میں

پہلے ہی سے اس گھر میں آنے کو کہہ چکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیسے پل کی پل میں دنیا بدل جانے والی تھی۔ میں نے بچہ اٹھایا اور فلزا کی محبت کو آزمائش میں ڈالنے کو اسے پکڑا دیا۔ جو منظر اس کے سامنے تھا' اس کا مجھے قاتل سمجھنا فطری عمل تھا۔ فضل حسین کی آمد کے ساتھ ہی میں نے اسے بس میں بیٹھنے کے لیے بھجوا دیا اور خود۔۔۔ اپنی لٹی ہوئی کائنات کی طرف متوجہ ہو گیا۔"

"کمال اعصاب تھے آپ کے' آپ نے خود پر قابو کیسے پائے رکھا۔"

"میں نہیں جانتا' میں آج تک نہیں جان پایا کہ خود کو میں نے کنٹرول میں کیسے رکھا۔ مجھے پیش آنے والے حالات صاف نظر آرہے تھے۔ میرے ہاتھ خون سے رنگے تھے اور میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے میں ناکام ہونے والا تھا۔ چھرا میرے ہاتھ میں تھا اور جائے واردات پر صرف میں ہی موجود تھا۔ پوسٹ مارٹم ہوتا تو کیا' کیا ظاہر ہونے والا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا۔ تازہ زچگی سے فارغ ہونے والی عورت قتل ہوئی تھی۔ اس کا بچہ کہاں تھا۔ فلزا بھی اس معاملے میں بے گناہ الجھ جاتی۔ اسی لیے میں نے جذبات کو اعصاب پر حاوی ہونے سے روکا۔

فضل حسین واپس آیا اور پھر سراج اور رابعہ بھی آگئے۔ یہ جانتے ہوں گے کہ میری کیفیت کیا تھی۔ سراج محبت میں وہ سب کہہ رہا تھا جسے رابعہ نے دہرایا۔ مگر میں جانتا تھا' ان دونوں کی جائے واردات پر موجودگی ان کو بھی لمبے مقدموں میں گھسیٹ لے گی۔ جب ہی وہ دھمکیاں دے کر ان کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا' جس پر آج بھی یہ بدگمان ہیں۔ ان کے ساتھ معصوم بچی تھی۔ میرے بچے ماں سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ بچی بے گناہ رل جاتی۔ میں جس خیال سے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے بھگا رہا تھا۔ اسی خیال پر یہ مجھ سے نالاں ہیں۔" بلال سلطان نے سراج اور رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں نے سر جھکا لیے۔

"پھر آگے کیا ہوا' پولیس پہنچی یا نہیں' آپ پکڑے گئے اور اگر پکڑے گئے تو آج تک بچ کیسے رہے؟"

"اس شاطر نے اپنے ہی بندوں کے ذریعے اس مکان میں قتل ہو جانے کی اطلاع کروائی اور پولیس بھجوا دی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا' مجھے آگے کیا کرنا تھا کہ پولیس میرے سر پر تھی۔"

"تو آپ پکڑے گئے؟"

"ظاہر سی بات ہے۔"

"قتل ثابت ہو گیا؟"

"آہ!" بلال سلطان نے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ذرا سا آرام دینے کی کوشش کی اور تھکی ہوئی آنکھوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے دبایا۔

"میں نے کہا نا چوہدری صاحب! اللہ کو میری زندگی منظور تھی۔ حالانکہ ہر بار وہ مجھے ہی قتل کرنے آیا۔ ہر بار میں بچ گیا۔ آخری بار بھی میں بچ گیا اور وہ چلی گئی۔ جس کے خوب صورت دل کو میں نے تا عمر پوجنا تھا۔" انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔

"میں سوچتا تھا' رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں' عدم ثبوت کا بھی کوئی امکان نہیں' میری موت طبعی کے ہاتھوں نہیں پھانسی کے جھولے پر لکھی ہے۔ لیکن اللہ کو ایک مرتبہ پھر میری زندگی منظور تھی۔ میں چھ مہینے جیل میں رہا۔ پیشیاں اور تاریخیں پڑتی رہیں۔ میرا تو کوئی گواہ تھا' نہ پیروی کرنے والا' میں سوچتا تھا' یہ پیشیاں اور تاریخیں محض زندگی کے باقی سانس تھے جو بہرحال مجھے لینے ہی تھے۔"

"اس دوران سعد کا کیا بنا؟"

"اللہ جزا دے فضل حسین کو' بہت ہی وفادار ثابت ہوا۔ واحد وہ شخص تھا جو کہتا تھا' قتل میں نے نہیں کیا۔ عدالت میں گواہیاں بھی دیتا رہا کہ جائے واردات کا غور سے معائنہ کیا جائے۔ فرش کی گرد پر دو افراد کے قدموں

کے نشان یوں موجود تھے۔ جیسے وہ دونوں کشتی لڑ رہے ہوں۔ کمرے کی دیوار پر جو خون آلود ہاتھوں کے نشان ہیں ' ان کا بھی معائنہ کیا جائے ' مگر ہم کمزور تھے اور ہماری مخالف پارٹی تگڑی تھی۔ وہ جرم کی دنیا کا بادشاہ تھا اور میں بے گناہی کا فقیر ' اس دوران فضل اور میمونہ نے سعد کی دیکھ بھال یوں کی کہ کیا میں خود کرتا۔"

میں کسی بھی پیشی پر پھانسی کے حکم نامے کا منتظر تھا کہ مخالف پارٹی کے گروہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ طیفے کے دست راست نے پولیس کے روبرو ان تمام وارداتوں کا اعتراف کرلیا جو کی تو ان لوگوں نے تھیں ' لیکن ڈال کسی اور پر دی گئیں۔ ان ہی وارداتوں میں سے ایک شہناز کا قتل بھی تھا۔ اس شخص نے بتایا ' قتل کے ارادے سے وہ اور طیفا اکٹھے نکلے تھے۔ وہ باہر پہرہ دے رہا تھا ' جبکہ طیفا کھڑکی سے اندر کودا ' وہ کھڑکی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ آلہ قتل کے متعلق بھی اس نے تفصیل سے بتایا کہ کہاں سے اور کس نے خریدا۔ اب مقدمے کا رخ ہی بدل گیا۔"

"اوہ... کیسا اتفاق ہے۔"

سامعین اب اپنی اپنی نشستوں کے کناروں پر بیٹھے تھے۔ متجسس اور حیران۔

"بس پھر یوں ہوا جیسے دنوں میں رت بدل گئی ' طیفا گرفتار ہوا ' ثبوت اکٹھے ہوئے اور اگلے دو ماہ کے اندر مجھے بے گناہ قرار دے کر رہا کردیا گیا۔ طیفا اپنے ہی ساتھیوں کی لڑائی کی لپیٹ میں آگیا۔"

"جسے اللہ رکھے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"جی۔ جسے اللہ رکھے۔" بلال نے کہا۔ ان کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیلی۔ "حالانکہ اس وقت مجھے اپنے جیسے جانے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جس کے لیے تنکا تنکا جوڑ رہا تھا۔ وہ آشیانہ بننے سے پہلے قتل کردی گئی۔ جس بچے کا منتظر تھا ' وہ بقول فلزا کے مرچکا تھا۔ ایک سعد تھا جو مجھ سے زیادہ فضل اور میمونہ سے مانوس تھا۔ المیوں کی کوئی ایک قسم نہیں ہوتی چوہدری صاحب! المیے ہزارہا شکلیں رکھتے ہیں۔ میں اپنے تئیں بہت شاطر ذہن رکھتا ہوں۔ لیکن میری آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ جو ہوا وہ کیوں ہوا۔ رقابت ' حسد ' غصہ ' اختیار ' رشک ' سب مل کر میری معصوم سی محبت کے پیچھے پڑے اور اسے کھا گئے۔ میں ایک عام سا انسان تھا۔ واقعات کی ترتیب نے میرے اندر عام سے خاص بن کر دکھانے کا ری ایکشن پیدا کردیا۔ مجھے اس پیسے کے حصول کا جنون ہو گیا جو نہیں تھا تو میرا سب کچھ لٹ گیا۔ اب میں اس لیے اسے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ذریعے اپنے لیٹروں کو لوٹ سکوں۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش تھی کہ طیفا ' قانون سے سزا نہ پانے پائے ' میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ پولیس ' وکیل ' جج ' عدالت ' اس کے لیے مجھے کچھ بھی خریدنا پڑے میں خرید لوں اور اللہ کا کرنا دیکھیے جیسے ہی میں بے گناہ ثابت ہو کر حوالات سے باہر آیا اور میں نے کاروبار دوبارہ جوائن کیا۔ پیسہ ہن کی طرح مجھ پر برسنے لگا۔ وہ مجھ پر یوں مہربان ہوا۔ جس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ شان دار گھر ' گاڑی ' نوکر چاکر سب اختیار میں آگئے۔

"پھر تو آپ نے طیفے کو مار ڈالنے کے اختیار بھی ضرور خریدے ہوں گے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔

"کسی کی جان لینا انسان کے اختیار میں کہاں ہوتا ہے چوہدری صاحب۔" بلال سلطان نے سر جھٹکا۔ ورنہ اپنی اپنی زندگی میں ہم سے تقریباً" ہر شخص کسی ایک کو قتل کرنے کی خواہش ضرور رکھتا ہے۔ پولیس ' وکیل ' جج ' عدالت سب خرید لینے کی سکت آجانے کے باوجود میں طیفے کو اپنے ہاتھوں سے نہ مار سکا۔ وہ اپنے سیل میں ایک روز مردہ پایا گیا ' غالباً" اس نے کوئی زہر چاٹ لیا تھا۔"

"ہا..." ایک سی آوازیں ایک مرتبہ پھر کمرے میں ابھریں۔

"وہ سب کچھ انسان کو دے کر صرف ایک اختیار اللہ انسان کو عطا نہیں کرتا۔" بلال نے کہا۔ "وہ عطا کردے تو بندے کی سرکشی کبھی تھامی نہ جائے ' یہ جو ہم سمجھتے ہیں کہ بہت کام اپنی خواہش پر کرلیتے ہیں تو اسے بھی اپنا اختیار

سمجھنا بہت بڑی حماقت ہوتی ہے۔ وہ اختیار نہیں ہوتا' اللہ کی مرضی اور اجازت ہوتی ہے۔ جو ہماری خواہش میں شامل ہو کر اسے ہو جانے کا حکم سنا دیتی ہے۔ ورنہ سچ پوچھیں تو بندہ تو بڑا ہی بے بس اور مجبور ہے۔"

"بھائی جی! بھائی صاحب!" بلال کے خاموش ہونے پر بلند آواز میں روتے ہوئے مولوی سراج اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ "جو آپ کے ساتھ ہوا' اس کا ایک شمہ بھی ہمارے ساتھ نہیں ہوا اور ہم اتنے سال آپ پر گلہ شکوہ کرتے رہے۔"

"نہیں سراج!" بلال نے نرمی سے کہا۔ "تم لوگوں کے یہ حالات دیکھ کر جو شرمندگی آج میرے اندر اتری ہے۔ اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں' تمہارے پیروں میں پڑ جاؤں' عمر بھر اللہ سے درخواست کروں کہ معاف کر دے تو بھی شاید معافی نہ ملے۔"

بلال سلطان کہہ رہے تھے اور فلزا اور رابعہ ششدر بیٹھی اس شخص کو گریہ کرتے دیکھ رہی تھیں' جو ان کے نزدیک انا پرست' ضدی' خود غرض اور مفاد پرست تھا۔



"میں سمجھتا تھا میں سعد کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور جتنا میں اسے جانتا تھا' اس کے مطابق اسے کسی سے مستقل محبت ہو ہی نہیں سکتی تھی' لیکن تمہارے سلسلے میں شاید وہ بے بس ہو گیا تھا۔" نور فاطمہ سے ملنے کے بعد لاہور واپس آتے ہوئے ابراہیم نے کہا۔

"تمہارا دعوا غلط ثابت ہو گیا' تم سعد کو بالکل بھی نہیں جانتے۔" ماہ نور نے کہا۔

"سچ کہوں تو وہ اتنا غیر متوقع شخص ہے کہ مجھے لگتا تھا ایک روز وہ سارا سے شادی کا اعلان کر دے گا۔ حالانکہ سارا کے سلسلے کو اس نے مجھ سے چھپایا ہوا تھا' لیکن میں اس کی جاسوسی میں لگے رہنے کی عادت میں مبتلا تھا اور یہ عادت مجھے انکل نے ڈالی تھی۔ اسی لیے سارا کے سلسلے کو میں جان چکا تھا اور میں سمجھتا تھا جس طرح وہ اس کا خیال کرتا ہے شادی بھی اسی سے کرے گا۔"

"پہلے میں بھی یہ ہی سمجھتی تھی۔" ماہ نور نے کہا۔

"اس کا مطلب تم بھی کوئی خاص نہیں جانتی تھیں اس کو۔" ابراہیم قہقہہ لگا کر ہنس دیا' "اور اس احمق کو دیکھو جو باتیں اسے تم سے کہنی چاہیے تھیں' اس ان پڑھ' جاہل بڑھیا نور فاطمہ کو سناتا رہا رات بھر بیٹھ کر۔"

"پلیز... ابراہیم!" ماہ نور نے سخت لہجے میں کہا۔ "جن باتوں کو تم سمجھ نہیں سکتے ہو' ان پر اتنے سخت تبصرے مت کیا کرو۔"

"جتنا میں سمجھا ہوں۔ اتنا ہی تبصرہ کر رہا ہوں۔" ابراہیم متاثر ہوئے بغیر بولا۔ "کیسی ان رومانٹک بات ہے کہ تم کو اپنے بارے میں اس کے خیالات نور فاطمہ سے سننے کو ملے' وہ بھی پنجابی زبان میں ہاہاہا۔"

"شٹ اپ ابراہیم!" ماہ نور کو غصہ آنے لگا۔

"ویسے نور فاطمہ کک اچھی ہے' اگر تھوڑی سی ریفائنڈ ہو جائے تو میں اسے اپنے کیفے میں ملازم رکھ لوں۔"

"شٹ اپ ابراہیم۔"

"اچھا چلو... اعلا حضرت نور فاطمہ کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ مگر ایک بات بتاؤ' سعد بھلا انکل کو مار دینے کا ارادہ کیوں کر چکا تھا۔"

"کیونکہ وہ گمان اور بدگمانی کی سرحد پر پھنس کر رہ گیا تھا۔ جن گتھیوں کے صرف سرے وہ کھول سکا' انہوں نے اسے بے بس کر دیا۔ اور سعد تو سعد تھا' جو حالات میں سن اور دیکھ رہی ہوں' دل تو میرا بھی یہ ہی چاہتا ہے کہ قتل نہ

سہی ان کا سر تو ایک مرتبہ پھاڑ ہی دوں۔"

"ایک تو تم سارے لوگ باتیں بہت مشکل کرتے ہو۔" ابراہیم نے منہ بنا کر کہا۔ "اچھا ایسا ہے کہ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر اسلام آباد چلا جاؤں گا۔ تم جس مقصد کے لیے مجھے لائی تھیں' وہ پورا ہو گیا' اعلا حضرت بی بی نور فاطمہ سے ملاقات ہو گئی۔ اب تم اپنی ممی کا دل خوش کرو اور اپنی پڑھائی شروع کر دو۔"

"ہاں ایسا ہی کروں گی۔" اس نے دھیان گاڑی کی کھڑکی سے باہر کے مناظر پر منتقل کر دیا۔



"میں یہاں خاص طور سے ایک بدلی ہوئی نادیہ کو دیکھنے آیا تھا۔ لیکن تمہیں اس کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتے دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں جو سمجھ کر آیا تھا' نادیہ میں وہ تبدیلی نہیں آئی' ہاں شاید اس نے لندن کا کلچر ضرور اپنا لیا ہے' حالانکہ وہاں ہیلسنکی میں بھی وہ ان خرافات سے بچتی رہی تھی۔" سعد کے سامنے بیٹھا چندر شیکھر کہہ رہا تھا۔

"تم نادیہ کو کتنا جانتے ہو؟" سعد نے کوئی وضاحت دیے بغیر پوچھا۔

"ہیلسنکی میں ہم نے کئی سال اکٹھے پڑھتے گزارے' ہم دونوں ایک ہی سال میں آگے پیچھے وہاں پہنچے تھے۔ ہیلسنکی ہم دونوں کے لیے شروع میں ایک سا ہی ڈراؤنا خواب ثابت ہوا تھا۔ اجنبی ملک' اجنبی زبان' موسم کی شدت یوں جیسے ہم کسی آئس برگ میں پھنس چکے ہوں۔ پھر ہم نے ایک ساتھ ہی ہر مخالف صورت حال سے نمٹنا سیکھا۔ ایک سی جگہوں پر کام کر کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ اکٹھے بیٹھ کر اسائنمنٹس بناتے تھے اور سب سے بڑھ کر..." وہ ہنستے ہوئے رکا۔ "ہم ایک دوسرے سے اردو' ہندی میں بات کر لیتے تھے۔ نادیہ کی اردو تم جانتے ہی ہو گے' کیسی مضحکہ خیز ہے۔"

"ہوں..." سعد نے کہا۔ "اور اس سارے عرصے میں تم نے کیا محسوس کیا' نادیہ کی شخصیت کیسی تھی؟"

"بہت غیر معمولی۔" چندر شیکھر نے اعتراف کیا۔ "وہ دل کی سادہ' بے لوث' مخلص اور سچی لڑکی تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ پاکستان سے بہت کم تعلق ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ پاکستان کے حق میں مجھ سے لڑنے کیوں کھڑی ہو جاتی تھی' مگر وہ ایسا کرتی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔"

"تھی سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"میری مراد ہے کہ شاید اب وہ ویسی نہیں رہی۔" چندر شیکھر نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نادیہ کے فلیٹ کو کوئی لڑکا چاہے' وہ پاکستانی اور مسلمان ہی کیوں نہ ہو' شیئر کر رہا ہو گا' اس کے بارے میں شاید یہ آخری بات بھی نہ ہوتی' جس کی میں اس سے توقع کرتا۔"

سعد نے چندر شیکھر کی بات سن کر لمبا سانس لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ "تم نے مجھے دیکھ کر جو اندازہ لگایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نادیہ کو بالکل بھی نہیں جانتے یا پھر یہ کہ تمہارے دماغ میں کچھ بھی نہیں ہے سوائے گند کے۔"

"ہو سکتا ہے۔" چندر شیکھر نے شانے اچکائے۔ "تمہارے دونوں دعوے ہی غلط ہوں۔"

"نہیں میرے دونوں ہی دعوے ٹھیک ہیں۔"

"نادیہ سے میری ای میل پر برابر بات ہوتی رہی ہے۔ اس نے کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا۔ ہاں' وہ اپنے بارے میں ضرور بتاتی رہی کہ اس نے راستہ پا لیا ہے۔"

سعد غور سے چندر شیکھر کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ اس نے واقعی راستہ پالیا ہے۔" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "اب تم اس سے ملو گے تو شاید ایک مختلف نادیہ کو دیکھو۔"

"مطلب اس نے ایک ساتھی پالیا' مطلب اس نے تمہیں پالیا؟" چندر شیکھر کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"مجھے..." سعد ہنسا۔ "مجھے اس نے اب نہیں بہت پہلے ہی پالیا تھا۔" اس نے چندر شیکھر کے چہرے پر چھائے تذبذب کو بڑھا دیا۔ "اسی لیے تو میں نے دعوا کیا تھا کہ تم اسے یا تو جانتے نہیں یا تمہارے دماغ میں صرف گند بھرا ہوا ہے۔" چندر شیکھر نے بے یقینی سے دیکھا۔

"میں نادیہ کا بڑا بھائی ہوں چندر شیکھر! ضروری نہیں کہ کسی لڑکی کے ساتھ لندن میں فلیٹ شیئر کرنے والا اس کا بوائے فرینڈ ہی ہو۔" سعد نے کہا۔ "اب بولو تم نادیہ کو کتنا جانتے ہو۔"

"اوہ!" چندر شیکھر گڑبڑا گیا۔ "میں واقعی معذرت خواہ ہوں' نادیہ نے کبھی اپنے کسی بھائی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس نے کبھی کسی بھی فیملی ممبر کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"وہ اس میں بھی درست تھی۔" سعد نے کہا۔ "ہم نے اسے تنہا کر رکھا تھا۔ ہم ہمیشہ اس سے لاتعلق ہی رہے۔"

"اوہ... تو کیا اب تم نے دیکھا' وہ کیسی ہیرے جیسی لڑکی ہے۔" چندر شیکھر کی نظروں میں تجسس اور شوق اتر آیا۔

"ارے اتنی جلدی اپنی پہلی رائے پر پلٹ گئے تم۔" سعد ایک بار پھر ہنسا۔

"ہاں اور میں اپنی وقتی بدگمانی پر سخت شرمندہ ہوں۔ شکر میں یہ بات نادیہ سے نہیں کہہ بیٹھا۔ عمر بھر اس کے سامنے نظریں نہیں اٹھا پاتا۔"

چندر شیکھر واقعی معذرت خواہ نظر آرہا تھا۔ سعد اس کو جواب دینا چاہ رہا تھا' مگر اسی وقت نادیہ کی آمد ہوئی۔ وہ چندر شیکھر کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ اس شام دیر تک چندر شیکھر وہیں رکا رہا۔ وہ اور نادیہ چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر بیٹھے مسلسل باتیں کرتے رہے تھے۔ جبکہ خود سعد سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب بیٹھا باہر روشنی پھیلاتی مصنوعی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوران اس نے کئی بار کن اکھیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن نادیہ اور چندر شیکھر کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھے۔

"کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے گمان محض گمان نکلتے ہیں اور وہ کبھی لمحاتی اور پھر وہ اپنی بدگمانیوں پر بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت بھی کرلیتے ہیں۔ لیکن کیا ہر کسی کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے' نہیں۔" اس نے سر جھٹک کر دل میں اٹھتے سوال کا نفی میں جواب دیا تھا۔



"خان چاچا! میں اسلام آباد شہر میں پہنچ چکا ہوں۔ اسی شہر کے ایک امیر ترین علاقے کے بڑے سے گھر میں پریا رانی رہتی ہے۔ میں اس گھر کے گیٹ کے آگے تین دفعہ جا کر کھڑا رہا ہوں' مگر آگے جا کر کسی سے اس کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہیں کرپاتا' گھر کی دیواریں اور مین گیٹ اونچا اور بہت مضبوط ہے' جبکہ میرا قد پست ہے اور اوقات بہت ہی چھوٹی۔ ڈرتا ہوں پریا رانی سے متعلق جو ایک خواب آنکھوں میں بسا رہ گیا ہے۔ چھن سے ٹوٹ نہ جائے۔ سوچتا ہوں بنا دستک دیے لوٹ جاؤں۔ پریا رانی نہ سہی' میرا خواب تو میرے ساتھ ہی رہ جائے گا ناہمیشہ کے لیے۔" وہ سڑک کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھا فون پر بات کر رہا تھا۔

"جھلے ہوگئے ہو کیا۔ بے وقوف ہو پورے کے پورے' قریب جا کر یوں ہی لوٹ آؤ گے۔ آگے بڑھو جاؤ دستک

"اگر ایسے ہی لوٹ آئے تو عمر بھر پچھتاتے رہو گے۔"
اس نے جواب دیے بغیر فون بند کر کے قمیص کی جیب میں ڈال دیا اور سر اٹھا کر سڑک کے اس پار نظر آتے اس بلند و بالا دیواروں میں گھرے محل نما گھر کی طرف دیکھنے لگا' جس میں پریا رانی رہتی تھی۔



"آج میں بہت خوش ہوں' میں نے جو چاہا پالیا' دیکھنے والوں میں سے کسی نے پہلی بار اس کا اعتراف بھی کر لیا اور اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے جو پایا ہو وہ آپ میں سے جھلکنے بھی لگے۔"
اس نے لکھتے لکھتے سر اٹھایا اور مسکرا دی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ دوبارہ کی بورڈ پر جھکی۔
"یہ بھی عجیب سا ہی اتفاق ہے نا کہ کچھ عرصہ پہلے میں خود کو دنیا کی محروم ترین انسان سمجھتی تھی اور اب کچھ عرصہ ہی کے بعد مجھے سمجھ میں آنے لگا ہے کہ تہی دامنی کی کتنی اقسام ہوتی ہیں۔ میرے بھائی اور میرے باپ' میری ماں اور میرے سوتیلے بہن' بھائیوں کی مثالیں میرے سامنے ہیں۔ کسی کے پاس سب کچھ ہے' مگر پر بھی وہ تہی دامن ہیں۔ یوں جیسے بھرے دستر خوان پر بیٹھا خواہش کے باوجود کچھ کھا نہ پائے۔ کچھ سب پانے کی خواہش میں تھوڑا بھی گنوا بیٹھے اور اب اپنی تہی دامنی سمیت دوبارہ سے کچھ پانے کی جدوجہد کے لیے تیار ہوئے پھر رہے ہیں۔ ان سب میں ایک میں بھی تھی' جس کو سب نے جھٹکا اور جس سے سب نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ شاید میری یہ ہی محرومیاں میرے کام آئیں اور میرے رب نے میرا راستہ سیدھا کر کے میرا دامن ستاروں سے بھر دیا۔ اب میرے دامن میں روشنیاں ابھرتی ہیں۔ ایمان اور امید کے جگنو کھلتے ہیں اور میرے آگے کے راستے کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ اوہ میرے اللہ...... میں تیری کون کون سی نعمتوں کو جھٹلا سکتی ہوں؟"
اس نے لکھتے لکھتے سر جھکا۔
"اب چاہے میری مٹھی میں کوئی رشتہ' کوئی تعلق نہ بھی ہو تو بھی مجھ جیسا امیر کوئی نہ ہو گا۔ میرا دل بغض و عناد' رشک و حسد' شکوہ و شکایت سے پاک ہو چکا ہے اور ایسے دل کبھی مایوس نہیں ہوتے۔"
نادیہ نے ٹائپنگ ختم کی اور اپنے لکھے ہوئے کو دو لوگوں کے نام بھیج دیا۔



رابعہ کلثوم نے اپنے سامنے بت بنی بیٹھی سعدیہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خوف اور ملال تھا۔ بے یقینی اور گھبراہٹ تھی۔
"کیا اس کے پاس کوئی ایسی قیمتی متاع ہے' جو چھن جانے کو ہے' کیا یہ خالی ہاتھ رہ جانے کا خوف ہے یا قبولیت نہ بخشے جانے کا ڈر۔" رابعہ سوچ رہی تھیں۔
"ارے میری بچی کی عمر ابھی کیا ہے۔ جو اس طرح کے وسوسوں نے اسے چانک گھیرے میں لے لیا ہے۔ یہ بولتی کیوں نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر چپ کیوں لگ گئی ہے؟" ان کے دل میں خیال آرہا تھا۔ ایک انجانے خوف کے تحت وہ جھٹکے سے اٹھیں اور سعدیہ کو بری طرح جھنجوڑنے لگی تھیں۔

باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ

ارم طیفور



"ارے ایڈی... !کیسے ہو تم؟ کہاں غائب تھے سوئیٹی... ؟کتنے دن بعد کال کی تم نے مجھے... !"

"ہائے... !کیا بتاؤں ایک ایڈی اور سو ایڈی کی چاہنے والیاں... فرصت ہی کہاں ملتی ہے مجھے۔"

"اچھا جی !تو اس لسٹ میں 'میں کہاں ہوں... ؟"

"ٹاپ پر... مگر نیچے سے ہاہاہا!"

"بڑے خراب ہو تم ایڈی' جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔"

"تو نہ بولو۔"

"مرو تم۔"

"تمہارے بعد۔"

"دفع ہو جاؤ کمینے... !ہائے!"

"دفع ہو جاؤ کمینی... !تیرے پیچھے تیرے ابا آئے... !"

فون بند ہو چکا تھا اور اب وہ مزے سے بیڈ سے ٹیک لگائے سر کھجا رہا تھا۔ جبھی اماں نے زوردار آواز سے دروازہ کھولا۔

"اوہڈ حرام !الو کے پٹھے !ابھی تک بستر توڑ رہا ہے ... اٹھ جا بے حیا' اب تو ٹکڑوں کی بانگیں بھی باسی ہو گئیں۔ اٹھ جا بشارت !نہیں تو پکڑتی ہوں سوٹا... !"

"او اماں !بشارت نہیں ایڈی بولا کر ایڈی !سارے محلے کی زبان پر میں نے زبردستی ایڈی چڑھوا لیا... پر میرے اپنے گھر والوں کی زبان نہیں بدلی۔" وہ تاسف سے سر پر ہاتھ مارتا بولا۔

"اوئے ایڈی کے پتر !سر پر ایک اڈی والی جوتی ماروں گی ناں تو ساری عمر کے لیے تیری آنکھیں اڈی (کھلی) رہ جائیں گی... سمجھا !بے شرم نہ ہووے تے' کتنی چاہ سے تیرے دادے نے تیرا نام بشارت رکھا تھا اور تو نے پر پرزے نکالتے ہی بدل ڈالا۔" اماں آج فرصت سے گھیرنے بیٹھی تھیں — موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

"آہو !بڑا سوہنا نام ہے ناں بشارت !جو میں نے بدل دیا۔ اماں !جس محلے میں ہم رہتے ہیں ناں وہاں اصل نام بلانے پہ دفعہ لگتی ہے... سمجھیں !اور مجھے کون سا کوئی بشارت بلاتا تھا...

او بچے... او بچھیا !بس یہی نام پتا تھا مجھے تو..."

بشارت صاحب کے پرانے زخم تازہ ہوئے تو ٹون خود بخود اونچی ہو گئی وہ بھی اماں کے آگے۔

"ذرا حلق گھونٹ کے گل کر مجھ سے 'اور چل ناں سہی بشارت پر بدلا تو تو نے عدنان تھا ناں پھر ایڈی کدھر سے آگیا۔"

"تو اماں عدنان کو کون سا کسی نے سیدھا بلایا تھا کسی نے نمک دان' کسی نے آدھا نان تو کسی نے پیک دان بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے اب بس ایڈی !یہ ابھی تک کسی نے نہیں بگاڑا۔"

بشارت نے خوش ہو کر باچھیں پھیلائیں۔

"چل اب بکواس بند کر اور اٹھ جا کر دکان کھول اور شام سے پہلے گھر کا منہ نہ کرنا سمجھا!"

اور بشارت صاحب کمر کے کڑاکے نکالتے سیدھے ہوئے اور اٹھ کر باتھ روم کا رخ کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا اب کی بار اماں سچ میں "سوٹا" لے کر ہی اندر آئیں گی۔



بشارت عرف ایڈی ابھی بھی دکان سے لوٹا تھا اور برآمدے میں رکھی کین کی کرسی پر بیٹھا کسل مندی سے پیروں سے جرابیں اتار رہا تھا۔ جب کہ نظریں مسلسل صحن میں وائپر لگاتی گلابو پر تھیں۔

گلابو کل وقتی ملازمہ تھی اور گھر کے تمام چھوٹے بڑے کام شام تک بھگتایا کر جاتی تھی۔ اماں کی کڑی نگاہوں کی زد میں رہتی تھی کہ بقول اماں کے رج کے شوخی اور فتنی تھی۔ اب جو بشارت ایڈی نے ارد گرد نظر دوڑانے کے بعد اماں کو غیر حاضر پایا تو دل فوراً آمادہ شرارت ہوا۔

"گلابو۔۔۔!" گلابو کو لمبی تان کے ساتھ پکارا گیا۔

"جی!" گلابو متوجہ ہوئی۔

"ادھر آ۔۔۔!" قریب بلایا۔

"جی آئی۔۔۔!" گلابو لہک کر پہنچی۔



"چل جا۔۔۔!" سر جھٹک کر واپس بھیجا۔ گلابو واپس مڑ گئی۔

"گلابو۔۔۔!" پھر وہی تان۔

"ادھر آ۔۔۔!" اب کے گلابو کے انداز میں نخرہ تھا، مگر قریب آ کھڑی ہوئی۔

"چل جا۔۔۔!"

مگر گلابو کو واپس جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بشارت صاحب کے پیچھے کھڑی اماں کو دیکھ کر گھگھی بندھ گئی۔

"چلی جاناں۔۔۔!" بشارت نے گلابو سے کہا۔

"پھر بلاتا ہوں!"

"اپنی ماں کو آواز دے ذرا پتر! پھر دیکھ میرا بھی اسٹائل۔۔۔!"

بشارت کی سٹی گم ہو گئی۔ پیچھے مڑ کر ابھی بھی نہ دیکھا۔ بھول گیا تھا کہ برآمدے میں اسٹور تھا، جس کا دروازہ خلاف معمول کھلا تھا تو یقینا" اندر اماں ہی ہوں گی۔

"بے شرما! بے ہدایتا!" اماں نے بیچ میں جوتی اتار لی تھی اور اس سے پہلے کہ جوتی بشارت کی کمر کی مزاج پرسی کرتی، وہ فٹ کرسی سے اٹھ گیا اور ایک جست لگا کر صحن کے کونے میں بنے غسل خانے میں جا گھسا۔ دروازہ بند کرتے ہی اماں کے جوتے تڑتڑ کر کے دروازے کو لگ کر نیچے گرے تھے۔

"نکل باہر بے حیا! نکل! آج تو تیری ساری شوخیاں ناک کی راہ باہر نکالتی ہوں۔" اماں صحن میں چکراتی ہانپ رہی تھیں۔

"آلے تیرا پیو! تیرا تو ایسا پکا بندوبست کراؤں گی کہ ساری عمر ماں کو یاد کرے گا۔ اور تو ابھی تک یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے۔۔۔!" اماں کی نظر یکایک گلابو پر پڑی تو اسے بھی لپیٹ میں لیا۔

"چل دفع ہو جا ادھر سے! تیری ماں کو کہہ کر تجھے بھی نکیل ڈلواتی ہوں۔ ساری اڈاریاں سمجھتی ہوں میں تیری چل غائب ہو۔۔۔"

اور گلابو نے گم ہونے میں سیکنڈز بھی نہیں لیے تھے۔ اسے کینہ توز نظروں سے اندر جاتے دیکھنے کے بعد اماں دوبارہ "باتھ روم بند" پتر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"بشارت نکل آ باہر اب۔۔۔ مجھے زیادہ تاؤ نہ چڑھا۔"

"تو اماں میری بات مان لو ناں۔۔۔! میں ایسی حرکتیں چھوڑ دوں گا پھر۔" بشارت صاحب نے اندر سے ہی مذاکرات کا آغاز کیا۔

"ہاں۔۔۔! اتی شاباش!" اماں نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر گویا اپنے اندازے کی داد دی۔

"تو تیرے یہ سارے پھن اس چمگادڑ سے ویاہ کرنے کی خاطر ہیں۔ تو میرا پتر۔۔۔! تو اندر ہی ڈکارہ۔ اب جو باہر آیا ناں تو میرا سوٹا تیری کھوپڑی پر پڑے گا۔۔۔"

اماں سکون سے چارپائی ڈال کر لیٹ گئیں اور بشارت اس گھڑی کو پچھتا رہا تھا جب غسل خانے میں گھس کر اس نے اماں کو تڑی دی تھی۔ یہ تڑی صحن میں ہی کھڑے ہو کر دی ہوتی تو ناگہانی صورت حال میں بھاگ کر بچ تو سکتا تھا۔



بشارت عرف ایڈی اپنے ماں باپ کا اکلوتا سپوت، روپیٹ کر بی کام پاس گہرے سانولے رنگ کا مگر قدرے پرکشش اور خوابوں خیالوں کی دنیا آباد کیے رکھنے والا ایک حساس نوجوان تھا۔ بی۔ کام کر کے بڑا سینہ پھلایا تھا کہ نوکریاں بارش کی بوندوں کی مانند ٹپاٹپ برسیں گی۔ پر نوکریاں برسنی تو دور کی بات کڑک اور گرج کر بھی پاس سے نہ گزریں۔

اماں نے پتر کے بی کام کرنے پہ کچھ عرصہ تو سارا خاندان سر پر اٹھائے رکھا۔۔۔ جس گھر گھستیں اس گھر کے لونڈے منہ چھپائے نو دو گیارہ ہو جاتے کہ اماں جان بوجھ کر ہر ایک کو چڑاتی پھرتیں۔۔۔

"ہاں وے شہزاد! دسویں ٹپ گیا ہے یا ابھی تک جپھا مار کر بیٹھا ہے اسے۔"

"اور تو اسد! دکان چل پڑی تیری۔۔۔ یہی چار جماعتیں پڑھ لیتا میرے پتر کی طرح تو آج افسر لگتا۔۔۔

حق ہاہ! نصیب کی بات ہے!" یوں کبھی کسی بھانجے کی کم بختی آتی تو کبھی بھتیجوں کی گردن شکنجے میں آپھنستی۔

اور خود اماں اپنی پھبتیوں کے لپیٹے میں تب آئیں جب سال گزرنے پر بھی بشارت میاں کو نوکری نہیں ملی اور بی کام کی ڈگری نری فریم میں سجانے جوگی رہ گئی تو اماں نے ملنا ملانا موقوف کر دیا کہ اب ہر کوئی انہیں بڑھ بڑھ کر پوچھتا تھا کہ۔

"بشارت کی نوکری کا کیا بنا خالہ! کتنی تنخواہ ہے ....!"

یہ شہزاد کا ٹھوکا تھا۔

"اور سناؤ پھر پھوپھی! سنا ہے بشارت اپنی ڈگری کی کپی بنا کر بھنے چنے ڈال کر کھاتا ہے.... ہاہاہا۔ ویسے میری مان پھوپھی تو اسے دکان ڈال دے۔ کسی کام سے تو لگے گاناں....!"

اماں کا تو دل سڑ کر سواہ ہو گیا اور بشارت کی فراغت آنکھوں میں چبھنے لگی تو جھٹ ابا کو فون کھڑکایا کہ پتر کو دکان ڈال کر دو۔

ابا نے چند برس ہوئے دوست کے ساتھ مل کر نیا کاروبار جمایا تھا، آنا جانا لگا رہتا تھا.... ہفتہ ادھر تو ہفتہ ادھر۔ وہاں ہوتے تو دوست کے گھر ہی رہائش رکھتے کہ دونوں پرانے محلے دار بھی رہ چکے تھے "لہٰذا" گھر والے بھی ابا سے مانوس تھے۔

پیغام ملتے ہی ابا گھر پہنچے اور مین مارکیٹ میں اپنی کرائے پر چڑھی دکان خالی کروائی اور بیٹے کو سامان ڈال دیا۔

بشارت عرف ایڈی نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر جب جواب میں اماں نے دو سوٹے مارے تو ساری ڈلر ناک کے رستے بہہ گئی۔ اب یہ بشارت کی بد قسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ دکان چل پڑی۔ دکان جتنی بھی دیر سے کھلتی.... گاہک جیسے اسی ایک دکان سے سودا خریدنا فرض جانتے۔

اماں نے خاندان والوں سے ملنا جلنا پھر سے بحال کیا اور اب اماں نے بشارت صاحب کے سہرے کے پھول کھلانے کا سوچا....

کچھ بھی تھا لوگ اماں کو اپنی بیٹی دینے میں چنداں نہ گھبراتے کہ اماں کے گھرانے کی ریپوٹیشن اچھی تھی۔ نہ اماں زبان کی تیز تھیں اور نہ دل کی بری۔

بشارت تعلیم یافتہ بھی تھا اور اب کماؤ بھی.... اس کے علاوہ ابا کی کمائی بھی گھر میں وافر آتی تھی۔ سو.... یہ قصہ نمٹتے دیر نہ لگتی جو اماں کا پتر نیا شوشا نہ چھوڑ دیتا۔

ابا کے دور پرے کے رشتے کے بھائی تھے۔ اماں ابا کے دیرینہ تعلقات تھے ان سے "مگر تب تک جب تک ان کے معاشی حالات بے حد اچھے رہے" پھر یکدم بے چاروں کے حالات نے پلٹا کھایا کہ گھر میں فاقے اتر آئے....

ملنے والے کوسوں دور بھاگنے لگے۔ اماں ابا نے اپنے تعلقات ختم تو نہ کیے مگر محدود ضرور ہو گئے.... انہی بیگ صاحب کی بڑی بیٹی تھی زوبیہ جس پہ بشارت یعنی "ایڈی" صاحب کی نظر کرم تھی۔

اکثر ہی بیگ صاحب کے گھر پائے جاتے تھے.... انہیں تسلی دلاسے دینا' دنیا کی بے مروتی کے قصے سنانا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے دل پشوری کرنا بشارت کے فرائض میں شامل تھا۔

بیگ صاحب کے حالات گو کہ پہلے جیسے تو نہیں ہو پائے تھے مگر جب سے ان کے بڑے بیٹے نے میڈیکل اسٹور کھولا تھا ان کے حالات میں کسی حد تک تبدیلی آئی تھی۔

اور یہ بشارت کی حساس طبیعت ہی تھی جس نے اسے رانا صاحب سے تعلقات قائم رکھنے پر مجبور رکھا وگرنہ وہ کوئی زوبیہ کا دیوانہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دھانسو قسم کا عشق دونوں کے بیچ چلا تھا۔

ہاں.... ایک ہمدردی کا احساس کا جذبہ تھا جو اسے زوبیہ سے شادی پہ مجبور کرتا تھا اور یہی بات جب اس نے اماں سے کہی تو اماں نے حسب معمول "سوٹا" پکڑا تھا جو بشارت کو کم اور اس کی بھاگا دوڑی کے باعث گھر کے دیگر سامان کو زیادہ لگا اور تاریخی نقصان کا موجب بنا۔

کرسی کی ہتھی ٹوٹی' بیسن کے نل پر پڑا تو پانی کا فوارہ

پھوٹ پڑا۔

صحن سے ایڈی میاں نے رخ کیا اندر لاؤنج کا تو اماں کو شدید غصے نے لپیٹ میں لے لیا کہ وہ اس طرح بھاگ بھاگ کر ہلکان ہونے سے سخت چڑتی تھیں اور اسی چڑچڑاہٹ میں انہوں نے سوٹا تاک کر کھینچ مارا پتر کو اور پتر جو ٹی وی کے آگے کسی گول کیپر کے انداز میں کھڑا تھا ایک لانگ جمپ مارتا سائیڈ پر ہوا۔

ٹھاہ کی زوردار آواز تھی اور ہر طرف مقتول ٹی وی اسکرین کے ٹکڑے.....!

اماں تو صدمے کے باعث کھڑی کی کھڑی رہ گئیں جبکہ بشارت ایڈی ایک آخری نظر اجڑی اسکرین والے خالی ڈبے پر ڈالتے نو دو گیارہ ہو گئے۔

بس! اس دن سے اماں میں اور بشارت ایڈی میں ٹھن گئی۔

اماں کا موقف ایڈی کی سمجھ سے باہر تھا۔ بقول اماں کے وہ بہو کے طور پر یا تو اپنی بھانجی بھتیجی لائیں گی یا پھر ابا کی بکہ اگر عیش ہی کرانا ہے تو کسی اپنی بچی کو کرائیں۔

لازم ہے کہ پرائی بچی آکر ہر شے کی حقدار بن جائے، حالانکہ زوبیہ کے گھر والوں سے بھی رشتے داری تو تھی مگر دور کی، جب کہ ایڈی کو لگتا کہ اماں کا اصل مسئلہ زوبیہ لوگوں کے مالی حالات کا مخدوش ہونا تھا.....!

ہر ماں کی طرح اماں کو بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے خوب ارمان تھے۔

بشارت ایڈی کے لیے تو اماں کے کانوں میں ان کی بھابھیاں، بہنیں کئی دفعہ اشارے کنایوں میں بات ڈال چکی تھیں اور اماں کا میکہ کافی خوشحال تھا مگر پینڈو پن بھی جھلکتا تھا۔

جب کہ زوبیہ کے گھر والوں کے طور طریقے اور رکھ رکھاؤ کا زمانہ گواہ تھا۔ وضع داری ان کا خاصا تھی اور یہی چیز بشارت ایڈی کے لیے کشش کا باعث تھی۔

ابا تو خیر مانے منائے تھے مگر اماں پتے پہ ہاتھ نہیں دھرنے دیتی تھیں اور اسی بات پر آج کل ماں بیٹے میں ٹھنی رہتی تھی۔



"کی دم دا بھروسہ یار، دم آوے نہ آوے
چھڈ جھگڑے تے کریے پیار، دم آوے نہ آوے"

آج اتوار تھا اور ایڈی میاں سکون سے صحن میں چارپائی ڈالے آتی سردیوں کی دھوپ کے مزے لیتے ہوئے تانیں اڑا رہے تھے۔ قریب ہی اماں تخت پر سبزی اور دو تین ٹوکریاں لیے بیٹھی تھیں اور نظریں مسلسل صحن میں بے کار کے جھمیلوں میں الجھی گلابو پہ تھیں۔

"کی دم دا بھروسہ یار.....!" ایڈی نے پھر تان لگائی تھی کہ اماں یکدم زوردار انداز میں بولیں۔

"اے گلابو! جا اندر کچن میں دفع ہو، میں چاولوں کو دم لگا کر آئی تھی..... جا ذرا دیکھ کہیں بھرتہ ہی نہ بن جائے....."

اماں کو نور جہاں کے دم سے اپنے چاولوں کا دم بروقت یاد آیا تھا اور اسی بہانے گلابو کو منظر سے غائب بھی کیا۔

ایڈی نے اپنا سُر خراب ہونے پہ ایک نظر کوفت سے اماں کو دیکھا اور دوبارہ آنکھیں میچ لیں.....

ابھی راگ الاپنے ہی لگا تھا کہ اماں نے قریب رکھی خالی ٹوکری دے ماری جو سیدھی منہ پہ فٹ ہوئی اور ایڈی بے چارہ بلبلا کر رہ گیا۔

"کیا ہے اماں.....! چھٹی والے دن بھی میرا کوئی پاسا سینکنے سے نہیں رہتیں۔" ایڈی اپنا ماتھا سہلا رہا تھا۔

"اب کیا انہونی کی تھی میں نے.....؟"

"بتاؤں تجھے بے حیا.....! جوان جہان کڑی تیرے آسے پاسے منڈلا رہی ہے اور تیرا دم نکلا جا رہا ہے۔ نکیل ڈال اپنے لچھنوں کو، ورنہ میرا تجھے پتا ہی ہے....."

اماں نے بات مکمل کر کے چھری لہراتے ہوئے وارن کیا تھا۔

"تو اماں میں نے کب منع کیا ہے۔ ڈال دو مجھے

نکیل ۔۔۔ میں تو کہتا ہوں ختم کرو یہ رولا بھی اب ۔۔۔ نہیں تو مار مار کر ہی میرا بھرکس نکال دو گی۔" وہ ابھی تک ٹوکری کی چوٹ سہلا رہا تھا۔

"تو وہ تو میں تیری بیوی کے سامنے بھی تیری چھترول کیا کروں گی۔ مجھے کسی کا ڈر پڑا ہے کیا؟"

"ہاں ۔۔۔! بس میری "چھتر پریڈ" ختم نہیں ہونی کبھی ۔۔۔ اکتنا ارمان ہے اماں تجھے میری دھنائی کرنے کا ماؤں کے کالے پیلے لڑکے بھی انہیں گلفام لگتے ہیں اور ایک تم ہو کہ خوب صورت، جوان اور گبھرو بیٹے میں کیڑے نکالتی رہتی ہو۔" ایڈی نے مصنوعی تاسف سے سر کو جھٹکا۔

اماں نے کن اکھیوں سے بیٹے کو دیکھا ۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گہری رنگت کے باوجود بشارت ایک دلکش نوجوان تھا۔ قد کاٹھ کا بھی شاندار تھا۔ اماں نے دل ہی دل میں نظر اتار کر منہ پھیر لیا تھا کیونکہ وہ اماں ہی کیا جو بشارت کو ہر گھڑی آڑے ہاتھوں نہ لیں۔ تب ہی بولیں۔

"واہ ۔۔۔! میرا پتر' تیرے دماغ کا یہی کیڑا نکالنے کے لیے تو تجھ میں کیڑے نکالتی ہوں۔ تو سمجھتا ہے تیرے ورگا پورے محلے میں کوئی نہیں' تو پتر اس میں شک کوئی نہیں۔" اماں نے چھری ٹوکری میں رکھی اور اطمینان سے گویا ہوئیں۔

"جتنا پکا تیرا رنگ ہے ناں' آج تک ہمارے ٹبر میں کسی کا نہیں ہوا۔ چار کڑیاں تیرے موبیل (موبائل) پہ ٹلیاں کیا مار لیتی ہیں تجھے لگتا ہے تو نے پالا مار لیا ۔۔۔"

"اونہہ!" نخوت سے سر جھٹکا اور پتر کے بے نیازی سے ٹانگیں جھلانے پر مزید تاؤ کھاتے ہوئے بولیں۔

"یہ جو چار دن ہوئے تجھے لشکارے مارتے تو یہ میرا کمال ہے' میں نے تیرا رنگ پھیرنے کے لیے وہ وہ جتن کیے ہیں کہ کچھ نہ پوچھ ۔۔۔

حق ہاہ! تجھے کیا بتاؤں بشارت پتر!" اماں نے خلاؤں میں تکتے ماضی کریدنے کا آغاز کیا تھا اور بشارت نے بیزاری سے سر کھجانے کا۔

"تجھے پتا ہے تو جب پیدا ہوا تو تیری دادی نے تو وہ رولا ڈالا کہ ڈر کے مارے دائی بغیر پیسے لیے بھاگ گئی۔ پھر جب تک تیرے دادا جی ہٹی سے گھر نہیں آ گئے ۔۔۔ تیری دادی نے مجھ بستر پہ پڑی ہوئی کی جان کھا ماری ۔۔۔ کہ۔

"تو کتنے من کولے (کوئلے) کھا بیٹھی تھی کم بخت! ہمارے تو اگلے پچھلوں میں اتنا "تاریک باب" نہیں گزرا' یہ کس پر پڑ گیا۔ لے بھی طاہرہ! میری بات لکھ لے ۔۔۔ تو اگلا بال (بچہ) بھول جا کیونکہ تیرے اس شہزادے کے رنگ روپ نے تیرے پورے ششٹم (سسٹم) کو ساڑ دیا ہے ہاہاہا ۔۔۔!

وہ ٹھٹھا لگایا تیری دادی نے کہ مجھے بھی تاؤ دلا دیا پھر وہ بک بک جھک جھک ہوئی کہ اللہ دے اور بندہ لے ۔۔۔!

ہاں! اپنے دادے کا تو بڑا لاڈلا تھا۔ اکو اک تیرا پیو اور اکو اک پوترا۔ وہ تو تجھے چانن بلاتے تھے پیار سے اور تیری دادی ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنستی تھی۔ بس سب میرا کلیجہ ساڑنے کے بہانے تھے۔ ورنہ جب میں سامنے نہ ہوتی تو تجھے چومتے چاٹتے نہ تھکتی تھی۔

اسی لیے کہتی ہوں کہ شکر کیا کر جو خاندان میں تیرے لیے رشتوں کی لائن لگی ہے ورنہ اتنا پکا رنگ تو آج کل لڑکیوں کو بھی نہیں بھاتا ۔۔۔

سن رہا ہے میری بات ۔۔۔؟

او بشارت! اوئے ایڈی پتر ۔۔۔!" مگر ایڈی صاحب تو ہزاروں دفعہ کی سنی داستان امیر حمزہ کو سنتے ہوئے کب کے نیند میں ڈوب چکے تھے کہ آج کل اماں ہر وقت ایڈی کو یہی ثابت کرنے پہ تلی رہتی تھیں کہ اتنی عام شکل و صورت پہ بھی اگر خاندان سے رشتہ مل رہا ہے تو باہر کی کیوں لائیں۔

کوئی اپنی تو ایڈی کو ہر حال میں قبولے گی جبکہ غیر شادی کے بعد بلاوجہ کے نخرے دکھائے گی لیکن اماں کی یہ تمام کوششیں بے سود تھیں۔

کیوں کہ درحقیقت نہ تو ایڈی کم شکل تھا اور نہ ہی زوبیہ اتنی سطحی سوچ کی حامل عام سی لڑکی' اور ایڈی کسی بھی صورت زوبیہ کے علاوہ کہیں اور شادی پر

راضی نہیں تھا۔

اور نہ ہی اتنا بے وقوف کہ اماں کی باتوں میں آکر احساس کمتری کا شکار ہو جائے۔ اس نے آنکھوں کی جھری سے اماں کو اٹھ کر ٹوکریاں تھامے اندر بڑھتے دیکھا اور مسکراتے ہوئے اپنے اگلے ٹارگٹ کے بارے میں سوچنے لگا جو اماں کو ہر حال میں منا سکتے تھے اور وہ تھے "ابا۔"

☼ ☼ ☼

اماں نے آج دوپہر میں گلابو کو چھٹی دینے کے بعد اسے دکان سے فون کرکے گھر بلایا تھا اور خود رشتے داروں میں کسی کے ہاں میلاد پر چلی گئی تھیں۔ اور اب ایڈی گھر میں بالکل اکیلا اگلے لائحہ عمل کے متعلق غور و فکر کر رہا تھا۔ آج صبح دکان پہنچتے ہی اس نے پہلا کام ابا کو فون کرنے کا کیا تھا۔ اور ابا نے اس کی ساری بات سن کر ہری جھنڈی دکھادی تھی، حالانکہ پہلے ابا اس رشتے کے لیے نیم رضامند سے تھے۔

اور اب صاف کہہ رہے تھے کہ تمہاری ماں کے آگے میری کبھی چلی ہے، جو اب چلے گی، لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم بھی چپ کرکے سہرا باندھے اسی دروازے پہ پہنچو جہاں کی گھنٹی تمہاری ماں بجائے۔

اور اب وہ سر پکڑے بیٹھا تھا، طبیعت میں عجیب کسلمندی سی چھائی تھی۔ دکان پہ بھی جی نہیں لگا تو اماں کے ایک فون پہ گھر چلا آیا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ اسے اب زوبیہ سے ہی شادی کرنی تھی، کیونکہ بات انسیت سے بڑھ کر الفت تک جا پہنچی تھی اور گھی کو نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنے کی بجائے وہ کنستر میں سوراخ کرنے پہ تیار تھا۔

اور اس کے لیے اسے ابا ہی کی کوئی کمزوری پکڑنا تھی کیونکہ بظاہر ابا ہمیشہ اماں سے دب جاتے تھے مگر جب فارم میں آتے تو اماں کا سارا طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔ اب بس اسے موقعے کی تلاش تھی اور قدرت نے یہ موقع اسے ہتھیلی پر رکھ کر فراہم کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اماں! کیا کر رہی ہیں۔۔۔؟" بشارت نے ایک دم سے اماں کو پکارا تھا۔ اور اماں جو اپنی الماری میں منہ گھسائے خفیہ خانے میں مصروف عمل تھیں، بوکھلا کر پلٹیں تو ہاتھ سے چابیوں کا گچھا فرش پہ آ رہا۔

"کم بخت! ڈرا ہی دیا تو نے۔ ہزار بار کہا ہے کہ جب میں سیف میں کچھ کر رہی ہوں تو میری چوکیداری کرنے کمرے میں مت چلا آیا کر، کیا ہے۔۔۔ بول اب کیوں بلا رہا تھا؟" اماں نے چابیاں اٹھا کر سیف کے اندرونی خانے کو لگائیں اور لاک کیے بغیر مڑ کر پلنگ پر آ بیٹھیں۔

"وہ اماں میں پوچھنے آیا تھا کہ" ایڈی بھی قریب ہی پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ "اس دفعہ جانور کیا لینا ہے۔ چاچا بختو کہہ رہا تھا کہ اس کے کچے احاطے میں خرید کے چھوڑ دو، پندرہ دن میں خوب پل جائیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ دو بکرے لے آؤں۔ کیا کہتی ہیں۔۔۔؟"

وہ سوالیہ نظروں سے ماں کو تکتے ہوئے بولا تو اماں کے چہرے پہ ایک فخریہ مسکراہٹ ابھری، بولیں۔

"دو بکرے بھی لوں گی اور ایک گائے بھی۔۔۔"

"کیا۔۔۔!" ایڈی اچنبھے سے سیدھا ہو بیٹھا۔

"کیا بات کر رہی ہیں اماں۔۔۔ گائے کی قیمتوں کا اندازہ ہے آپ کو۔۔۔ شکر کریں جو ابا بکرے لے کر دے رہے ہیں۔"

"بکرے تو تو لے رہا ہے۔۔۔ تیرے ابا گائے لیں گے۔" اماں ہنوز اطمینان سے بولیں۔

"کیا۔۔۔؟" ایڈی دو فٹ اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔

"میں کہاں سے اتنا مہنگا جانور لوں گا اماں، میری ابھی پسلی نہیں ہے اتنی۔ یہ تو ابا کے ساتھ مل ملا کر بندوبست ہو جانا تھا، آپ نے گائے کی بیخ لگا دی ہے۔"

"مجھے کاکا مت سمجھ، سب پتا ہے مجھے تیرا بھی اور تیری پسلی کا بھی۔ شرافت سے بکرے لے کر آ ورنہ پتا ہے تجھے میرا۔" اماں کے تیور خطرناک تھے۔ ایڈی نے

بھنویں سکیڑ کر اماں کو دیکھا اور بولا۔

"اب مجھے سمجھ آیا کہ ابا کل فون پہ اتنے گرم کیوں ہو رہے تھے۔ ابا آپ سے ناراض ہو کر کہہ رہے تھے کہ تمہاری ماں کو ہر ماہ اتنے پیسے خرچ کے دیتا ہوں مگر مجال ہے جو اس عورت نے آج تک ٹکے کی بھی بچت کی ہو۔

اب مجھے مزید خرچا بڑھانے کو بھی کہہ رہی ہے اور اوپر سے گائے کا وختا بھی میرے سر ڈال رہی ہے۔"

ایڈی نے غصے سے اماں کے سرخ ہوتے چہرے کو نظر انداز کیا اور مزید جلتی پہ تیل ڈالا۔

"میں نے تو بہتیرا ابا کو بولا کہ ابا' اماں بے چاری کے کہاں اتنے خرچے ہیں بس بے چاری۔ آپ کی شان بڑھانے کے لیے خاندان میں ہی دینے دلانے میں لگی رہتی ہیں....

بھلا بچت بے چاری کہاں سے کریں۔ اگر کرتیں تو آپ سے اور مجھ سے چھپانے کی انہیں بھلا کیا ضرورت تھی....!" ایڈی نے جملہ پورا کیا تھا اور اماں نے چور نظروں سے سیف کو دیکھا تھا۔

ایڈی نے بھی ان کی نظروں کا پیچھا کیا اور ہونٹ دبا کر مسکرا دیا۔

اماں کے خزانے سے وہ تو واقف تھا مگر ابا نہیں اور اب وہ جانتا تھا کہ اماں کا بس نہیں چل رہا کہ وہ اسے کیسے جادو کی چھڑی گھما کر کمرے سے غائب کریں اور سیف لاک کریں۔ پر ایڈی ابھی انہیں ایسا موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا تبھی اماں کا دھیان بٹانے کو بولا۔

"ویسے اماں آپ کو پتا ہے' خالہ سکینہ نے بھی بیل لیا ہے۔ یہ چوڑا' لمبا چھ فٹا۔ دیکھ کے منہ میں پانی آتا ہے۔"

اماں کا دھیان سچ میں بٹ گیا اور پوری کی پوری ایڈی کی طرف گھوم کر تجسس سے معلومات لینے لگیں۔

ایڈی نے چھ کی بارہ لگا کر ایسا حدود اربع کھینچا خالہ سکینہ کے بیل کا کہ اماں سب بھول بھال فٹافٹ پیروں میں الٹی چپل اڑسے بیل دیکھنے چل دیں۔

"اماں.... اماں! میں بھی اسد کی طرف جا رہا ہوں۔ جلدی واپس آنا۔"

"تو گیٹ بھیڑ کر چلے جانا' میں بس پندرہ بیس منٹ میں آئی۔" اماں چادر لپیٹتی نکل گئیں اور ایڈی نے سر کھجاتے ہوئے ایک نظر سیف کو دیکھا پھر موبائل نکال کر چھت پر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی دو دن قبل بیگ صاحب کی طرف اتفاقاً" اسے زوبیہ کی چند تصویریں کھینچنے کا موقع مل گیا تھا۔ گھر میں مہمان تھے سو کسی کو پتا نہیں چل سکا اور اب وہ اطمینان سے انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

ایڈی نے ابھی چھت کی سیڑھیاں مکمل نہیں چڑھی تھیں کہ گیٹ پہ کھٹکا ہوا' اس نے پلٹ کر دیکھا تو ابا تھے! انہوں نے اندر داخل ہو کر گیٹ بند کیا۔ ہاتھ میں پکڑا بیگ تخت پر رکھا اور اماں کو پکارا۔

ایڈی نا معلوم کیا سوچ کر نیچے نہیں اترا۔ ایک دو آوازیں دینے کے بعد جب اماں نہیں آئیں تو ابا چونک کے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بشارت کو آواز دینے ہی والے تھے کہ کچھ سوچتے ہوئے دھیمی چال چلتے اماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

سیڑھیوں میں دبکا ایڈی (جس کے سامنے صحن کا اور کمرے کا پورا منظر تھا) وہیں خاموشی سے دو سیڑھی نیچے اتر کر سانس روکے بیٹھ گیا۔ اب اماں کے کمرے کا اندرونی منظر تمام جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے تھا اور ہاتھ میں موبائل بھی....!

محض چند منٹوں میں ابا جیسے آئے تھے ویسے ہی چپ چپاتے کمرے سے باہر نکل کر تخت پہ دھرا بیگ تھاما اور سکون سے گیٹ پار کرتے باہر نکل گئے۔

چند لمحوں بعد ایڈی بھی اتنے ہی سکون سے گیٹ پار کر گیا' ہاں گیٹ کو ذرا سا کھلا چھوڑنا نہیں بھولا تھا۔

☼ ☼ ☼

کیسا سہانا دن تھا۔ لگتا تھا تارے زمین پر اتر آئے ہیں' حالانکہ دن کا سماں تھا اور سورج بھی آب و تاب سے آسمان پر نمودار تھا۔

مگر چونکہ خوشی بے تحاشا تھی سو اس نے بشارت ایڈی کے دماغ پر اثر کیا تھا۔ شوخیاں انگ انگ سے پھڑک پھڑک کر باہر آرہی تھیں۔

بقول اماں رج کے شوخا ہو رہا تھا۔ آج عید کا دن تھا جانور صحن میں سہمے کھڑے تھے اور ابا قصائی کے ہمراہ چھریاں ٹوکے سیٹ کرنے میں مگن۔ خوش تو اماں بھی بہت تھیں کہ ایک موٹی تازی گائے آج ان کے صحن میں قربان ہو کر ان کا دل خوش کرنے والی تھی۔

پورے محلے نے ان کی گائے کی تعریف کی تھی اور سہرا ابا کے سر جاتا تھا' جو اتنی قیمتی اور ہٹی کٹی گائے محض اماں کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لے کر آئے تھے اور انہیں نہال کر دیا تھا۔

لیکن ایڈی کے نہال ہونے کی وجہ نہ تو گائے تھی اور نہ ہی شام کو روسٹ ہونے والا سالم بکرا۔ وہ تو خوش تھا کہ شام میں چھوٹے پیمانے پر اس کی منگنی کی رسم ادا کی جارہی تھی۔

زوبیہ کے گھر والے اور چند رشتے دار ان کے ہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ ابا کی کرم فرمائی سے شادی کی تاریخ بھی اگلے تین ماہ بعد کی ٹھہرائی جاتی تھی۔

بشارت ایڈی ابا کا جتنا مشکور ہوتا اتنا کم تھا۔ گاہے بگاہے ابا کو ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے ان کے قدموں میں نثار ہونے کو تیار ہو' اور ابا جوابا" ایسی نظروں سے دیکھتے جن میں بے بسی' غصہ اور "تیری ایسی کی تیسی" کی دھمکی واضح نظر آتی۔

مگر آج تو ایڈی کو اپنی خوشی کی کھنک کے آگے ابا کے جوتے کی دھمک بھی نہ سنائی دیتی۔ بہت بڑا معرکہ تھا جو ابا نے اماں کو منا کے سر کیا تھا۔

ڈنکے کی چوٹ پہ زوبیہ سے رشتہ طے کیا تھا ابا نے اور اماں کو گائے کی رسی ہاتھ میں دے کر بہلا لیا تھا باقی تھوڑا سا دبنگ انداز اپنا کر اماں کے غصے کے غبارے سے ہوا نکالی تھی۔

اور اماں کون سا دل کی بری تھیں' شوہر اور بیٹے کو ہم خیال جان کر کہاں تک مغز ماری کرتیں' نہ ہی انہیں زوبیہ سے کوئی ذاتی پرخاش تھی للذا ماننے کے بعد اب سب سے زیادہ خوش وہی تھیں۔



آج فرصت ہی فرصت تھی۔ اماں اور ابا رشتے داروں میں منگنی کی مٹھائی بانٹنے نکلے تھے۔ کچھ کی طرف گوشت دینا تھا' سو واپسی میں ابھی کافی وقت تھا۔ ایڈی نے صحن میں کینوؤں کے چھلکوں کا کھیت اگا رکھا تھا۔ فراغت تھی سو سسرال سے آیا پھل رگ رگ میں نشہ بن کر دوڑ رہا تھا۔

آج صبح جب اماں کچن میں ناشتہ بنا رہی تھیں تو ایڈی نے جھٹ سے ابا کو جالیا اور پھر تب تک نہیں چھوڑا جب تک دونوں میں صلح نہیں ہو گئی۔

پہلے تو ابا نے خوب نخرے کیے پھر ماننے کی شرط یہ رکھی کہ ابھی ان کے سامنے وہ ویڈیو ڈیلیٹ کرے جو ایڈی کے موبائل میں ابا کو مجرم ثابت کرنے کے لیے موجود تھی۔

ایک ایسا جرم جس کی خبر اگر اماں کو ہو جاتی تو.... تو پتا نہیں ابا کا احتساب اگلے کتنے سالوں تک جاری رہتا۔ جرمانہ تو خیر ساری عمر بھرنا پڑتا۔

اب سے ٹھیک دو ہفتے پہلے جب ایڈی نے اماں کو خالہ سکینہ کا بیل دیکھنے دوڑایا تھا تو ابا بیگ سمیت گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ایڈی کے پاس اس وقت ہاتھ میں موبائل تو موجود ہی تھا اور کچھ شیطانی جرثومے یعنی دماغ نے کام کیا اور ابا کے دبے پاؤں اماں کے کمرے میں جانے کے انداز سے وہ ٹھٹک گیا۔

صحن اور اماں کا کمرہ چونکہ سیڑھیوں کے بالکل سامنے تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے منظر بخوبی دکھتا تھا سو اس نے فورا" سے پہلے ویڈیو کا بٹن پریس کر دیا۔

سامنے ابا تھے اور وہیں اماں کا کھلا سیف! اندر اماں کا خفیہ خزانہ! ابا نے زیادہ کچھ نہیں' بس اتنا ہاتھ مارا کہ گھر سے خاموشی سے نکل جانے کے بعد شام چھ بجے جب ابا گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک تگڑی سی گائے کی رسی' دوسرے میں سفری بیگ اور پیچھے رکشے والے کو ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے

ایک 40 انچ ایل ای ڈی اسکرین رکھنے کو کہا۔ اماں کو ٹی وی ٹوٹنے کا جو قلق تھا اس کو یہ سینما اسکرین ہی دھو سکتی تھی۔

اس وقت اماں نڈھال سی ماتھے پہ دوپٹے کو کسے تخت پہ ہائے وائے کر رہی تھیں۔ قریب ہی ایڈی دنیا جہاں کی فکریں چہرے پہ سجائے اماں کے سرہانے بیٹھا تھا۔

ابا کو گائے کے ہمراہ اندر داخل ہوتا دیکھ' اماں جھٹ سے اٹھ بیٹھیں۔ ایڈی کے ہاتھ کو دبا کر کچھ اشارہ کیا اور ابا کے استقبال کو آگے بڑھیں۔

ابا نے بڑے جوش اور پریت کے ساتھ گائے اور ایل ای ڈی کا تحفہ اماں کے حوالے کیا اماں تو مانو اپنا غم بھول کر یوں گائے کے چونچلے اٹھانے میں مگن ہوئیں جیسے کوئی ساس نئی نویلی دلہن کے اٹھاتی ہے۔

ایڈی سے کہہ کر ایل ای ڈی اسکرین فٹ کروانے کو کہا۔ اماں کو جوش میں یہ ہوش بھی نہ رہا کہ اتنی جلدی کیسے فٹ ہو گی کوئی فریم تو تھا نہیں جسے جا کر دیوار پر ٹانگ دیتا۔

ایڈی کو حیرت ہو رہی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے گھر میں کیسا ماتم بچھا تھا۔ جس وقت وہ گھر آیا تھا اماں زور و شور سے کمرے میں بیٹھی اپنے لٹنے کی دہائی دے رہی تھیں۔

بقول ان کے انہیں سکینہ خالہ کے گھر کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی اور جس وقت وہ واپس لوٹیں تو پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ گیٹ ذرا سا کھلا تھا اور ان کے سیف سے لمبی چوڑی رقم غائب تھی۔ ماسوائے چند سو روپوں اور دو ہزار کے نوٹ کے.....!

کیسا اندھیر مچا تھا دن دیہاڑے چور اچکا آ کر ان کی سالوں کی جمع پونجی جو نجانے کہاں کہاں سے بچتیں کر کے انہوں نے اکٹھی کی تھی پل میں لے اڑا تھا۔ کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا کم بخت نے۔

ایڈی کے آنے پر اماں نے اپنا یہ راز اس کے سامنے کھولا کہ ان پر کیا بیت گئی تھی اور وہ کب سے ابا سے چھین جھپٹ کر کے تو کبھی مہنگائی کے رونے رو کر

رقمیں ہتھیاتی رہی تھیں، جنہیں کوئی مردود... ہتھیا گیا۔

ایڈی نے اماں کو جی بھر کر حوصلہ دیا کہ چلیں کوئی بات نہیں، ہاتھ کا میل تھا سو اتر گیا اور رہا ہاتھ دوبارہ میلا ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے...

اب وہ اماں کو یہ تو بتانے سے رہا کہ وہ ایک مدت سے اماں کے خفیہ خزانے کا امین ہے، اگر کہہ دیتا تو کوئی بعید نہیں تھا اماں کی توپیں اسے ہی چھلنی کر کے رکھ دیتیں۔ ابا کو بتانے سے اماں نے سختی سے منع کیا کہ اس طرح ابا کھٹک جاتے کہ ان کی بیگم یہ لمبی چوڑی رقم کھیسے میں دبا کر بیٹھی تھی اور ان کے آگے ہر وقت "اور دو اور دو" کی گردان کیے رکھتی تھی۔

اور اماں نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے خرچے میں کسی قسم کی کٹوتی ہو۔ لہٰذا ابا کے آتے ہی چپکی ہو گئیں۔

سر جو صبح سے دھم دھم کیے جا رہا تھا یکدم ہی ٹھیک ہو گیا۔

اور اب وہی اماں تھیں جو گائے اور سینما اسکرین میں مگن، پیسوں کی ٹینشن بھول گئی تھیں۔

رات کو اماں تھک کر جلدی سو گئی تھیں تو یہ دونوں باپ بیٹا صحن میں آ بیٹھے۔ کچھ دیر کاروبار کی باتیں ہوئیں، ایڈی میاں پھر سے اپنے مطلوبہ موضوع پر آ گئے۔ ابا سے بڑے پیار سے اماں کو منانے کو کہا۔ زوبیہ کے لیے راضی کرنے کے لیے تاویلیں دیتا رہا مگر ابا گائے کو بڑے فخر سے گھورتے رہے اور سر مسلسل نفی میں ہلاتے رہے۔ جب کوئی صورت نہ بنی تو تنگ آ کر ایڈی نے ابا سے کہا۔

"ابا...! یہ گائے جس کو اتنا گھور رہے ہیں، پتا ہے کہاں سے آئی ہے...؟"

"کدھر سے آنی ہے گدھے... منڈی سے آئی ہے اور کہاں سے۔" ابا کے انداز میں ہنوز مستی تھی۔

"ہاہاہا...!" ایڈی نے "گجر فلموں" والا قہقہہ لگایا تھا "منڈی سے نہیں ابا... اماں کی سیف سے۔"

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی، ابا کا رنگ فق ہوا اور اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا بکواس کر رہا ہے تو... کون سی سیف، میں نے تو کوئی سیف نہیں کھولی..."

"میں نے کب کہا ابا کہ آپ نے سیف کھولی تھی... سیف تو پہلے سے کھلی تھی۔" ایڈی ابا کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتا ہوا بولا۔

"بے حیا... ! شرم نہیں آتی باپ پہ شک کرتے ہوئے..."

ابا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایڈی کو ایسا کیا کہیں جس سے انہیں تسکین حاصل ہو۔ یہ تو وہ جان گئے تھے کہ ان کی چوری پکڑی گئی ہے۔ پھر بھی آخری دفعہ تڑی دکھانا ضروری سمجھا۔

"تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے یہ گائے تیری ماں کے پیسوں سے لی ہے۔ خوامخواہ میں اندھیرے میں تیر چلاتا ہے۔ چل جا شاباش... ! سو جا کر اور بھول جا زوبیہ، فوبیہ کو... چل میرا پتر!"

"ایویں بھول جاؤں... ! زوبیہ کا ہی تو فوبیا ہے ابا اور آپ کہہ رہے ہیں بھول جاؤں اور جہاں تک ثبوت کی بات ہے تو کہتے ہیں تو دکھا دیتا ہوں۔"

بشارت ایڈی نے موبائل جیب سے نکالا اور اسے کس کر پکڑتے ہوئے کہ ابا کے جھپٹنے کا ڈر تھا، اس میں سے وہ ویڈیو کلپ نکالا اور ابا کے سامنے کیا۔

ابا کے چہرے کے زاویے دیکھ کر ایڈی سے ہنسی کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا اور پھر جو ابا کے منہ سے گالیوں کا طوفان برآمد ہوا اس کے لیے ایڈی پہلے سے ہی تیار تھا مگر ابا کی موٹے سول والی کھیڑی سر پہ پڑنے سے پہلے وہ قریب سے کھسک کر دور ہو گیا تھا۔

ابا کو تو اب ساری رات بڑبڑانا تھا سو وہ اطمینان سے اٹھا اور کمرے میں جاتے ہوئے ابا کو یاد دہانی کروائی۔

"ابا صبح صبح میں نے بکرے لے آنے ہیں۔ اس دفعہ آپ کو پتا ہے نا اماں نے مجھ پر بکروں کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ اب کیا بتاؤں ابا..." حسب عادت سر کو کھجایا اور بولا۔

"میری تو اتنی حیثیت بھی نہیں تھی کہ بندوبست کرتا مگر سوچا کہیں اماں سچ میں میری ہڈی پسلی ایک نہ کردیں۔۔۔ اماں کا مزاج تو آپ کے سامنے ہی ہے۔ آپ تو میرے پیارے ابا ہیں ناں، صبح بیگ صاحب کے ہاں اماں کے ساتھ جا کر رشتہ پکا کر آیئے گا۔"

بشارت ابا کا سکون غارت کر کے کمرے میں گم ہو گیا۔ پیچھے ابا روہانسے سے ہو کر بولے "ایک انڈا۔۔۔ وہ بھی گندا! دیکھ لوں گا تجھے کھوتے دا پتر۔" دن چڑھتے ہی ابا نے اماں کو تیاری کا حکم دے ڈالا اور بارہ بجے کے قریب ادھر بشارت بکرے لے کر گھر پہنچا۔

ادھر ابا اسے گھورتے اور نظروں میں دھمکاتے اماں کو لیے بیگ صاحب کی طرف چل دیے۔ اس کے بعد سب آنا"فانا"ہوا تھا رشتہ طے ہونے سے منگنی تک، سب ابا نے دل سے کیا۔

کچھ بھی تھا اکلوتے بیٹے کی خوشی عزیز بھی تو تھی یہ اور بات کہ ایڈی سے ہنوز بگڑے ہوئے تھے اور پھر ابا کو راضی کرنے کے بعد ویڈیو ڈیلیٹ کر کے وہ آج کل بڑا سرشار تھا۔

اس وقت بھی خالی گھر اور پر سکون ماحول اس کے دل و دماغ کو فریش کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ اپنے ٹوٹل پلان کے بارے میں سوچتا آپ ہی آپ ہی مسکرائے جا رہا تھا۔ شکر تھا کہ کہیں جھول نہیں تھا۔ کچن سے دو کینو اور لاتے وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ ابا اگر سیر تھے تو وہ سوا سیر۔۔۔ آخر تھا تو انہی کا بیٹا۔

ایک باؤنسر ابا نے مارا تھا تو ایک عمدہ شاٹ تو اس نے بھی کھیلا تھا۔ یہ تو کوئی اس کی عقل کو داد دیتا کہ بے نقص کارکردگی تھی اس کی۔۔۔

وگرنہ جو اماں یا ابا کو خبر ہو جائے کہ وہ دو عدد بکرے، جو تین دن صبح میں ڈکراتے پھرے تھے وہ بھی انہی پیسوں سے آئے تھے۔

جن سے وہ خوب صورت سی گائے۔۔۔ تو اماں اور ابا اس کا کیا حشر کریں۔۔۔؟ یہ تو کسی کے بتانے کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یقیناً"اس کے سر کا ایک بال بھی نہ بچے۔ آخر اماں کے خالہ سکینہ کے پاس جانے کے بعد پہلی بونی اسی نے کی تھی۔۔۔

اماں کے سیف سے مطلوبہ رقم نکال کے باقی صفایا ابا کے نصیب میں تھا۔ یعنی اماں کے فرمائشی جانور اماں کے ہی پیسوں سے خرید کر قربان ہو گئے بے چارے۔۔۔!

اب اپنا راز تو وہ کسی کو دینے سے رہا اور ابا کا راز بھی ڈیلیٹ ہو چکا تھا۔ لہٰذا بہتری اسی میں تھی کہ اب اس نقصے پر مٹی ڈالی جاتی اور آئندہ کے لیے ایسی حرکت سے بھی اس نے توبہ کی تھی۔

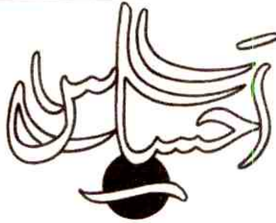
ازالے کے طور پر اس نے اماں کو شادی کے لیے مطلوبہ رقم فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اگلے سال اماں اور ابا کو حج کروانے کا بھی ارادہ کر رکھا تھا۔

فی الحال تو ایک لمبی سی ڈکار لینے کے بعد اپنے ارادوں پر خود کو شاباشی دیتے ہوئے اور آئندہ کے لیے کوئی "خبیثانہ پلاننگ" نہ کرنے کا عہد کرتے ہوئے بشارت ایڈی نے تخت پر لیٹ کر ٹانگیں پساریں اور عنقریب ہونے والی شادی کے خوش کن خیالات میں گم میٹھی نیند کے جھونکوں کا مزہ لینے لگا۔

جہاں خوابوں میں زوبیہ کی ہمراہی تھی اور اپنے چھوٹے سے خاندان کے ہمراہ آرام دہ زندگی کی روشن کرنیں۔۔۔!



صدف آصف



آسمان پر کئی دنوں سے بادل چھائے ہوئے تھے' کبھی کھل کر برستے' کبھی صرف بوندا باندی ہو جاتی۔ اس کے بعد موسم خوشگوار ہو جاتا' ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں۔ آصفہ آفاق نے موسم کو انجوائے کیا' لمحے بھر اپنے گملوں کے پاس رک کر پودوں کو دیکھا' جو بارش سے دھل دھلا کر تروتازہ لگ رہے تھے۔ اچانک اسے دن بھر کی مصروفیت یاد آئی' وہ جلدی سے کمرے کی طرف دوڑی۔ کالے بیگ میں اپنا اور تینوں بچوں کا سامان رکھا۔ آج ویک اینڈ تھا۔ اسے اپنی بڑی نند رعنا باجی کی طرف رہنے جانا تھا۔ بچے ابھی اسکول سے نہیں آئے تھے۔

آصفہ الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے دراز میں رکھا پرس نکالا۔ پورے سات ہزار پانچ سو روپے جمع ہوئے تھے۔ اس نے احتیاط سے پیسے واپس پرس کی چھوٹی سی جیب میں رکھ کر زپ بند کی۔ ایک پرسکون سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھا گئی۔

"بیٹا۔ واش روم میں آپ کا گلابی کاٹن کا سوٹ ہینگ کر دیا ہے۔ آپ تیار ہو کر۔ جلدی سے' بہروز اور شہروز کے بھی کپڑے بدلوا دو۔ بابا کے آتے ہی..... ہم سب رعنا باجی کے گھر کے لیے نکل جائیں گے۔" آصفہ جو کچن میں کھڑی تھی۔ تینوں بچے اسکول سے آگئے تھے۔ اس نے جلدی جلدی پکوڑیاں تلتے ہوئے وہیں سے آواز لگائی۔

مروہ بڑی سمجھ دار لڑکی تھی۔ اس نے پہلے دونوں بھائیوں کے منہ ہاتھ دھلا کر کپڑے بدلوائے۔ اس کے بعد خود نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ بالوں میں کنگھی کر کے ماں کی مدد کرنے کچن میں چلی آئی۔

"اماں..... یہ کیا پکا رہی ہیں؟ ہمیں تو پھپھو کی طرف جانا تھا نا؟" اس نے دھواں نکلتی پتیلی میں ماں کو چمچہ ہلاتے دیکھا تو تجسس سے پوچھا۔

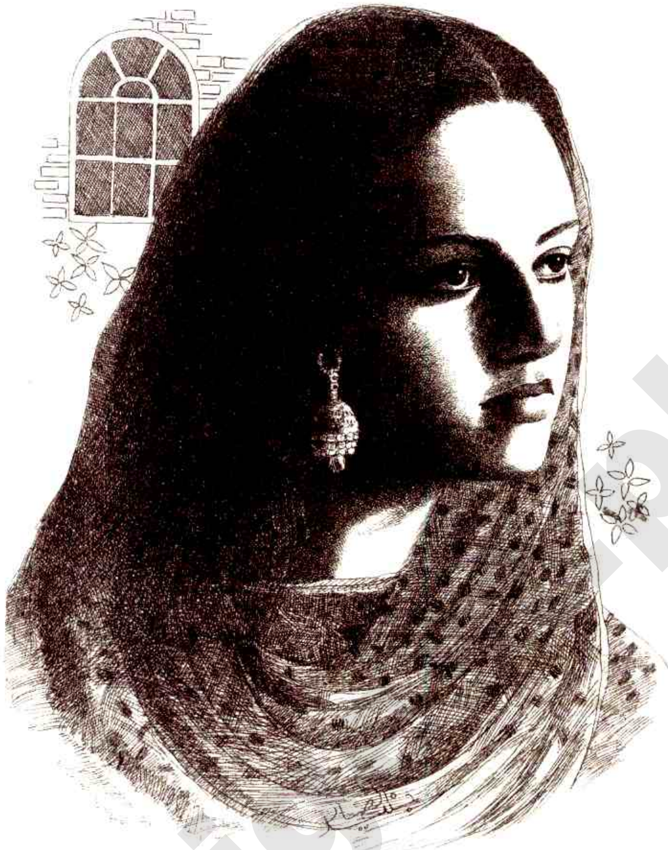
"بیٹا جی..... ہم لوگ آپ کی پھپھو کے گھر جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا تھوڑی سی کڑھی پکا لوں۔ سب کے ساتھ مل کر وہیں جا کر..... کھانا کھائیں گے۔" آصفہ نے بڑے مصروف انداز میں ہاتھ چلاتے ہوئے بیٹی کو تسلی دی۔ کڑی پتے' سفید زیرہ اور ثابت لال مرچ کا بگھار لگاتے ہی' سوندھی سی خوشبو پورے کچن میں پھیل گئی۔ اس نے دوسرے چولہے پر بگھارے چاول دم پر رکھے تھے۔

"اماں..... سب کا کتنا خیال رکھتی ہیں" مروہ نے پیار سے اپنی ماں کو دیکھا' وہ تھی ہی اتنی پیاری' انتہائی سفید رنگت' کالی بڑی بڑی آنکھیں' دراز مڑی ہوئی پلکیں' کالے ہلکے لہریے دار بال جنہیں ہمیشہ دوپٹے سے ڈھانپ کر رکھتی۔

"اچھا سنو' کھانے میں ابھی کافی دیر ہے۔ اس لیے میں نے آپ لوگوں کے لیے نوڈلز بنا دیے' تینوں ٹیبل پر بیٹھ کر کھا لو۔" آصفہ نے بیٹی کو ایک ٹرے تھمائی' جس میں تین پیالے رکھے ہوئے تھے۔ مروہ خوشی خوشی مڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

"سنیں' سامان کے ساتھ ساتھ یہ برتن بھی ٹیکسی میں رکھ دیں۔" وہ زور سے بولی۔ آفاق بالوں میں



کنگھی پھیرتے ہوئے چونکا۔ اس نے نہا دھو کر اپنا مٹیالا پینٹ شرٹ اتارا۔ آصفہ کا استری کیا ہوا سفید ململ کا کرتا شلوار پہن لیا' وہ ایک دم نکھرا نکھرا لگنے لگا۔ آفاق دراز قد' پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ بیوی کے پکارنے پر کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ کیا جھمیلا ہے بھئی؟ تم کو بھی ہر وقت مصروف رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔" آفاق جمال نے مسکرا کر بیوی کو دیکھا۔

"جھمیلے کی کیا بات ہے رعنا باجی بیوہ عورت ہیں۔ اس پر چھ بچوں کا ساتھ۔ یہ تو ان کی محبت ہے کہ محدود وسائل میں بھی ہم لوگوں کو اتنے اصرار سے اپنے گھر بلاتی ہیں۔ بچے بھی وہاں جا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لیے دوپہر کے لیے کھانا پکا لیا کہ رعنا باجی کو کھانے کا فوری انتظام کرنے میں پریشانی نہ ہو۔" وہ جلدی جلدی سامان سمیٹتے ہوئے شوہر کو بتانے لگی۔

"تمہاری یہ بات تو بالکل درست ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ فضل بھائی کے گزر جانے کے بعد۔ باجی میرے ساتھ یہاں آکر رہیں' مگر انہوں نے منع کر دیا۔ ایک تو ہمارے حالات... پھر ان کا وہاں اپنا مکان ہے۔ باجی کو وہ سب چھوڑ کر آنا گوارا نہیں ہوا۔" آفاق کی آنکھوں سے اداسی ٹپکنے لگی تو آصفہ نے شوہر کے بازو کو تھپتھپایا

کر تسلی دی۔

"راستے سے تھوڑا چکن اور پھل وغیرہ بھی خرید لیں گے" وہ سب ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو' آصفہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ آفاق نے محبت بھری نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے سسرال والوں کا بہت خیال رکھا۔ خاص طور پر وہ اس کی بیوہ بہن کی حتی المقدور مالی امداد بھی کرتی رہتی۔

انٹرپاس آفاق جمال پہلے ایک نجی دفتر میں نوکری کرتا تھا' دو بچے ہو گئے تو خرچے بڑھ گئے.... قلیل تنخواہ میں گزارا مشکل ہونے لگا۔ آصفہ نے سالوں کی بچت اور تھوڑا قرضہ لے کر ایک سیکنڈ ہینڈ ٹیکسی خریدلی۔

آصفہ کا سگا بھائی احمد عرفات اپنی بیوی بچوں کے ساتھ دبئی میں رہائش پذیر تھا' وہ ایک کمپنی میں الیکٹریشن تھا' تنخواہ اچھی تھی.... اگر وہ چاہتی تو بھائی سے مالی امداد لے سکتی تھی' مگر اس کی غیرت کو یہ بات گوارا نہیں ہوئی کہ وہ بھائی کا احسان لے کر اپنے شوہر کی نگاہیں جھکا دے۔ دراصل ان دونوں کی یہ پسند کی شادی تھی۔ آصفہ کے والدین کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر احمد کو وہ اپنی شہزادی جیسی بہن کے ہم پلہ نہیں لگا۔ مگر آصفہ نے اس معاملے میں بھائی کی نہیں دل کی بات مانی۔

احمد چھوٹی بہن کے فیصلے سے خوش نہیں ہوا' اسی لیے اس نے شادی کے بعد آصفہ سے نہ ہونے کے برابر تعلقات رکھے۔ آصفہ اکثر بھائی کو یاد کر کے خوب آنسو بہاتی مگر بھائی کو پلٹ کر نہیں پکارا۔

بیوی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اور کچھ مالی مسائل کو حل کرنے کی خاطر آفاق نے نوکری چھوڑ کر ٹیکسی چلانی شروع کر دی۔ معاشی حالات بہتر ہونے لگتے.... تو شہر کے حالات خراب ہو جاتے' ہڑتالوں میں جلاؤ گھیراؤ کے ڈر سے ٹیکسی گھر میں کھڑی ہو جاتی تو آمدنی نہ ہوتی۔ برے بھلے گزارہ ہونے لگا۔ مجبوراً" آصفہ نے جہیز کی سلائی مشین جھاڑ پونچھ کر نکالی اور اجرت پر کپڑے سینے لگی۔

اس نے شادی سے قبل محلے کے نزدیک واقع انڈسٹریل ہوم سے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کیا تھا۔ فنکارانہ ہاتھ میں بڑی صفائی تھی' چند مہینوں میں ہی اس کی سلائی کی دھوم مچ گئی۔ ان کی گلی کے نکڑ پر موجود فیروز درزی کی دکان ٹھپ ہو گئی۔ آصفہ فیروز کے مقابلے میں آدھی اجرت پر نئے فیشن کے مطابق کپڑے سیتی تو محلے کی ہر لڑکی اسی کے گھر کا رخ کرنے لگی۔



"باجی.... یہ پیسے رکھ لیں۔ بقر عید آرہی ہے۔ بچیوں کے لیے کپڑے خرید لیجئے گا۔" آصفہ نے گھر واپسی سے قبل' اپنے بوسیدہ سے پرس میں سے پیسے نکال کر رعنا کی مٹھی میں دبا دیے۔

"ارے یہ کیا بھئی۔ اتنی مہنگائی ہے۔ تم لوگوں کو بھی تو پیسے کی ضرورت ہوگی۔ میں نہیں لوں گی" رعنا نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

"باجی پلیز! اگر آپ ہمیں اپنا سمجھتی ہیں تو خاموشی سے رکھ لیں۔ آپ کے بچے میرے بھی کچھ لگتے ہیں۔" آصفہ جانتی تھی کہ نند کو ضرورت ہے' مگر وہ تکلف کر رہی ہیں۔ اسی لیے جذباتی انداز اختیار کیا۔

رعنا کے حالات کافی خراب چل رہے تھے' اس نے مجبوراً" پیسے رکھ لیے اور چھوٹی بھابھی کو بڑی محبت سے دیکھا۔ جو ہمیشہ ان لوگوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کی جیب چھوٹی تھی' مگر دل بہت بڑا تھا۔ وہ ہر تہوار اور خاص موقع پر ان لوگوں کی کسی نہ کسی انداز میں مدد کرتی رہتی۔



آصفہ نے عید قرباں سے قبل ہفتہ صفائی منانے کا ارادہ کیا۔ صبح' صبح پورے گھر کے جالے جھاڑے' پنکھے صاف کیے' اس کے بعد برآمدے میں رکھے گملوں کی صفائی کرتے کرتے صحن بھی دھو دیا۔ گھر

چمک اٹھا مگر جسم تھک کر چور ہو گیا۔ لیٹنے کی خواہش من میں جاگی۔ مگر ابھی بہت سارے کام باقی تھے۔

"گیارہ بجنے والے ہیں۔۔۔ بچوں کے اسکول سے آنے سے قبل کچھ پکانا ضروری ہے۔ ایسا کرتی ہوں آج طاہری پکا لیتی ہوں" آصفہ نے جلدی جلدی آلو چھیلتے ہوئے سوچا۔ ہنڈیا چڑھا کر وہ صحن میں آگئی جہاں تخت پر مشین رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے کچھ پیسے جمع کر کے منگل بازار سے مردانہ کپڑا خریدا تھا' وہ سادہ کرتا شلوار بھی سی لیتی تھی پہلے اسے فاروق کا عید کا سوٹ سینا تھا۔ عید کی وجہ سے اسے سلائی کا کافی کام ملا ہوا تھا۔ اسے آج کل سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

وہ بہت دنوں سے ایک اچھا سا قیمتی شیفون جارجٹ کا سوٹ لینے کا ارادہ کر رہی تھی۔ مگر اچانک کوئی نہ کوئی ایسا خرچا آجاتا کہ اس کی خواہش من میں ہی رہ جاتی۔ اب بقر عید پر سوچا تھا' شومئی قسمت آفاق کی ٹیکسی کی بیٹری ناکارہ ہو گئی۔ دو دن کے لیے گاڑی کھڑی کرنا پڑی۔ روزانہ کے خرچے پورے ہونا مشکل ہو گئے۔ مجبوراً" ان لوگوں نے اپنا جمع جتھا نکال کر لگایا۔ تو ٹیکسی دوبارہ چلانے کے قابل ہوئی۔ اسی وجہ سے آصف کا ہاتھ بہت تنگ ہو گیا۔ اس نے اپنے کپڑے بنانے کا ارادہ گول کر دیا۔

"اماں! آپ نے عید کے لیے ہم سب کے کپڑے خرید لیے ہیں مگر۔ ابھی تک اپنا سوٹ کیوں نہیں خریدا!؟ دیکھیں تو عید میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں" مروہ بہت حساس بچی تھی۔ اس نے آصفہ کو اپنی تشویش بتائی۔

"میں نے جو میٹھی عید پر جامنی جوڑا بنایا تھا۔ وہ ایک دو دفعہ ہی پہنا ہے۔ سوچ رہی ہوں وہ ہی پہن لوں گی۔" اس نے سوئی کے ناکے میں دھاگا پروتے ہوئے مروہ کی تسلی کرانی چاہی۔

"نہیں اماں! اگر آپ نیا جوڑا نہیں بنائیں گی۔ تو میں بھی پرانے کپڑے پہنوں گی" مروہ نے ماں سے ضد کی۔ اسے بالکل برداشت نہیں تھا کہ اس کی پیاری سی "اماں" جو سب کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ وہ بقر عید والے دن پرانا سوٹ پہنیں۔ آصفہ کو بیٹی پر اتنا پیار آیا کہ اسے خود سے چمٹا کر پیار کیا۔



"دھڑ۔۔۔ دھڑ۔۔۔ دھڑ" دروازہ اتنی زور سے بج رہا تھا کہ آصفہ گھبرا گئی۔ جلدی سے پاؤں میں چپل پہنی اور دروازہ کھولنے بھاگی۔

"بھائی۔۔۔ بھابھی! آپ لوگ؟ ارے اندر آیئے نا!" دروازہ کھولتے ہی اسے اپنا بڑا بھائی احمد اور بھابھی سطوت دونوں بچوں سمیت کھڑی دکھائی دیں تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

"کیسی ہو صفو۔۔۔ کیا حال ہے؟" احمد نے آگے بڑھ کر بہن کے سر کو چوما۔۔۔ آفاق جو آواز سن کر باہر آیا تھا' سالے کو کھڑا دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا' اس کے بعد ان کے سوٹ کیس اٹھا کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"بھائی۔۔۔ آپ بغیر اطلاع کے ایسے اچانک آگئے۔ سچ میں میری تو عید ہی ہو گئی۔" آصفہ کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

"بس آصفہ! ہم لوگ میٹھی عید پر آنا چاہ رہے تھے' لیکن تمہارے بھائی کو چھٹی نہیں ملی۔ اب اچانک ان کے کفیل کو جانے کیسے ہم پر رحم آگیا' اس نے پورے پندرہ دن کی چھٹی عنایت کر دی۔ ہم نے فوراً" ٹکٹ کٹائے۔ یہ تو یہاں آنے میں جھجک رہے تھے۔ لیکن میں نے سمجھایا۔ ناخن بھی گوشت سے الگ ہوتا ہے۔ وقتی چپقلش اور دوری سے اپنے پرائے تھوڑی بن



جاتے ہیں۔ اماں ابا جی کے انتقال کے بعد سسرال کے نام پر میری ایک چھوٹی نند ہی تو رہ گئی ہے۔ میں تو پہلے بقر عید اس کے ساتھ گزاروں گی پھر اپنے میکے کا رخ کروں گی۔" سطوت نے آصفہ کو گلے لگا کر پیار سے کہا تو وہ لوگ حیران رہ گئے۔

سطوت میں اتنا مثبت بدلاؤ قابل تعریف تھا۔ آصفہ کا دل باغ باغ ہو گیا' شاید دبئی کی تنہائی یا اپنوں سے دوری نے ان کے خیالات میں اتنی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔۔۔ جو بھی تھا' وہ ان سب کی آمد پر بہت خوش تھی۔ اتنے سالوں بعد اپنے دونوں بھتیجوں کو خود سے لپٹا کر پیار کرتے ہوئے رو دی۔ احمد اور سطوت کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔



"بھابھی! یہ انگور کھائیں۔" آصفہ شیشے کے پیالے میں سبز رنگ کے موتی جیسے انگور لے آئی' سطوت نے مسکرا کر چند دانے منہ میں رکھے۔

"بھابھی۔۔۔ احمد بھائی کہاں ہیں؟" اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

"وہ۔۔۔ سب بکرا خریدنے گئے ہیں۔۔۔ تم واش روم میں کپڑے دھو رہی تھیں تو مجھے بتا کر چلے گئے۔" سطوت نے مسکرا کر کہا۔

"اتنے سارے لوگ مل کر ایک بکرا خریدنے گئے ہیں۔ آج تو بکرا منڈی والوں کی خیر نہیں۔" وہ خوش دلی سے کہہ کر ہنس دی۔

"یہ تو ہے۔ اچھا صفو! اس میں آفاق اور بچوں کے لیے کپڑے' کھلونے اور چاکلیٹس ہیں۔" سطوت نے ایک چھوٹا سا بیگ اس کے حوالے کیا جو وہ دبئی سے لائی تھی۔

"اتنا تکلف کیوں کیا؟ وہ ہاتھ پیچھے کر کے کہنے لگی۔

"ہم اتنے سالوں بعد آئے ہیں' اتنا تو سب کا حق بنتا ہے یہ رکھو۔" سطوت نے زبردستی اسے بیگ تھمایا۔ وہ اب انگور کا پیالا گود میں رکھے انگور کے دانے اٹھا اٹھا کر کھانے لگی۔ آصفہ پیاز چھیلنے لگی۔۔۔ اس کا آج بریانی پکانے کا ارادہ تھا۔

"اے لو۔۔۔ میں بھی کتنی بھلکڑ ہوں۔ تمہارا تحفہ تو دیا ہی نہیں۔ یہ تمہارے بھائی نے خاص طور پر تمہاری عید کی شاپنگ کی تھی۔" سطوت نے سائیڈ میں رکھا دوسرا پیکٹ نکال کر اس کے حوالے کیا تو۔

آصفہ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسے ان چیزوں کی نہیں میکے سے آنے والی عیدی کی خوشی تھی۔

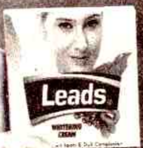
ہر تہوار پر پاس پڑوس میں رہنے والی خواتین اپنے میکے سے بھیجی گئی عیدی یا سوغاتیں ایک دوسرے کو دکھا دکھا کر خوش ہوتیں تو اس کا دل ہمک ہمک اٹھتا۔۔۔ بھائی کی یاد بلبلا کر من میں جاگ اٹھتی۔ جب تک ماں زندہ تھیں۔ بیٹی کو بری بھلی چیزیں بھیج دیتیں۔ ان لوگوں کی آنکھ بند ہونے کے بعد سے تو برسوں گزر گئے۔ اس کے میکے سے ایک دوپٹہ بھی نہ آیا۔ اس کا دل دکھتا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اتنی غربت میں بھی وہ ہمیشہ رعنا کا مان قائم رکھنے کی کوشش میں ہلکان رہتی۔

اس نے سارے کام نمٹانے کے بعد کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد بڑے اشتیاق سے وہ پیکٹ کھولا تو حیران رہ گئی۔ کئی مہینوں سے جس شیفون کے سوٹ بنانے کی خواہش اس کے دل میں پنپ رہی تھی۔ اسی طرح کے چار قیمتی سوٹ' میک اپ کا سامان اور ساتھ ہی مخمل کے نفیس ڈبے میں نازک سے گولڈ کے بندے رکھے ہوئے تھے۔ آصفہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ برسوں کی بے قراری پل میں فنا ہو گئی۔ وہ بستر سے اتر کر شکرانے کے نفل ادا کرنے اٹھ کھڑی ہوئی' بے اختیار آنکھ سے خوشی کا ایک آنسو گال پر ٹپکا۔ دل میں اپنوں کی محبت کا احساس جاگ اٹھا۔




Leads
WHITENING
CREAM


Leads
WHITENING
CREAM


Leads

"ذکا نشیمن" میں وہ دس ماہ کی عمر میں آئی تھی۔ عمر کا ایک ایسا دور جب ماں کی گود اور باپ کے شفیق سائے کا احساس اتنا تناور نہیں ہوتا۔ وہ بھی نانی کے نرم گرم وجود کی آڑ لے کر "ذکا نشیمن" میں ایسا رچی بسی کہ اس کا یہ رچنا بسنا ہی مامی کو کھٹکنے لگا۔ حالانکہ اصولاً "تو مامی کو سکھ کا سانس لینا چاہیے تھا کہ وہ ان کے گھر میں اطمینان و سکون سے رہتے ہوئے کسی بھی قسم کی بدمزگی کا باعث نہیں بن رہی۔ لیکن شاید مامی انسانوں کی اس قسم سے تعلق رکھتی تھیں جنہیں خوامخواہ' بلاوجہ کے عناد پالنے میں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔

اب تو خیر مامی اس عناد پالنے میں کچھ حق بجانب بھی تھیں۔ لیکن جب وہ دس ماہ کی تھی اور نئے نئے تعمیر ہوئے اس "ذکا نشیمن" میں ماموں کی محبت و مہربانی سے لائی گئی تھی۔ مامی نے تو تب بھی اپنی ناپسندیدگی کا اعلان زور و شور سے کر دیا تھا' اور یہ شاید ان کا واحد "شور" تھا جس پر ماموں نے کان نہیں دھرے تھے۔

"اتنی کم سن بچی کو میں یتیم خانے میں ڈال کے دنیا کو تھو تھو کرنے کا موقع فراہم کروں؟ نہیں یہ گناہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔" ہمیشہ ہر ہر موڑ پر مامی کے آگے سر تسلیم خم کرنے والے ماموں اس وقت نامعلوم کیسے ڈٹ گئے تھے۔

"تو اس کے چاچے مر گئے ہیں کیا؟ لے کے ہمارے سر منڈھ دی۔" مامی کا بس نہیں چلا تھا ورنہ اپنے ہاتھوں اس کا گلا بھی گھونٹ ڈالتیں۔

"مر ہی گئے سمجھو۔"

نانی پہلے ہی اپنی چہیتی اکلوتی بیٹی اور داماد کی ناگہانی موت پر افسردہ تھیں۔ بہو کے اس فسادی روپ نے مزید رنجور کر ڈالا تھا۔

"تمہارے سر کیوں.... جب تک میں زندہ ہوں'

فرحانہ ناز ملک

محبت کی کہانی ہیں



مکمل ناول



اپنی نواسی کو میں سنبھالوں گی۔"

اور نانی نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ ایسی اس پر چھتنار کی طرح سایہ فگن ہوئیں کہ اسے اصل ماں باپ کی کمی محسوس کرنے کا نہ خیال آیا اور نہ کبھی ضرورت پڑی۔ نانی نے اسے ہر سرد و گرم سے بچا کر پالا تھا' نہیں بچا سکی تھیں تو صرف مامی کی تند و تیز نظروں سے' جو نانی اور نواسی پر اس لیے بھی اثر انداز نہیں ہوتی تھیں کہ ان نظروں کی تابناکی سے صرف وہی کیا... جلال ماموں' ثوبیہ اور اکلوتا چشم چراغ "ذکا جلال" بھی منور رہتے تھے' پھر گلہ کیسا!!

مامی کا جتنا بھی آتشیں مزاج سہی... بہرحال اسے رکھے تو ہوئے تھیں اپنے گھر... دو سگے چچاؤں اور اکلوتی پھپھو نے تو مروتاً بھی اپنے ساتھ لے جانے کی پیش کش نہیں کی تھی۔ بلکہ پھپھو تو آئی ہی نہیں تھیں۔ اس کے ابو' امی کی حادثاتی کرب ناک موت پر۔ بہانہ کوئی بہت ہی اہم آفس کی مصروفیت بنا۔ آٹھ آٹھ آنسو بہا کر دونوں چچا بھی رخصت ہوگئے۔

فرانس' ناروے اور کینیڈا جیسے بڑے بڑے ملکوں میں بسنے والے اس کے ان خونی رشتے داروں کے دل اتنے ہی سکڑے ہوئے تھے' جوان بہن اور بہنوئی کی حواس سلب کردینے والی موت پر نڈھال ہوئے ماموں' بھانجی کے خونی تعلق داروں کی اس توتا چشمی پر مزید آہیں بھرتے اس ننھے وجود کو سینے سے لگائے اپنے گھر روانہ ہوئے تھے۔

تب ثوبیہ نہیں پیدا ہوئی تھی اور ذکا چار سال کا تھا۔ مامی نے جو اس سے سرد و سپاٹ رویہ رکھا تھا... وہ آج تک برقرار رہا' جبکہ عمر کی بائیس منزلیں طے کر چکی تھی۔ بائیس سال کم نہیں ہوتے' ایک طویل عرصہ ہوتا ہے' اتنا عرصہ تو جانور بھی ساتھ رہے تو انس پیدا ہوجاتا ہے' اور ادھر انس تو کیا' مامی نے کبھی پیار کی نگاہ سے بھی دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔

اور اب تو "وجہ مخالفت" بھی پیدا ہوچکی تھی۔ یعنی اب مامی کے اس سے معقول نوعیت کے اختلافات تھے' اور یہ معقول بھی صرف مامی کی ہی ڈکشنری میں تھے۔



کمرے کی نیم تاریک فضا میں وال کلاک کی ٹک ٹک کی آواز تواتر سے گونج رہی تھی۔ اس آواز کا ساتھ کبھی کبھی نانی کی زوردار جمائی بھی دے دیتی۔

نانی کی ہر جمائی پر اسوہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ یہ جمائی شاید آخری جمائی ہو آج کی رات کی اور اس کے بعد نانی سونے کا قصد کر ہی لیں۔ مگر آج لگتا تھا کسی خصوصی وظیفہ کی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ ورد تھا کہ لمبا ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

سیدھے لیٹے لیٹے اسوہ کی ٹانگیں بھی اکڑ گئی تھیں۔ بار بار اس خدشے کے تحت کروٹیں بھی نہیں بدل رہی تھی کہ کہیں نانی کو شک ہی نہ پڑ جائے اس کے جاگنے کا۔ کافی دیر بعد اپنی گہری نیند کی اداکاری سے اکتا کر اسوہ نے ایک آنکھ کھولی' نانی وظیفہ مکمل کر چکی تھیں اور اب تسبیح بنا کسی آواز کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور پھر ایک طویل ترین پھونک اسوہ پر بھی ماری۔

"اللہ اکبر۔" نانی نے تکیے برابر کرتے ہوئے نیند بھری آواز میں کہا۔ اسوہ کی مشقت ختم ہونے جا رہی تھی۔

"خیر کی رات گزرے میرے مالک!" اور اگلے ہی پل تکیے پر سر رکھتے ہی غنودگی میں بھی چلی گئیں۔

اسوہ نے پھر سے ایک آنکھ کھول کر جائزہ لیا۔ نانی کے ہلکے ہلکے خراٹے گونجنے لگے تھے۔ پھر بھی وہ دس منٹ مزید لیٹی رہی۔ اس یقین کے بعد کہ نانی کی نیند اب نہیں ٹوٹنے والی۔ وہ آہستگی سے اٹھ بیٹھی۔ تکیے کے نیچے سے سیل فون گھسیٹا' اور ایک نمبر پر مسڈ کال دی۔ بلاتاخیر اسی نمبر سے کال آبھی گئی۔

موبائل کی ٹون بند تھی۔ ورنہ نانی ضرور کسمساتیں۔ ابھی بھی خدشہ تھا کہیں جاگ نہ جائیں۔ سوتے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ سو اسوہ دبے پاؤں چلتی واش روم میں گھس گئی۔

آج اس نگوڑ ماری کال کے لیے نیند کی بھی قربانی دے دی تھی۔ اس سے پہلے تو تائی گیارہ بجے تک فارغ ہوتے ہی سو جاتی تھیں' اور وہ گیارہ سے بارہ یا ایک بجے تک آرام سے جاگ کر فون کال کے ذریعے رنگین خواب بنتی۔ آج تو ساڑھے بارہ سے بھی اوپر ہو گئے تھے۔ پتا نہیں کال کا دورانیہ کتنا ہوتا تھا' دل کے مالک کے موڈ پر منحصر تھا۔



مامی کی ایک اور مہربانی کہ انہوں نے اس پر سونے جاگنے کے مخصوص اوقات پر قطعی پابندی نہیں لگا رکھی تھی۔ اسی مہربانی کا ہمیشہ کی طرح ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ آج بھی دس بجے جاگی۔

"باپ رے۔" جاگنے کے بعد ہڑبڑائی تھی۔ ابھی بھی منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مارنے کے بعد دوپٹے سے پونچھتی وہ جمائیوں پہ جمائیاں لیتی اپنے اور تائی کے مشترکہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

آدھی رات تک جاگی آنکھیں ابھی بھی بند ہوئی جا رہی تھیں۔

کافی بڑا سا منہ کھول کر جمائی لیتے ہوئے بند ہوتی آنکھوں کو پورا بند کر کے بڑی شان سے ایک قدم اور گھسیٹا ہی تھا کہ سامنے رکھے اسٹول سے ٹکرا کر سیڑھیاں اترتے ذکا کے بازوؤں میں جا گری۔ نیند فوراً" دور بھاگی۔

آنکھیں مٹکا مٹکا کر اس نے ذکا کو معصومیت سے تکا تھا۔

"یہ صبح ہے تمہاری؟" وہ خشمگیں نظروں سے گھور کر پوچھنے لگا۔

"نہیں رات ہے۔" مجال تھا وہ ذکا کو سیدھا جواب دے دیتی۔

"الو..." ذکا کے تاثرات مزید برہم دیکھ کر وہ مزید پھلجھڑی چھوڑنے کے لیے تیار ہوئی۔

"میری تمہاری سب کی صبح ہے۔"

"میری نہیں صرف تمہاری... میری صبح چھ بجے ہو جاتی ہے' تمہاری طرح گیارہ بجے نہیں ہوتی۔" اور اس سے پیشتر کہ وہ کوئی اور پھلجھڑی چھوڑتی گھن گرج کے ساتھ پکار پڑی۔

"ذکا۔" اور ذکا صاحب حسب توقع دہل اٹھے۔

مامی کچن کے دروازے پر کھڑی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔ اسوہ اور وہ بھی ذکا کی بانہوں میں...

"نہیں۔" پہلے مامی کو اور پھر اسوہ کو دیکھنے کے بعد دل دوز چیخ مارتے ہوئے ذکا نے یوں اسوہ کو پرے پھینکا جیسے کسی خطرناک شے سے چھٹکارا پا رہا ہو۔ اسوہ بڑے زور سے فرش پر گری تھی۔

"خانہ خراب... ریڑھ کی ہڈی کریک کر دی۔" وہ کمر پکڑ کر وہیں بیٹھے بیٹھے کراہی۔ مگر اب فرصت کسے تھی' اس کی ریڑھ کی ہڈی چیک کرنے کی... ذکا دہشت زدہ سا ماں کی طرف متوجہ تھا۔

"باپ کا آفس ہے' اس کا مطلب یہ نہیں آدھا دن گزار کر جاؤ۔" مامی کی شعلے اگلتی نظریں اسوہ پر تھیں۔

"آ... آ... آئی نو مما! رات کچھ طبیعت..." حالت کچھ زیادہ ہی پتلی ہو گئی تھی۔ زبان کئی بار ہکلائی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے' اب نکل جاؤ' آئندہ میں یہ بے احتیاطی برداشت نہیں کروں گی۔" مامی کے کہنے کی دیر تھی' ذکا یوں بھاگا جیسے پھانسی کی سزا ٹل گئی ہو۔

"تف ہے تمہارے مرد ہونے پر۔" اسوہ کے بس میں نہیں تھا ورنہ دو' چار کرارے تھپڑ تو ضرور ہی ذکا کو لگاتی۔

"ہو گئی تمہاری صبح؟" مامی کی تفتیشی توپ کا رخ اس کی جانب ہوا تو وہ کراہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جی... ہو ہی گئی۔" مامی کو نظر انداز کر کے کچن کی طرف جاتے جاتے منمنائی۔

"میں کہے دے رہی ہوں۔" مامی باہر لاؤنج سے ہی پھنکار رہی تھیں۔ "آج کے بعد دس گیارہ بجے جاگیں

تو چائے' ناشتہ بھول جانا۔"

"ہائیں؟" اسوہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ یہ یقیناً "کچھ دیر قبل والے اس کے اور ذکا کے سنگین منظر کا رد عمل تھا۔ ورنہ مامی نے ان باتوں پر تو کبھی ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی۔

"غضب خدا کا... گھر کو سرائے سمجھ لیا۔ کوئی مذاق ہے؟" مامی کی آواز معدوم ہونے لگی تھی۔

"لو اسوہ بی بی!" ٹھنڈی ٹھار آہ کے بعد وہ بے چاری سی شکل بنا کر بڑبڑائی۔

"پیشی کا فیصلہ بھگتو ایک یہی عیاشی تھی اپنی مرضی سے سونے جاگنے والی' اس پر بھی ٹیکس لگ گیا۔ چائے' ناشتے کے خاتمے کا۔"

"اور سنو۔" اپنی ہی دھن میں تھی' مامی کی گھن گرج پھر کہیں قریب سے گونجی تو وہ ہل کر رہ گئی۔

"کل نادرہ لا رہی ہے ودود صاحب کی فیملی کو... انسان بننے کی مشق آج سے شروع کردو' کل میں کوئی گڑبڑ برداشت نہیں کروں گی۔" حکم اور بعد میں دھمکی بھی...

اسوہ نے بڑی بری طرح سے اپنے گھونسلہ ہوئے بالوں کو جکڑ کر مزید کھچڑی بنا ڈالا۔

☼ ☼ ☼

مامی کے اسوہ سے اختلاف کی "معقول وجہ" بھی یہی تھی۔ جس کا وہ برملا اظہار تو نہیں کرتی تھیں۔ لیکن ان کا ہر ہر عمل اس بات کی طرف اشارہ کرتا کہ وہ کسی وجہ کو لے کر دانت کچکچا رہی ہیں۔

ذکا' اسوہ' اسوہ اور ذکا۔ ان دو ناموں کا ملاپ بھی اگر بھولے سے کوئی ان کے سامنے کردیتا تو وہ یقیناً "آسمان زمین ایک کردیتیں۔ سو ایسی بھول کرنے کی جرات کسی میں نہیں تھی۔ پر کیا کیا جاسکتا تھا کہ مامی کی اپنی چھٹی حس ہی بیدار ہوگئی۔

اسکول لیول کے دوران ہی ذکا' ثوبیہ کے سامنے بات بے بات ثوبیہ اور اسوہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔ اسوہ کے لیے چن چن کر حسین سے حسین مثال دیتا اور ثوبیہ کو اچھا خاصا زچ کرتا۔

ایک بار' دو بار' تین بار... مگر بار بار کہاں برداشت ہو سکتا تھا۔ مامی کی سوچ کر ہی حسیات تن گئیں کہ مستقبل میں ذکا کہیں اسوہ کے ساتھ؟؟؟ آگے کی قیاس آرائی کرنے سے زیادہ انہوں نے ذکا کے کان کھینچنا بہتر سمجھا' اور وہ کان ایسے کھینچے کہ ذکا پر اب تک دہشت برقرار تھی۔

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اور اسوہ ایک دوسرے سے کزنز والی بے تکلفی تو کجا ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ مامی کا سایہ آس پاس کہیں موجود ہوگا۔ وہ ذکا کی پرچھائیں سے بھی محفوظ رکھنا چاہتی تھیں۔ اور اس کے لیے انہیں بھلے جتنی مشقت کرنا پڑتی' وہ کرسکتی تھیں۔

درحقیقت تو بیٹے کی چوکیداری کرنے میں انہوں نے اپنا آرام تج کردیا تھا۔ اسوہ ان کے لیے اسوہ نہیں' ایک آسیب بن گئی تھی۔ جس کے بھوت نیند میں بھی انہیں ڈراتے تھے۔

☼ ☼ ☼

مامی اپنے معمول پر کاربند کریم کا مساج کر رہی تھیں۔ بیڈ پر نیم دراز جلال ماموں کسی سوچ میں محو تھے۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" مامی کی تیز نظریں اپنے چہرے کے ساتھ ساتھ آئینے میں دکھتے ماموں کے عکس پر بھی تھیں۔

"میں سوچ رہا ہوں... کون سی ایسی خوبی ہے جو اسوہ میں نہیں۔" ماموں کے کہنے کا اسٹائل ایسا دکھی اور غم زدہ تھا کہ مامی نے نظریں ٹیڑھی کرلیں۔

"پتا نہیں پھر بھی کیوں دیر ہو رہی ہے؟" ماموں نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"آپ کی بھانجی کے دماغ میں فتور ہے۔ جب تک فتور نکلے گا نہیں... رشتے ناک پر نہیں چڑھنے

والے۔" چمک کر کہنے کے بعد مامی نے پھر چہرے کو مشق ستم بنایا۔

"کیسا فتور؟" ماموں الجھ سے گئے۔

"بس بس... منہ نہ کھلوائیں میرا۔" مامی اب بے نیاز نظر آنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"پھر بھی... پتا تو چلے۔" ماموں پریشانی سوار کیے اٹھ بیٹھے۔

"زیادہ ننھے نہ بنیں۔" آنکھیں سکوڑ کر مامی اپنی جون میں آئیں۔

"جوان لڑکی کی بدلتی چال بھی کسی سے چھپی رہ سکتی ہے؟" ماموں کے کلیجے میں آگ لگا کر وہ پھر سے بے نیازی اوڑھ بیٹھیں۔ ماموں کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ مامی کو خفا خفا نظروں سے گھورا۔

"تم میری بھانجی پر الزام لگا رہی ہو؟" انہیں صحیح معنوں میں غصہ آگیا تھا۔

"میں نے جو محسوس کیا' وہی بتایا۔" مامی نے یوں کندھے اچکائے جیسے کچھ بھی تو نہ کیا ہو۔

"دیکھو... دیکھو... مم... میں..." بات کی سنگینی سے زیادہ ماموں کو مامی کی ادائے بے نیازی کھلی۔ غصے کی شدت سے انہیں لفظ بھول گئے۔ مٹھیاں کھولیں بھینچیں' پھر سے یہ عمل دہرایا اور بعد ازاں ٹھنڈے بھی پڑ گئے۔ مامی پر آیا غصہ وہ ہمیشہ اپنی کوشش سے بھگایا کرتے تھے۔

"میں تو... میں تو..." غصے والی ٹون اب خوف کا عنصر لے چکی تھی۔ مامی بہت کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا میں تو... میں تو؟" مامی تنک کر پوچھنے لگیں۔

"میں تو۔" ماموں نے بے اختیار تھوک نگلا۔

"میں تو سوچ رہا تھا۔" اتنا کہہ کر مامی سے نظریں چرائیں' اگلے جملے کے لیے یہ اشد ضروری تھا۔

"ذذذ... ذکا اور اسوہ" "کیا...؟" کمرے میں جیسے بھونچال سا آگیا۔

کیا مساج اور کیا چہرے کی تازگی۔ سب بھول بھال مامی بھڑک کر ماموں کی طرف لپکیں۔

"میں کہتی ہوں... سوچا بھی کیسے... جرات کیسے کی؟" اتنا شدید غصیلا ردعمل۔

ماموں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ کمرے میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ دو منٹوں کے اندر اندر ماموں کا تکیہ اور چادر بیڈ روم سے باہر اڑ کر آئے' اور پیچھے بھیگی بلی بنے ماموں بھی۔

اگلے چند لمحوں میں ماموں لاؤنج کے صوفے پر سکڑے سمٹے پڑے تھے' شادی کی پہلی رات بھی ماموں کو یہ سزا جھیلنی پڑی تھی۔



اور ادھر بھانجی صاحبہ اپنی بدلتی چال کا ثبوت کمرے کی دیواروں کو دے رہی تھیں' دیوار گیر گھڑی پر رات کا ایک بجنے والا تھا۔ نانی اپنے بستر پر محو خواب تھیں' کمرے کی خاموشی کو یا تو ان کے خراٹے چھیڑ رہے تھے یا اسوہ کی بھنبھناہٹ۔ اپنے بستر پر لحاف میں گھسی' موبائل فون سے لگائے وہ دبی آواز میں غرا رہی تھی۔

"خدا کا واسطہ... بخش دو مجھے۔ میں تھک گئی ہوں اس پریڈ سے۔" دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا کہ اس کی غراہٹ منمناہٹ میں بدل گئی۔

"تم کچھ نہ کرنا' بیٹھے رہو چین کی بنسی بجاتے۔" منمناہٹ پھر سے غراہٹ میں بدلی۔ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ میں پکڑے سیب پر بھی دانت گاڑے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سیب کا بڑا سا ٹکڑا چبالیا تھا کہ اس وقت فون کے دوسری طرف موجود دل کے مالک کی نقل اتاری تو تلاہٹ کے ساتھ۔

"جب اسوہ دلہن بن کر رخصت ہو جائے گی' تب ٹھیک ہو جائے گا۔" غصہ ایک بار پھر حاوی ہوا۔

"بس بس۔ زیادہ ڈائیلاگ مارنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے یہ ہتھیار گھس چکے ہیں۔" اس کے لہجے میں تمسخر نمایاں تھا۔

"کل پھر میری سزا ہے۔" اگلا جملہ روہانی صورت اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"کہنے کی ضرورت نہیں۔" یک دم وہ پھر جوش میں آکر غرائی۔ "میں خود ٹرینڈ ہو چکی ہوں رشتے بھگانے میں۔ اب تو امی بھی مجھ پر شک کرنے لگی ہیں۔" آواز میں بے چارگی رچی ہوئی تھی۔

"تم بھی کچھ نہ کرنا' سارا کچھ میں ہی کروں گی' تم ساری زندگی **کھکھیاتے** رہنا' وہ بھی۔" وہ دانت پیس پیس کر کہنے کے ساتھ بنا دیکھے ادھ کھایا سیب سائیڈ ٹیبل پر رکھنا چاہا۔ سیب تو وہاں ٹک گیا' لیکن پانی سے بھرا گلاس ہاتھ لگنے سے فرش پر جا گرا۔ اسوہ بری طرح سے ہڑبڑائی۔

پورا منہ کھول کر وہ گھبراہٹ کے مارے نانی کو دیکھنے لگی' جو **کسمسا** رہی تھیں۔

"شش... شش۔" نانی نیند میں کسی کو بھگا رہی تھیں۔ اسوہ نے سانس روک لی تھی۔

"بند کرتی ہوں' نانی بیدار ہو رہی ہیں۔" دبی آواز میں کہہ کر موبائل آف کر دیا۔

"دیکھ اسوہ! بلی تو نہیں گھس آئی؟" نانی کی نیند بھری آواز میں تشویش غالب تھی۔

"میرے دانت بھی رکھے ہیں... پیالے میں... چبا نہ جائے منحوس۔"

"بلی نہیں ہے نانی۔" اسوہ نے اکتا کر کہا اور تکیے برابر کرنے لگی۔

"باگڑ بلا ہے۔" بڑبڑاتے ہوئے سر تکیے پر گرا لیا تھا۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی ڈیپریشن ہونے لگا تھا' یہ نہ جانے کیسی محبت تھی۔ نکھرنا تو دور کی بات جل سڑ کر شکل اور **فلیٹ** منہ ہوتی جا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

"آؤ آؤ صاحبزادے!" اپنے آفس میں داخل ہوتے ذکا پر نظر پڑتے ہی ماموں نے خوش دلی سے کہا' اور سامنے رکھی فائل ایک طرف کر دی۔

ذکا چیئر گھسیٹ کر بیٹھ چکا تھا۔ ماموں کی خوش دلی کے جواب میں بنا کسی مسکراہٹ کی چھب دکھائے۔ اتری ہوئی شکل کے ساتھ میز کی شفاف سطح کو گھورتا رہا۔ ماموں قدرے ٹھٹکے۔

"یہ آج وحید مراد کی جھلک کیوں نظر آرہی ہے تم میں؟" ذکا ہنوز گھس سا بیٹھا رہا۔

"اس کا مطلب ہے... سب ٹھیک کہہ رہے تھے۔" ماموں نے سنجیدگی دکھائی۔

"کون سب؟ حسب توقع ذکا کا آسن ٹوٹا۔" اور کیا ٹھیک کہہ رہے تھے؟ اس کے ماتھے پر تیوریاں تھیں۔

"یہی تمہارے ماتحت۔" ماموں نے سرسری لہجے میں بتایا۔ ذکا پھر پہلے والی حالت میں چلا گیا' یعنی گھس اور سست۔

"کوئی دس بندے تو ضرور آئے۔ اس اطلاع کے ساتھ کہ ذکا صاحب مراقبہ میں ہیں۔" ماموں کے تیز لہجے پر بھی ذکا نے چہرے کے تاثرات نہیں بدلے۔

"صاحبزادے!" ماموں تھوڑا سا آگے ہوئے۔ "اس عمر میں گوتم بدھ بننے کی کیا سوجھی؟"

پوچھنے کا انداز دوستانہ تھا۔ ذکا پہلے پیپر ویٹ گھماتا رہا۔ پھر اچانک آگے ہو کر بولا۔

"ڈیڈی! مجھے آپ کی ہیلپ چاہیے۔"

"میاں! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے' معدے میں گرانی یا اینٹھن... گلے میں...؟"

"ڈیڈی۔" ذکا نے بات اچک کر بدستور لجاجت دکھائی۔ "پرامس کریں آپ میری ہیلپ کریں گے۔" ماموں انتہائی شکی نظروں سے کئی سیکنڈ گھورتے رہے' جس کی حالت قابل دید ہو رہی تھی۔

"یہ ہیلپ میرے اختیارات کی حد کو چیلنج کرے گی تو پھر میرا ایکسکیوز قبول کرو۔"

"ڈیڈی!" ذکا پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔ "اپنی بیوی کے شوہر کے علاوہ بھی ایک باپ بھی بن کر دکھائیں۔" ماموں کی آنکھیں پوری کی پوری پھیل گئی تھیں۔

"انتہائی نامعقول مشورہ ہے۔"


Dark Circle
Freckles
Pimples
پاکستان کی پہلی مکمل وائٹنگ کریم جو
میلانن کو کم کرے
اور رنگت نکھارے
NOMARKS
ANTI-MARKS CREAM
with Fruit Extracts
Parley
پارلے آئیورویدک نو مارکس کریم
ڈارک سرکل، پمپلز اور فریکل کو بھی صاف کرے
آپ کی سکن بلیک کیوں ہوتی ہے؟ میلانن، یومیلانن اور فیومیلانن سے مل کر بنتا ہے۔ جلد کی رنگت کا انحصار ان دونوں "Pigments" کی مقدار پر ہوتا ہے۔ اگر یومیلانن کی مقدار جلد میں بڑھ جائے تو جلد پر ڈارک سرکل، پمپلز، فریکل اور رنگ کالا ہو جاتا ہے۔ پارلے نو مارکس کریم میں نیچرل ہربز اور فوڈ ایکسٹریکٹ شامل کیے گئے ہیں۔ جو یومیلانن کی مقدار کو کم کر دیتے ہیں۔ نتیجتاً ڈارک سرکل، پمپلز، فریکل ختم کر دیتی ہے۔ آپ کا رنگ گورا ہو جاتا ہے۔ جس سے آپ کو ملتی ہے۔ فیئر کلیئر سکن
fair clear skin
KHYBER CHEMICAL COMPANY
392 GPO Lahore Pakista
info@parley.pk www.parley.pk



"واٹ" ذکا ٹھیک سے سن نہیں پایا' ماموں کیا بڑبڑائے۔

"میرا مطلب ہے۔ طریقے سے اپنی پریشانی بتاؤ۔ چک پھیریاں نہ دو لفظوں کو۔" ماموں تھوڑے سے نرم پڑے۔

"بات یہ ہے۔" ذکا آگے ہوا اور ایک پل میں اپنی وجہ پریشانی بتا بھی دی۔ جسے سن کر ماموں ذکا والی پوزیشن میں چلے گئے۔ ساکت اور بالکل بے تاثر۔

"ڈیڈی... ڈیڈی!"

"آں ہاں۔" ذکا کی پکار دور کہیں سے آتی محسوس ہوئی' مگر وہ پھر بھی دماغ کو حاضر کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ذکا کی طرف دیکھا' پھر نظریں چرائیں۔

ٹائی کی ناٹ کو دائیں بائیں کرکے کھنکھارا اور پھر سے خیالوں میں کھوگئے۔ ذکا کو خبر بھی نہیں تھی اور وہ پھر سے رات والے منظر کو ری وائنڈ کر بیٹھے تھے۔ جب تکیے' چادر سمیت انہیں کمرہ بدر ہونے کا حکم ملا تھا۔ اور وہ لاؤنج میں رات گزارنے پر مجبور ہوئے تھے۔

"اس کام میں ہاتھ کیوں ڈالا۔ جس کے پورا ہونے کی امید ہی نہیں۔" پھر بولے تو بے حد بے چارگی سے۔

"ڈیڈی... ایسے کاموں میں اختیار چلتا ہی کہاں ہے!" ذکا اب ہلکا پھلکا ہوچکا تھا۔

"بیٹا جی! پھر رزلٹ کے لیے بھی تیار ہو۔ جو زیرو پرسنٹ بھی تمہارے اختیار میں نہیں۔"

"ہو کیئرز... آپ ہیں نا" ذکا کو ان سے کچھ زیادہ ہی امید ہو چلی تھی۔

جلال صاحب "آپ ہیں نا" سن کر سر نیہوڑا کر بیٹھ گئے۔



ڈرائنگ روم میں زیادہ کھانے کا مقابلہ جاری تھا۔ رشتے کے لیے آئی لڑکے کی ماں' بہن' بھابھی اور رشتہ لانے والی نادرہ۔

منہ میں جاتے نوالوں کی رفتار نانی کی آنکھیں پھیلانے کا سبب بن رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ۔" کھانے کا دورانیہ نہ جانے کتنا طویل ہونا تھا۔ نانی نے ہی گفتگو کا آغاز کرڈالا۔

"بہت خوب صورت بہت ملنسار ہے میری نواسی۔" اس تعریفی جملے نے مامی کو آگ لگادی۔

"ایسی سگھڑ... ایسی سلیقہ مند کہ مثال نہیں۔"

مامی پانی پی رہی تھیں۔ پیتے پیتے اچھو لگ گیا۔ نانی مامی کی پروا کیے بغیر کسی سبق کی طرح اسوہ کا پہاڑہ پڑھنے میں لگی رہیں۔

"بہت سیدھی سادی' نیک شریف ہے میری اسوہ۔ زمانے کی چالاکیوں سے پاک... سچ کہوں جو دیکھتا ہے۔"

"دمکرے پڑجاتے ہیں اس کی آنکھوں میں۔" مامی نے نانی کی بات کاٹی' مگر بولیں اس والیوم کے ساتھ کہ صرف نانی ہی سن سکیں۔

"ماشاللہ... ماشاللہ۔" لڑکے کی ماں نے ڈکار کے بعد تعریفوں کا جواب دیا۔

"اماں! اتنے جھوٹ بولیں جتنے لے جاسکیں۔" نانی کو پھر سے الرٹ ہوتا دیکھ کر مامی نے سرگوشی میں کہا۔ "قبر میں۔" یہ منہ میں کہا تھا۔ مگر نانی کی تیز سماعتوں نے فوراً" پکڑلیا۔

بھنویں سکوڑ کر انہوں نے مامی کو گھورا تھا' جو کہہ کر معصوم بن بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم۔" ڈرائنگ روم کی فضا میں سریلی سی آواز میں کیے گئے سلام نے مہمان خواتین کو فوراً" متوجہ کیا۔ اول جلول سے حلیے میں' ناک پر نظر کا موٹے شیشوں اور پرانے زمانے کے کالے فریم والا چشمہ لگائے... مسکراتی ہوئی ثوبیہ مہمان خواتین کے رنگ فق کرگئی۔

"وعلیکم... وعلیکم..." صرف بڑی بی کا حوصلہ ہوا سلام کا جواب دینے کا۔ وہ بھی مری ہوئی آواز میں مارے باندھے۔

"ماں جی.... یہ.... یہ آپ کی نواسی ہے؟" مامی کے پہلو میں بیٹھتی بیٹھتی ثوبیہ پھر سے کھڑی ہو گئی۔

تیکھے تیور بنا کر سوال پوچھنے والی کو دیکھا۔ جو شاید لڑکے کی بہن تھی، اور ثوبیہ کو دیکھ کر سرتاپا مایوس ہو بیٹھی تھی۔

"یہ پوتی ہے میری۔" نانی کے لہجے میں پوتی کے لیے حلاوت ہی حلاوت تھی۔

"آپ کی نواسی بھی اتنی ہی سیدھی سادی ہے؟" بہن کی فکر نے نیا رنگ بدلا۔

ثوبیہ کے ساتھ ساتھ مامی بھی بدمزہ ہو گئیں۔ ثوبیہ کے حسن کے بارے میں وہ قطعی خوش گمان نہیں تھیں، مگر یوں منہ پر ہی ثوبیہ کو دیکھ کر ایسے جملے کہتا تو دل میں چبھن ہی چبھن ہوتی تھی۔

"بیٹا! کس نمبر کی عینک لگی ہے؟" آپ کے بڑی بی نے ثوبیہ کی گوشمالی کا ذمہ اٹھایا۔ گو کہ لہجہ شیریں تھا۔ مگر سوال قطعی اذیت بھرا۔

"آخری نمبر کی۔" ثوبیہ نے ہر ممکن حد تک رکھائی برتی اور پاؤں پٹختی واپس ہولی۔

چند لمحوں کے لیے تو نانی اور مامی دونوں چپ سی ہو بیٹھیں۔ ثوبیہ کے متعلق اپنوں بیگانوں کے یہ مایوس کن اور تمسخرانہ رویے اندر کہیں چھید ڈال دیتے تھے۔

"آ... اسوہ آئی نہیں ابھی تک۔ بلائیں نا اسوہ کو۔" نادرہ نے ہی اپنی پاٹ دار آواز کا جادو جگا کر نانی اور مامی کی اداسی بھگانا چاہی۔

"زلزلہ جب آتا ہے بغیر اطلاع کے آتا ہے۔" مامی نے خاص الخاص نانی کو سنایا تھا اور پھر واقعی زلزلہ آ بھی گیا۔

"آداب...."

ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اس ادا سے کہا کہ امراؤ جان دیکھتی تو وہ بھی غش کھا جاتی۔ ابھی تو مہمان خواتین کے ساتھ ساتھ نانی اور نادرہ بھی غش کھانے کی حالت میں آگئیں۔

مامی البتہ خون کے گھونٹ پی رہی تھیں۔ یہ لڑکی آج بھی انہیں ہاتھ دکھا گئی تھی۔ تیل میں چپڑے بال دو چوٹیوں میں کسے تھے۔ کاجل کی دھاریں کانوں کو چھو رہی تھیں۔ ہونٹوں پر اورنج رنگ کی لپ اسٹک اور کپڑوں کے رنگ ایسے کہ انڈیا کا جھنڈا بھی شرما جائے دیکھ کر نادرہ کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے لگے۔

"آ... آپ دونوں ذرا میرے ساتھ آئیں۔" نانی اور مامی کو آہستگی سے کہتی نادرہ کھڑی ہو گئی۔ نامعلوم اکیلے میں کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

"تیل میں غوطے لگانا ایسا ضروری تھا کیا؟" نادرہ کے پیچھے جاتے مامی اسوہ کے کام میں صور پھونکنا نہ بھولیں۔

اسوہ کے چہرے کا رنگ لمحہ بھر کو بدلا... پھر نا بیناؤں کی طرح ہاتھ مارتی صوفے پر جا بیٹھی۔ لڑکے والیاں کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کی تفسیر لگ رہی تھیں۔

"بیٹی...." بڑی بی نے سوکھا حلق تر کر کے ایک آس سے پوچھا۔ "لگتا ہے تم اپنا نظر کا چشمہ لگانا بھول گئیں؟"

اسوہ کے چہرے پر تاریک سائے دوڑنے لگے۔ ہونقوں جیسی مسکراہٹ کا فوراً" گلا گھونٹنے کے بعد بولی۔

"چشمہ؟" لہجے میں شدید ترین حیرانی تھی۔ پھر درد کی تصویر بنتے ہوئے افسردگی سے گویا ہوئی۔ "آنٹی .... زخم مت کریدیں .... یہ آنکھیں ...." اتنا کہہ کر ہونٹ پھڑپھڑائے ساتھ کی ہیروئن کو بھی مات دیتی اداکاری۔ اس زمانے میں ہوتی تو نشو کی ہم پلہ ہوتی۔ "مم.... میں.... پیدائشی نابینا۔"

.... آگے آنسوؤں کے گولے نے بولنے ہی نہیں دیا۔ سننے والیوں کی برداشت نے بھی اتنا ہی ساتھ دیا۔

"نادرہ نے اتنا بڑا جھوٹ بولا؟" لڑکے کی بہن جل کلس رہی تھی۔

"چلیے امی!" بھابھی نے اٹھنے میں دیر نہ لگائی۔

"اس کی نانی اور مامی کو تو آنے دو۔" بڑی بی میں کچھ

مروت باقی تھی۔
"بس چلیں۔" بھابھی تڑخ کر بولیں' بڑی بی کو اٹھنا پڑا۔
"آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" اسوہ نے آنکھیں پٹ پٹا کر مصنوعی گھبراہٹ طاری کی۔
"ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ باہر بورڈ لگا دو اندھوں کے لیے رشتے درکار ہیں کا۔ تاکہ ہم جیسے معصوم بچ جائیں۔"
بھابھی کچھ زیادہ ہی ہرٹ ہوئی تھیں۔ اسوہ نے ٹامک ٹوئیاں مارنا بدستور جاری رکھا۔
"سارا خاندان نابینا ہے۔ پوتی کو آخری نمبر کے کھوجے لگتے ہیں۔ نواسی سرے سے بے دید۔" اسوہ کے بوکھلا کر کھڑے ہونے تک تینوں خواتین رخصت ہو چکی تھیں۔ اسوہ سیٹی بجاتی صوفے پر ڈھے گئی۔
"اب بچی۔ جو تیل سر پہ لگایا ہے' اس کی مالش بھی کرے۔ مامی سے لتر بھی تو کھانے ہیں۔"
سموسے پر چٹنی انڈیلتے ہوئے اس نے چٹخارا یوں لیا جیسے لتر کی جگہ بھی سموسے ہی کھانے ہوں۔

☼ ☼ ☼

رات تک مامی کا فشار خون آخری ڈگری تک پہنچ گیا۔ اسوہ کمرے سے کھانے کے لیے بھی نہیں نکلی تو مامی' ماموں سمیت نانی اور اس کے مشترکہ کمرے میں جا گھسیں۔ جب تک اس کی اس حرکت پر برا بھلا نہیں کہنا تھا مامی کو سکون کیسے مل سکتا تھا۔
ذکا اور ثوبیہ بھی پیچھے بھاگے تھے' نانی وہاں پہلے سے ہی اسوہ کی کلاس لگائے بیٹھی تھیں۔
"میں کہتی ہوں ابھی بھی وقت ہے' کچھ سیکھ سمجھ لو۔" نانی سنجیدہ بھی تھیں اور آزردہ بھی۔ "یہ جو تم نے آج کیا ہے؟"
"آج کہاں؟" مامی زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ بالخصوص جب اسوہ کو ڈانٹنے کا معاملہ ہو۔
"پچھلے تین مہینوں سے یہ تماشا ہو رہا ہے۔"
"آہستہ آہستہ۔ آرام سے۔" ذکا کی بے چینی کو ماموں نے زبان دی تھی۔ مامی نے ہونٹ سکوڑ لیے۔
"شریف اور تمیزدار لڑکیوں کے یہ وطیرے نہیں ہوتے۔" نانی کو آج شاید بہت دکھ پہنچا تھا۔
"ہونہہ شریف اور تمیزدار ....." مامی نے تمسخرانہ ہنکارا بھرا تھا۔ وہ جو پچھلے کئی گھنٹوں سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس ایک ہنکارے پر غیرت میں آگئی۔
"وطیرے!" جھٹ سر اٹھا کر حیرت سے پوچھا۔ آنکھوں میں شرارت بھری تھی۔
"ہاں۔ چھن۔" نانی اپنی دھن میں ہی تھیں۔
"لچھن؟" اسوہ نے ابھی بھی نافہم انداز سے سر ہلایا۔
"اوہو!" نانی جی بھر کر زچ ہوئیں۔
"کیوں بھینس کے آگے بین بجا رہی ہیں۔" مامی کی تمسخرانہ نظریں اسوہ پر تھیں۔ "یہ سدھرنے والی مخلوق نہیں۔" مامی کا لہجہ بہت توہین آمیز تھا۔ اسوہ کو اندر کہیں شدید درد ہوا۔
"نانی!" مگر اندر کا کرب چہرے سے عیاں کرنے کی وہ عادی نہیں تھی۔ ابھی بھی بھولپن سے بولی۔
"سلیس اردو میں سمجھائیں نا۔ اشفاق احمد والی اردو بولیں گی تو میں خاک سمجھ پاؤں گی؟"
"بس بخشو مجھے۔ میرا مغز اتنا ہی کام کرتا تھا۔" نانی کچھ زیادہ ہی تنگ آگئی تھیں۔
"اچھا کوئی بات نہیں۔ ہو جاتا ہے ایسا۔" ماموں سے بھانجی کے چہرے کے پھیکے رنگ چھپے نہ رہ سکے۔ پڑھ تو انہیں ذکا بھی رہا تھا مگر مامی کے سامنے بولنا اپنی شامت آپ بلانے کے مترادف تھا۔
"میری بھانجی کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ رشتے بہت۔"
"کمال کرتے ہیں آپ؟" ماموں کی حمایت پر مامی اور زیادہ بھڑکیں۔
"ناک کٹوا دی اس نے۔ آپ۔؟"

"یہ آپ لوگوں کی کتھا پتا نہیں کب ختم ہو گی؟"
مامی کی بات پر اب کے ثوبیہ نے حملہ کیا تھا۔ "سونے جا رہی ہوں میں۔۔۔ گڈ نائٹ۔"

ثوبیہ کو گھر کی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی کتابوں میں گم رہتی تھی۔

"کبھی ایسا کہیں دیکھا یا سنا کہ لڑکیاں گھر آئی خوش بختی کو باہر دھکیل دیں۔" اسوہ کی پیشی اتنی جلدی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ثوبیہ کے جانے کے بعد مامی پھر سے فارم میں آئیں۔

"تمہارے گھر ایسا ہوا۔۔۔ اور ساری دنیا نے دیکھا' دسواں رشتہ ہے جو اس کی بے ہودگیوں کی نذر ہو رہا ہے۔"

"اٹس اوکے مما۔۔۔! ہو گئی غلطی۔۔۔ اب" کب سے پہلو بدلتے ذکا کے منہ سے بھی اسوہ کی حمایت میں کچھ نکل ہی گیا۔ یعنی ایک غلطی کی صفائی پیش کرنے میں وہ خود غلطی کر بیٹھا تھا۔

"تم چپ رہو" اتنا سخت لہجہ تھا مامی کا ـــــ کہ ذکا کو واقعی چپ لگ گئی۔ اسوہ نے ہونٹ بھینچ کر ذکا کو دیکھا تھا۔

"ارے ایک کی سو بنا کر نادرہ کہاں کہاں نہیں یہ بات پہنچائی جائے گی۔ دیکھ لیجئے گا۔ سارا شہر طعنے دے گا۔ جلال الدین اکبر کی بھانجی ایسی' جلال الدین اکبر کی بھانجی ویسی۔۔۔" مامی نے ہاتھ نچا نچا کر ساری اپنی اداکارانہ صلاحیتیں دکھا ڈالیں۔

اسوہ کو جمائیاں آنے لگی تھیں۔ ماموں کے آثار بھی نیند بھرے ہو رہے تھے۔

"اماں۔۔۔" بیوی کی چپ کو غنیمت جان کر وہ بے بسی سے بولے۔ "میری طرح آپ کا بھی سر درد کر رہا ہے نا۔"

مامی نے ہونٹ بھینچ کر ضبط کیا تھا۔ ماموں ماں کا آسرا پا کر شیر ہو جاتے تھے۔

"تمہاری بیوی بولے گی تو سر تو درد کرے گا ہی۔"
نانی کو تو موقع چاہیے ہوتا تھا بہو کی شان میں سنانے کا۔

"ان ہی باتوں نے اس کو شہ دے رکھی ہے۔" مامی نے تیر مار کر نظریں اسوہ پہ گاڑیں۔

"میری باتیں میرے منہ پر مار کر اس کی اور ہمت بندھائیں۔ میں بیچ میں آنے والی کون؟" اگلے پل تن فن کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

نانی اور ماموں کے چہرے پر بیک وقت سکون چھایا۔ موقع غنیمت تھا۔ فائدہ اٹھاتے ہوئے ذکا نے بھی ہمدردی کے دو بول اسوہ سے کہنے ہی چاہے تھے کہ مامی آندھی کی طرح پھر کمرے میں جلوہ گر ہوئیں۔ ذکا کا منہ جتنا کھلا تھا۔ اتنا کھلا ہی رہ گیا۔

"ذکا۔۔۔"

"جی مما!" ذکا نے ریموٹ کنٹرولڈ الفاظ نکالے۔

"چلو اپنے کمرے میں۔۔۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

"مم۔۔۔ میں آ ہی رہا تھا۔" وہ منمنایا تھا۔ اسوہ سپاٹ نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

"تم چلو میرے ساتھ۔۔۔ صبح آفس جانا ہے تم نے" مامی نے اسے اٹھا کر دم لیا۔ بے چاری سی شکل بنائے وہ مامی کے ہمراہ ہوا تھا۔ اسوہ کی نظریں دروازے تک اس کے تعاقب میں گئیں۔

"منا ماں کی لوری کے بغیر سو ہی نہیں سکتا۔" بڑبڑائی تو وہ اپنے آپ سے تھی۔ مگر اندر کہیں بھانبھڑ سے جلنے لگے تھے کہ آواز کا والیوم خود بخود اونچا ہو گیا۔ ماموں اور نانی نے بیک وقت ہنکارا بھرا تھا۔ ماموں نے احتیاطاً" اور نانی نے تنبیہاً۔



نانی اپنے بستر پر حسب عادت و معمول کسی ورد میں مشغول تھیں۔ وال کلاک نے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ واش روم کا دروازہ ابھی بھی بند تھا۔

"نہ جانے کون سے اسم پڑھ رہی ہے اندر؟" انہیں ہلکی سی بے چینی نے گھیرا۔

"مامی نے تاک تاک کر میری ذات پر حملے کیے

ہیں۔" ہر ممکن حد تک آواز نیچی کر کے اس نے دکھڑا رویا تھا۔

"میں نے نہیں کہا تھا مجھ سے محبت کرو۔" دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا کہ وہ پھر سی گئی۔

"اور پھر میرے سامنے اظہار بھی کرو..... اور مجھے مجبور بھی کرو کہ میں تم سے محبت کروں' جو کہ میں نے کرلی..." آخری جملہ اس نے انتہائی رونکھی اور مسکین شکل بنا کر کہا تھا۔ جیسے محبت نہ ہوئی اسکول کا امتحان ہو گیا۔ جسے ہر صورت پاس کرنا ہی کرنا ہے۔

"پچھتاؤں نہ تو کیا تمہیں تمغے پہناؤں۔" جس طرح بھڑک کر وہ غرائی تھی۔ دوسری طرف موجود ہستی ضرور پچھتائی ہو گی۔

"دیکھو.... میرے سامنے سلطان راہی بننے کی ضرورت نہیں.... مجھے تمہاری بڑھکیں نہیں چاہئیں... میری مامی کے سامنے سلطان راہی بن کر دکھانا۔" بہت چمک کر اس نے وہ کام کرنے کو کہا جو خود اس کے بھی بس سے باہر تھا۔

"جانتی ہوں...." اب کے ہونٹ لٹک گئے' آواز زیادہ چست ہو گئی۔ "سو چنگیز خان مرے ہوں گے تب میری مامی پیدا ہوئی ہوں گی۔" دوسری طرف کی بات نانی کی پکار تلے دب گئی۔

"اسوہ... اے بچی...! غسل خانے میں ہی سو گئیں کیا؟" آواز سے لگ رہا تھا نانی دروازے پر کھڑی ہیں۔

"دو سیکنڈ" کہہ کر ہلکا سا دروازہ کھول کر جھانکا۔ نانی دروازے پر تو نہیں تھیں مگر پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا بے چینی سے غسل خانہ فارغ ہونے کی منتظر ہیں۔

اسوہ نے جھپاک سے سر اندر ڈالا اور "بند کرتی ہوں" کہہ کر موبائل آف کر کے بغل میں دبا لیا۔

"باہر نکل آ... مجھ غریب کو کیوں سزا دے رکھی ہے؟" اسوہ نے سر جھکا کر باہر کا رستہ ناپا تھا۔



رات کو کب سویا جائے' یہ تو اپنے اختیار میں تھا۔ مگر صبح کس وقت ہونی چاہیے...؟ یہ اختیار مامی نے چھین لیا تھا' ہفتہ بھر سے وہ صبح بہ وقت تمام سات بجے تک اٹھنے لگی تھی۔ مامی کے نزدیک اس کے اس جلدی جاگ جانے کی بھی کوئی وقعت نہیں تھی کہ ماتھے پر شکنوں کا جال مزید گنجلک ہونے لگتا تھا اسے دیکھ کر۔

ابھی بھی بمشکل بستر چھوڑ کر چند چھینٹے چہرے پر مار کر وہ قدم گھسیٹتی لاؤنج سے گزر رہی تھی جب جاگنگ سے لوٹتے ذکا سے ٹکرا گئی۔ ذکا نے کندھوں سے پکڑ کر اسے دور کیا تھا۔ وہ ابھی بھی نیند میں جھول رہی تھی۔

سر جھٹک کر اس نے دائیں طرف سے نکل جانا چاہا ذکا دائیں طرف ہو گیا' بائیں طرف ہوئی تو ذکا بائیں طرف سے سامنے تھا۔ ذکا کی شرارت سمجھ کر وہ جس طرح جھنجلائی۔ نیند کا خمار تک اڑن چھو ہو چکا تھا۔

"مسئلہ کیا ہے... نشے میں ہو؟" ایک جگہ ٹھہر کر نہایت سنجیدگی سے سوال داغا۔

"حلیہ تو تمہارا لگ رہا ہے۔" ذکا نے برجستگی سے شوخ دکھائی۔

"ڈن تو تم لگ رہے ہو۔" لفظوں کے کھیل میں اس سے جیتنا مشکل تھا۔ ابھی بھی ذکا نے گہری سانس لی تھی۔

"مجھ سے جب بھی بولنا... شیطانی جملے ہی بولنا... کبھی خیر کی بات بھی کر لیا کرو۔"

"صبح صبح آکر میرے سامنے ڈولنا شروع ہو جاؤ گے تو میں یہی سمجھوں گی نا" ذکا کی خفگی کا اثر لیے بنا وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

"مائی گاڈ" ذکا نے بے ساختہ اوپر نظریں دوڑائیں۔

"گلے تو تم ملنے لگی تھیں.... ڈولنے کا الزام مجھ پر۔"

"ذکا" اسوہ نے آگے کون سا شیطانی جملہ بولنا تھا... سننے کی نوبت نہ آسکی۔ مامی کی گرجتی پکار کہیں

ترتیب سے ہی ابھری۔

ذکا حسب عادت لرز کر سیدھا ہوا۔ یہ ٹاکرا مہنگا پڑ سکتا تھا۔

"انوکھے لاڈلے ۔۔۔ جاؤ فیڈر پیو ۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔" اسوہ کے پچکارنے میں تمسخر تھا۔

"مما! میں جارہا تھا چینج کرنے۔" پیچھے کھڑی مامی کے سامنے منمنانے کے بعد اسوہ پہ ایک نگاہ غلط ڈالنے کی غلطی کیے بنا وہ سیڑھیاں ایک جست میں چڑھ گیا تھا۔

مامی، اسوہ کو بھنویں سکوڑ کر دیکھتی ڈائننگ ہال میں داخل ہوئیں۔ پیچھے وہ بھی تھی، ثوبیہ ڈائننگ ٹیبل کے گرد چیئر گھسیٹے چائے سڑک رہی تھی۔

"آج یونیورسٹی نہیں جارہی ہو؟" ثوبیہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر وہ پوچھنے لگی۔ ثوبیہ نے کپ پٹخ کر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ اور جواب کی زحمت گوارا کیے بغیر کھڑی ہوگئی۔

"ثوبیہ! اپنی مدحت خالہ کا نمبر تو ملا دو۔۔۔ پوچھو فیضان کب آرہا ہے؟" مامی، ثوبیہ کو خالی کپ اٹھا کر ڈائننگ ہال سے نکلتے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"فیضان صاحب پتا نہیں کون سے فیض لا رہے ہیں۔ مما کا انتظار ہی ختم نہیں ہو رہا۔" ثوبیہ بھی ناگوار بڑبڑاہٹ کے ساتھ مدحت خالہ کا نمبر ملانے چل دی۔

پیچھے وہ کچھ دیر تو ٹیبل پر انگلیوں سے طبلہ بجاتی رہی۔ پھر مامی کی ڈائننگ ہال میں دوبارہ انٹری ہوگئی تو منہ میں بدبدائی کھڑی ہوگئی۔

"کچن میں بیٹھ کر ناشتہ کرنا پڑے گا۔ یہاں موسم خراب ہے۔" مامی کی عقابی نگاہوں نے دروازے تک اسے الوداع کہا تھا۔



بارہ بجنے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔ اسٹور مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف ہلکی سی روشنی ٹمٹمار ہی تھی۔ اور وہ ہلکی سی روشنی اس موبائل اسکرین کی تھی جس پر وہ محو گفتگو تھی۔

کاٹھ کباڑ اور گھر کے فارغ سامان سے بھرا یہ اسٹور آج کل اس کی محبت کی داستان کے لیے معاون بنا ہوا تھا۔ نانی کے وظائف اتنے طویل ہو جاتے تھے کہ اسے جمائیاں آنی شروع ہو جاتیں۔ کال سننے کی ٹینشن الگ ہوتی۔ نتیجتاً" وہ اسٹور میں بارہ ساڑھے بارہ تک آرام سے بات کر کے پھر بستر کی راہ لیتی۔

"بہت ہوگئی ۔۔۔ اب اس تماشے کو ختم ہو جانا چاہیے۔" وہ بستروں کے اوپر بیٹھی تھی۔

"ہاں واقعی میں تھک گئی ہوں۔" آواز میں ناراضی ہی ناراضی تھی۔

"تمہاری محبت نے مجھے خوار ہی کیا ہے۔ محبت ایسی نہیں ہوتی، محبت تو فلموں اور افسانوں جیسی ہوتی ہے۔" اس کی ٹھنڈی آہ نے ٹھنڈے ٹھار اسٹور کو مزید ٹھنڈا کر دیا۔

"میری محبت کی قسمت میں ۔۔۔" برا سا منہ بنا کر موبائل سامنے کر کے ملاحظہ کیا اور پھر کان سے لگا کر تڑخی۔ "یہ سوکھا سڑا موبائل 'رت جگا' اور اپنے کمرے سے خانہ بدوشی لکھی ہے۔" وہ سلگی۔

"اور نہیں تو کیا۔۔۔ کبھی واش روم میں، کبھی بیڈ کے نیچے اور آج کل اس اسٹور میں۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"اپنی محبت کا ثبوت دو اور میری اس خانہ بدوشی سے جان چھڑاؤ۔"

"اب اور کوئی کسر باقی ہے؟ مامی کی نظروں میں نفرت اور نانی کی نظروں میں شک آگیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ ماموں کو بھی شک ہو جائے میری اس واہیات طریقہ محبت کا۔۔۔ تم اپنی کارکردگی دکھاؤ۔" جس وقت وہ کارکردگی دکھانے کا حکم نازل کر رہی تھی۔ عین اسی وقت اسٹور میں کھٹکا سا ہوا۔

"کوئی آرہا ہے۔" فی الفور اس نے موبائل آف کیا تھا۔

اسٹور میں سایہ سا ٹھہرایا۔ اسوہ بستروں میں مزید

دبک گئی۔ سایہ خوامخواہ ادھر ادھر لہراتا رہا۔ ایک طرف کاٹھ کباڑ کو کھڑکھڑایا' دو چار اور جگہوں پر ہاتھ مارے۔

اسوہ دم سادھے پڑی رہی۔

کچھ دیر کے بعد سایہ رخصت ہو گیا تو اس نے سکھ کی سانس لی۔



لاؤنج میں ماموں کو چھوڑ کر باقی سب جمع تھے۔ نادرہ اپنی نئی کارکردگی کے ساتھ جامنی سوٹ اور لپ اسٹک میں جامن بنی آئی بیٹھی تھی۔ نادرہ پر خصوصی توجہ فرمانے کے لیے مامی موجود تھیں۔ نانی' اسوہ اور ذکا ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے تھے' جبکہ نادرہ کی آمد سے ناک تک بے زار ہوئی ثوبیہ کا سر کتاب میں تھا۔

''بس چائے وائے میں نے نہیں پینی۔'' عادت کے مطابق نادرہ نے صرف مامی کے نہیں پورے لاؤنج کے کان بجا ڈالے۔ ''آپ یہ تصویریں دیکھیں اور فائنل کریں۔'' سستے سے چمک دار ہینڈ بیگ میں سے کئی تصویریں برآمد کیں۔

''آج نادرہ صاحبہ بھرے ہوئے معدے کے ساتھ آئی ہیں' کمال ہے۔'' اسوہ ناگواری سے بڑبڑائی۔

نانی بھی نادرہ کے پہلو میں جا بیٹھی تھیں۔ نواسی کی قسمت پھوڑنے کے لیے اگلا چاند کیسا ہے۔ یہ دیکھنا تو ضروری تھا نا!

''مجھے بھی دیکھنی ہیں۔'' ثوبیہ نے بھی کھٹ سے کتاب بند کر کے اشتیاق دکھایا۔

نادرہ جب جب تصویریں لاتی' ثوبیہ ان کا پوسٹ مارٹم ضرور کرتی۔ اب تو مشغلہ سا بنتا جا رہا تھا۔

''دکھا تو ایسے رہی ہے جیسے شہزادہ ولیم کی اٹھا لائی ہو۔'' اسوہ کی بے زاری آج بھی کوئی گل کھلانے والی تھی۔

ذکا نے نادرہ کے جائزے کے بعد بطور خاص اسے بھی دیکھا۔

''اووومم'' پہلی تصویر دیکھ کر ہی ثوبیہ نے کڑوا سا منہ بنا لیا۔

''یہ آدھا گنجم آدھا بالم ہی رہ گیا ہے اسوہ کے لیے؟'' ثوبیہ نے تادیبی نظروں سے نادرہ کو دیکھا تھا۔

''ثوبیہ'' نادرہ مارے صدمے کے بت بن بیٹھی تو مامی کو گھرکنا پڑا۔

تب تک ذکا نے ثوبیہ سے تصویر لے کر آدھے گنجم آدھے بالم کا دیدار کر لیا تھا۔

''یہ تو کوئی مطلوب ڈکیت لگ رہا ہے۔'' ذکا کے تبصرے میں تشویش چھپی تھی۔

''تم تو چپ کرو۔'' مامی بری طرح سے تاؤ کھاتے ہوئے چیخیں۔

''میں تو اس لیے کہہ رہا تھا... کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔'' تصویر ٹیبل پر اچھالتے ہوئے وہ آہستگی سے بولا تھا۔

''ایسا ہوا تو میں موجود ہوں... تم بڑے نہیں ہوا اس گھر کے۔'' اس جھاڑ کے بعد وہ بھی نادرہ کے سامنے سوال ہی نہیں تھا ذکا کا پھر دخل دیتا۔ اترے ہوئے منہ کے ساتھ نانی کے پہلو میں جا بیٹھا۔

''کسی طرح اس نادرہ آوارہ گرد کا کام تمام ہونا چاہیے۔'' نادرہ پر بہت قہر بھری نظریں ڈال کر نانی سرگوشی میں ذکا سے بولی تھیں۔

اسوہ یک ٹک ذکا کے اترے ہوئے چہرے پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ حسب معمول اس کی غیرت غلط موقع پر جاگ اٹھی۔

''مامی... ! ذکا بے شک گھر کا بڑا نہیں ہے۔'' مامی ہی نہیں نادرہ بھی جھٹکا کھا کر اسوہ کی جانب متوجہ ہوئی۔

اسوہ کے تیور خطرناک لگ رہے تھے۔ مامی ان تیوروں کو پہچاننے میں طاق ہو چکی تھیں۔ ابھی بھی گم صم ہو بیٹھیں۔

''مگر شادی میری ہو گی تو مرضی بھی میری چلنی چاہیے۔'' نانی کے تاثرات پرسکون تھے۔ یہی حال ثوبیہ کا تھا۔ ذکا کی گھبراہٹ ہمیشہ والی تھی۔ مامی کی بھنویں ایسے سکڑ گئی تھیں جیسے پنجابی فلموں کا ولن سکوڑ لیتا ہے۔ مگر کر کچھ نہیں پاتا اور نادرہ نے تو بھاڑ

جتنا منہ کھول کر اپنی شخصیت کو مزید تابناکی عطا کردی تھی۔

"اور میں کہہ رہی ہوں... میرا ابھی شادی کا موڈ نہیں۔" اس کا انداز قطعی اور حتمی تھا۔ فیصلہ کن۔

"ہا... ہائے" نادرہ غار کا دھانہ کچھ اور وا ہوا۔

"اور یہ چھمک چھلو رشتے کرانے میں ایسی ہی ماہر ہوتی نا... تو اب تک خود کیوں کنواری پھر رہی ہوتی؟"

اسوہ نے حد کردی تھی۔ نادرہ پر وحشت سوار ہوگئی۔ آنکھیں لبالب بھر گئی تھیں۔

"نزہت باجی" دل سوز پکار میں درد ہی درد تھا۔

"باجی؟" مامی کے کچھ کہنے سے قبل ثوبیہ حیرت و بے یقینی سے چلائی۔

"دیکھیے نادرہ آنٹی!" پھر ہاتھ اٹھا کر سمجھانے کے انداز میں شروع ہوئی کہ نادرہ بلبلا اٹھی۔

"آنٹی؟" یہ دوہرا غم تھا۔ پہلے اسوہ نے اور اب ثوبیہ نے...

"میری امی آپ سے چار پانچ سال چھوٹی ضرور ہیں۔ نادرہ نام رکھ لینے سے فلمی نادرہ مرحومہ نہیں بن گئیں آپ..." نادرہ پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ ثوبیہ تو اسوہ سے بھی آگے نکل گئی۔

"ان کے رشتے ہوتے نظر نہیں آتے... لکھ کر رکھ لیں۔" تصویریں جھپٹ کر پرس میں ٹھونسیں۔

"تیرے منہ میں خاک۔" نانی نے کہا۔

"جارہی ہوں میں' آئندہ کبھی نہیں آؤں گی۔" مامی بدحواس ہو کر نادرہ کے پیچھے لپکیں۔

"بچیاں ہیں' اپنا سمجھ کر مذاق کررہی تھیں۔"

"مذاق نہیں کررہی تھیں' تیر چھوڑ رہی تھیں۔" نادرہ ایک پل کو نہ رکی۔

مامی سر پکڑتی صوفے پر گر سی گئیں۔ اب توپ کا منہ یقینی طور پر اسوہ اور ثوبیہ پہ کھلنا تھا۔ ذکا مامی کے پہلو میں جا بیٹھا۔

"خس کم جہاں پاک۔" نانی بڑے اطمینان سے منہ میں بدبدائی تھیں۔ زور سے کہنے کا حوصلہ نہیں تھا پھر اسوہ اور ثوبیہ کے ساتھ وہ بھی لپیٹ میں آجاتیں۔

"جانے دیں نا امی!" ذکا نے مامی کے گرد بازو پھیلا کر دلاسا دینا چاہا۔

"یک نہ شد دو شد۔" مامی نے دانت کچکچائے تھے۔

ثوبیہ نے کتاب منہ کے آگے کرلی۔ اور اسوہ نے منہ ٹی وی کے آگے۔

"ایک کافی نہیں تھی میرا خون جلانے کے لیے... جو یہ دوسری بھی پیدا ہوگئی۔"



کچھ کسی کے دیے طعنوں کا اثر تھا اور کچھ اپنے دل نے بھی غیرت دلائی تھی کہ اس شام جی کڑا کرکے وہ مامی کے حضور پہنچ گیا۔ کھلے دروازے سے جھانکا' مامی وارڈروب کھنگال رہی تھیں۔

"مما! آجاؤں" مامی چونک کر دروازے کی جانب متوجہ ہوئیں۔ اور پھر مسکرادیں۔

"ہاں... پوچھ کیوں رہے ہو؟"

"عادت ہے نا... بچپن کی۔" وہ سر کھجاتا' جھجکتا' لرزتا مامی کے قریب پہنچ گیا۔ مامی ہنوز مصروف رہیں۔

"بزی ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں۔" وارڈروب کے اندر سے آواز آئی تھی۔ یعنی ابھی مامی کا ارادہ سر باہر نکالنے کا نہیں تھا۔

ذکا بیڈ پر بیٹھ کر اضطرابی کیفیت میں انگلیاں مروڑنے لگا۔ آ تو گیا تھا مگر اب ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ قدرے تاخیر سے مامی نے رخ پلٹا تو ذکا کو دیکھتے ہی ٹھٹکیں۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری' پیلے پیلے سے لگ رہے ہو؟" باقی کے کپڑے پھر کسی وقت ترتیب دینے کا سوچتی وہ ذکا کے پاس آئیں۔ قریب بیٹھ کر تشویش سے اس کا ماتھا چھوا۔

"بات ہی ایسی ہے کہ پیلا پڑنا ہی تھا۔" یہ جملہ منہ ہی منہ میں کہہ کر اندر اتار لیا۔

"کیا کہہ رہے ہو۔ اونچا بولو۔" مامی نے بھنویں سکوڑلیں۔ ذکا کچھ اور گھبرایا۔

"مما...! وہ..." اب ہمت جواب دینے لگی تھی۔

"مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہے ہو" اس کے ٹھنڈے ٹھار ہاتھوں کو پکڑ کر مامی نے کچھ اور تفکر دکھایا۔

"مام! فار گاڈ سیک" ایک تو بات نہ کرسکنے کا غم... اوپر سے مامی کی یہ بلاوجہ کی فکر۔ وہ جھلا ہی گیا۔ "بڑا ہوگیا ہوں میں... مجھے اب بیماریوں' دوائیوں سے ہٹ کر ڈیل کریں۔"

"چل ہٹ... دسویں تک تو میرے ساتھ سوتے آئے ہو۔" مامی کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

ذکا کے کندھے ڈھلک گئے... مامی بھی کمال تھیں۔ وہ جس مقصد کے لیے آیا تھا۔ اس مقصد کی راہ میں جذباتی روڑے اٹکائے جارہی تھیں انجانے میں۔

"اور تم جتنے بھی بڑے ہو جاؤ' میرے لیے بچے ہی رہو گے..."

"مم... مگر میری بات سن لیں۔" قدرے توقف کے بعد نڈر بننے کی طرف پہلا قدم اٹھایا تو مامی مسکرا دیں۔

"اچھا۔ سناؤ۔"

"جیسا کہ آپ جانتی ہیں۔" اسٹائل خالصتاً "موسم کا حال بیان کرنے جیسا تھا۔ "میں اب اتنا بڑا ہوگیا ہوں کہ کافی سارے کام خود کرنے کے ساتھ ساتھ آفس بھی جانے لگا ہوں۔" سن کر مامی نے صرف تالیاں نہیں بجائیں۔ باقی ستائشی تاثرات سے خوب نوازا۔

"تو... مطلب... جیسا کہ۔" ایک ٹرانس کے عالم میں جوتوں کو مرکز نگاہ بنائے وہ کہتا چلا گیا۔

"سنتے آئے ہیں بچپن سے کہ..." حلق خشک ترین ہو رہا تھا۔ تھوک نگلنا پڑ گیا یہاں آکر۔

"مطلب... نوکری اور شا... شادی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے تو... تو..."

"تو میرا بیٹا..." مامی کو ترس آگیا تھا کان مروڑ کر مصنوعی سختی سے گویا ہوئیں۔ "نوکری والا ہو کر شادی کے قابل ہوگیا ہے۔" ذکا نے یوں سانس باہر نکالی جیسے پل صراط عبور کرلیا ہو۔

"تو... آپ سمجھ گئیں؟" چہرے کی رونق' آواز کی کھنک سب لوٹ آئی تھی۔ بے یقینی سے پوچھا تو ماں کا قہقہہ بلند ہوگیا۔

"ہاں میں سمجھ گئی..." ذکا کا گال تھپک کر آگے بولیں "کل ہی بلواتی ہوں نادرہ کو؟" ذکا کی خوشی فی الفور کافور ہوئی۔

"نادرہ آنٹی کو کیوں؟" بھنچی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا تو مامی نے چپت رسید کردی۔

"بھئی لڑکی نہیں ڈھونڈنی کیا؟"

"وہ تو میں نے ڈھونڈلی۔" اس نے کہنے میں ایسی عجلت دکھائی جیسے آج نہیں تو پھر شاید کبھی نہیں۔

"ڈھونڈلی۔" اب کے پھنسی ہوئی آواز مامی کی برآمد ہوئی۔ دیر تک صدمے سے ساکت رہیں۔

"جی" سر جھکا کر اعتراف جرم کیا گیا۔

"کون ہے؟" وہ جان دار ممتا بھری خوشبو لٹاتا لہجہ کرخت ہوگیا تھا۔

"وہ..." مامی سانس روکے ہوئے تھیں۔ نام بتاتے ہوئے ذکا پر لرزہ ساطاری ہونے لگا۔



طوفان کبھی پوچھ کر نہیں آیا کرتے...

پورے دھیان سے "ٹائی ٹینک" فلم میں کھوئی نانی اور اسوہ کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ طوفان آیا چاہتا ہے۔

"یہ کوئی ہیروئن ہے؟" اسوہ کا ارتکاز نانی کی اس بے زاری نے توڑا۔ اسوہ نے ہونٹ لٹکالیے تھے۔

نانی چپ کر کے کوئی فلم پوری دیکھ لیں۔ امید بیکار تھی۔

"قسم سے میں نے نہیں بنائی" اسوہ رو دینے کو آگئی۔

نانی جز بز سی دوبارہ خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہوئیں۔

"اماں لگ رہی ہے اس معصوم کی۔" اسوہ کی بے چارگی دوچند ہو گئی۔

نانی کی زبان سے ہیروئن کو فلم ختم ہونے تک پٹنا تھا۔ یہ تو طے تھا۔

"ہماری انجمن کا کیا قصور تھا اگر وہ موٹی ہو کر ہیروئن آ رہی تھی!!"

نانی انجمن کے جوان دور کے حسن کی پرستار تھیں۔ اب لگے ہاتھوں انجمن کی خوبیاں بیان ہونی تھیں۔ اسوہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھ گئی۔

"حضرات!" نانی کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھیں کہ ثوبیہ پھولے سانسوں کے ساتھ بھاگتی آئی۔

"ایک اور آ گئی... بقراط۔" اسوہ ناک تک بے زار ہوتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔

"حضرات نہیں خواتین... بلکہ گرلز بولو۔" منہ بنا کر وہ چیخی۔

"او کے... جو بھی۔" ثوبیہ کو جلدی تھی "اس وقت کی تازہ خبر... نادرہ آنٹی آئی بیٹھی ہیں۔"

"ہائیں پھر آ گئی؟" اسوہ پر حیرت، جھنجلاہٹ، بے یقینی ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔

"ناک نہیں ہے کم بخت کی۔ پھر آ ٹپکی۔" نانی کو بھی یہ تازہ خبر بدمزہ کر گئی۔

"ہاں... اور آج وہ مما کے کمرے میں بیٹھی ہیں۔" ثوبیہ خبرنامہ نشر کر رہی تھی۔ جوش اور ولولے کے ساتھ۔

"یعنی حفاظتی بند... وہ بھی ہم سے بچنے کے لیے" اسوہ کو غصہ بھی آ گیا۔

"اور میں نے خود دیکھا ہے۔" ثوبیہ نے عینک کے پیچھے سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو مزید پھیلا کر سنسنی پھیلائی۔

"وہ لڑکیوں کی تصویریں مما کو دکھا رہی ہیں۔"

"میرے لیے؟" اسوہ کی پریشانی بے ساختہ تھی۔

نانی بھی حق دق سی ہو بیٹھی تھیں۔

"ڈفر... بھائی کے لیے۔" بتا کر ثوبیہ جن قدموں پر آئی تھی۔ ان ہی قدموں پر واپس لوٹ گئی۔

اسوہ اور نانی نے بس ایک پل کے لیے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں۔ اگلے پل دونوں ثوبیہ کی طرح مامی کے بیڈ روم کے بند دروازے سے چپکی کھڑی تھیں۔

"یہ والی ڈاکٹر... یہ جو کترینہ کیف جیسی لگ رہی ہے... بہت امیر باپ کی بیٹی ہے۔ سچی کہہ رہی ہوں، جہیز میں بنگلے گاڑیاں..."

"بس ٹھیک ہے... پھر یہیں بات چلا کر دیکھو۔ میرا زکا بھی کم نہیں۔ سلمان خان سے آگے ہی ہے۔"

مامی اور نادرہ کے مکالمے سننے میں قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ چند لمحوں کے بعد کسی دھماکے کی طرح دروازہ کھلا۔ نانی، ثوبیہ، اسوہ یہاں وہاں لڑکھڑا گئیں۔ ناگہانی آفت کی طرح نادرہ کمرے سے باہر نازل ہوئی۔ گردن اکڑا کر تینوں کو دیکھتی، اونچی ہیل کی ٹک ٹک بجاتی ان کے آگے سے گزر گئی۔



جلے پیر کی بلی بنی وہ پورے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ نہ جانے کون سی پریشانی تھی جو نانی کے بارہا پوچھنے پر انہیں بھی نہیں بتا پا رہی تھی۔ اس کی ہلدی ہوئی رنگت اور خالی ویران ہوتی آنکھیں نانی کو اتنا ہولا گئیں کہ معمول کے ورد بھی ان سے پڑھے نہ گئے۔

"اے بچی کیا آفت آ گئی؟ تمہیں دیکھ کر مجھے چکر آنے لگے ہیں۔" کچھ زچ سی ہو کر نانی نے ماتھا پکڑ لیا۔

"نانی! بات نہ کریں۔" ہنوز ٹہلتے ہوئے وہ روکھی آواز میں بولی تو نانی ناچار چپ ہو گئیں۔ لیکن دل ابھی بھی اسوہ کے زرد چہرے پر اٹکا ہوا تھا۔

کافی دیر کے بعد تھک ہار کر وہ خود نانی کے سامنے آ بیٹھی۔ نانی کو اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے برسوں کی تھکن سے بے حال ستانے کی آس لے کر ان کے پاس آئی ہو۔

"نانی!" بولی تو آواز کی رنجیدگی نانی کو تڑپا گئی۔
"بول میری چاند!"
"نانی۔۔۔! آ۔۔۔ آپ۔۔۔" اسوہ کی۔ آنکھوں میں نمی ہلکورے لے رہی تھی۔ نانی کا دل سکڑ گیا۔
"آپ میری ماں ہیں نا!!!" گلوگیر لہجے میں وہ نہ جانے کیوں اتنی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔
"ہاں۔۔۔ پوچھنے کی بات ہے؟" نانی بھی بہت پیچھے ماضی کے کسی گم گشتہ منظر میں کھو کر اداس ہو گئی تھیں۔ "پیدا نہیں کیا، پالا تو ہے تجھے۔"
"پھر جان لیں نا۔۔۔" اسوہ نے نانی کے دونوں ہاتھ تھام کر کسی قدر منت سے کہا۔
نانی دم بخود سی اس کی حالت دیکھنے لگیں۔ وہ یوں رو رہی تھی جیسے زندگی کا سب سے بڑا نقصان آج ہونے جا رہا ہو۔ "پلیز۔۔۔ پلیز" نم لہجے میں آس و امید کا جہاں آباد تھا۔
نانی تادیر اسے حیرت سے دیکھتی رہیں۔ پھر بے ساختہ گلے سے بھینچ لیا۔ اسوہ کی سسکیوں کا ساتھ نانی کے آنسو دے رہے تھے۔
"مامی! مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟" نانی کے نرم گرم وجود میں چھپی وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔
"نفرت تو نہیں کرتی۔" نانی بے حد محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔
"میں اتنی بھی بری نہیں ہوں۔"
"تم بالکل بھی بری نہیں ہو۔" نانی نے اس کے سر پر ہونٹ رکھ دیے تھے۔



رات کا دوسرا پہر تھا۔ نانی اپنے بستر پر گہری نیند میں تھیں جبکہ وہ اپنے بیڈ پر کمبل میں دبکی موبائل کان سے لگائے زخمی شیرنی بنی ہوئی تھی۔
"میرا بس نہیں چل رہا میں تمہارا خون پی جاؤں اور تم ملنے کی بات کر رہے ہو۔" غصے کی شدت سے بولا نہیں جا رہا تھا۔
"بس بہت بن چکی میں پاگل۔۔۔ اب ختم۔" اس کی غراہٹ میں حتمی پن تھا۔ دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا کہ شکل پہ غصے کے بادل چھٹ کے خود ترسی کھنڈ گئی۔
"اب کیا ہو گا؟" اس بار وہ رونکھی ہوئی تھی۔
"نہیں ملنے آ سکتی۔۔۔ سمجھ کیوں نہیں رہے ہو؟" خود ترسی بھی فوراً چھٹ گئی۔ اب جھنجلاہٹ حاوی تھی۔
پھر قدرے تحمل سے توقف کیا۔۔۔ دوسری طرف کی بات سنی اور ہارے ہوئے لہجے میں بولی۔
"مامی کچا چبا جائیں گی۔" تلملائی۔
"اتنا آسان نہیں ہے۔ مامی مامی کم آسیب زیادہ ہیں۔" طنزیہ کہتے ہوئے مامی کے آسیب ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔
"ابھی کچن میں، پھر ٹیرس پر، اگلے پل لاؤنج میں۔۔۔ میں کیسے باہر نکلوں گی ان سے نظر بچا کر۔"
"ہاں۔۔۔ دل تو میرا بھی کرتا ہے ملنے کو" معصوم سے بچے کی طرح ہونٹ لٹک گئے تھے۔
"ٹھیک ہے۔ وعدہ نہیں کوشش۔" لمبی سی سانس کھینچ کر وہ ہار گئی۔ دل جو دل کے سردار کے تابع تھا۔



کچن میں کاؤنٹر سے سامان سمیٹتی مامی کے چہرے پر خلاف معمول پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسوہ دیکھتی تو ضرور کرنٹ کھاتی، مگر ابھی اسوہ تو نہیں ثوبیہ ضرور کچن میں آ گئی۔ مامی کے گلنار چہرے پر دھیان دیے بغیر وہ حسب عادت جس کام کے لیے آئی تھی اسی کو کرنے لگی۔ یعنی فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں ڈال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔
"فیضان آ رہا ہے۔" مصروفیت جاری رکھتے ہوئے مامی نے جیسے بم پھوڑنا چاہا، مگر ثوبیہ نے توجہ ہی نہیں دی۔
"فیضان کو سبزیاں بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔" ثوبیہ کی خاموشی اور بے نیازی محسوس کیے بغیر خوشی

خوشی بتاتی گئیں۔

"ممیٹ میں فش، چکن شوق سے کھاتا ہے۔ دیسی کھانے... اسپیشلی اپنے پاکستان کے روایتی ذائقوں کا عاشق ہے۔"

"آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟" ثوبیہ کی حیرت پہ مامی کو حیرت ہوئی۔

زبان نے زبردست غوطہ کھایا' سارے باقی کے برآمد ہونے والے جملے واپس اندر ڈوب گئے تھے' حیرت کے بعد غصے کی باری آئی۔

"تو کیا اسوہ کو بتاؤں؟" بھنا کر کہتی وہ کچن سے باہر چلی گئیں۔ ثوبیہ اکیلے الجھتی رہی۔

"مدحت خالہ فیضان بھیج رہی ہیں یا شیطان؟ مما نے زندگی تنگ کردی ہے فیضان فیضان کرکے۔" منہ پھلا کر بڑبڑانے کا سوا اور کچھ نہیں سوجھا تھا فی الوقت۔



"بھلے دنیا کی ساری لڑکیاں ختم ہو جائیں سوائے اسوہ کے... میں پھر بھی اس کو بہو نہیں بناؤں گی۔"

ماموں بہت بے بس بیٹھے تھے' جانتے تھے مامی کی باتیں عموماً "پتھر پر لکیر" ہوتی تھیں۔ پھر بھی...

"قصور کیا ہے اس کا.... یتیم بچی ہے... ثواب کماؤ گی۔"

"میں نے یتیموں کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" مامی کچھ زیادہ بھڑکیں۔ "ویسے بھی میرا ایک ہی بیٹا ہے' میرے دل میں لاکھوں ارمان ہیں اس کی شادی کے۔"

"بیٹی بھی ایک ہے۔" ماموں کہنا نہیں چاہتے تھے... مگر کہہ دینا ضروری لگا۔ "اس کی شادی کے ارمان نہیں ہیں؟"

بہت چبھتا ہوا سوال تھا۔ مامی کو صحیح معنوں میں چبھا۔

"جس کے لیے اپنے بھی راضی نہیں۔" ماموں نظریں کو چرا کر دھیمے سے بولے۔

"جلال!" مامی حسب توقع ہتھے سے اکھڑ کر دھاڑیں۔

ٹھنڈی آہ خارج کرنے کے ساتھ ماموں کھڑے ہوگئے۔ جانتے تھے اب انجام کیا ہونے والا تھا؟ مامی کھا جانے کے چکروں میں تھیں۔ کھا تو نہیں سکتی تھیں مگر جو دفعہ لگاتی تھیں۔ ماموں خود اس کے نازل ہونے سے پہلے تکیہ' چادر بغل میں دبائے کمرے سے باہر آگئے۔

لاؤنج کے صوفے پر آنکھیں بازوؤں سے ڈھانپے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نانی نے پکارا۔

"جلال!" ماموں نے جھٹکے سے بازو ہٹایا۔

نانی شدید حیرت کا شکار ہوئے سر پہ کھڑی تھیں۔ ماموں اچھل کر بیٹھ گئے۔ ماں سے بے تحاشا شرم محسوس ہوئی۔

"بیٹھیے اماں!" ایک طرف کھسک کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ نانی چپ چاپ بیٹھ گئیں۔

یہی چپ اگلے کئی لمحوں پر محیط رہی۔ ماموں کے چہرے پر خجالت تو نانی کے چہرے پر دکھ بھری سنجیدگی پھیلی تھی۔

"کہیے اماں... جو کہنے آئی ہیں۔" آہ کھینچ کر ماموں نے خاموشی کی چادر میں شگاف ڈالا۔

"اسوہ کے بارے میں بات کرنی تھی۔" نانی بھی ٹھنڈی آہ کھینچ کر صرف اتنا کہہ پائیں۔

"کوشش جاری ہے اماں!" قدرے توقف کے بعد ماموں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ مصنوعی تسلی دی۔

"ثبوت دیکھ رہی ہوں۔" ماموں کے تکیے اور چادر کو گھورنے کے بعد نانی نے جیسے تمسخر اڑایا۔

"یہ تو ہوتا رہتا ہے۔" ماموں کھسیانی ہنسی ہنسے تھے۔

"ماں کے دودھ کی تو خیر ہے..." نانی تیوری چڑھائے کھڑی ہو گئی تھیں۔

"پر اپنے نام کی ہی لاج رکھ لیا کرو۔ جلال الدین اکبر۔"

ماموں بے بسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

فائیو اسٹار ہوٹل کے ہال کی ایک الگ تھلگ میز بک کیے ذکا کی تیاری آج دیکھنے لائق تھی۔ نیلی جینز پر ہفتہ پہلے خریدی گئی نئی نکور ہلکے کاسنی رنگ کی شرٹ پہنے وہ ٹیبل پہ انگلیاں بجانے میں مگن تھا۔

منتظر نگاہیں کبھی کلائی پر بندھی گھڑی تو کبھی داخلی دروازے پر پڑ رہی تھیں۔ چہرے پر کسی کے دیدار کی خوشی کے سارے رنگ رقصاں تھے۔ ہونٹ کبھی سیٹی بجانے لگتے تو کبھی اضطرابی کیفیت میں سیٹی بجانا بھول کر بس سکڑے ہی رہتے۔

دیے گئے وقت سے پندرہ بیس منٹ اوپر ہو گئے تھے۔ کوئی اتنی پریشانی والی بات نہیں تھی۔ دیر سویر ہونا لازمی امر تھا خصوصاً" جب پہلی ملاقات ہو۔ پھر بھی دل.... مچلے جا رہا تھا۔ بے چین سا ہو کر موبائل پہ ایک نمبر ڈائل کیا تھا کہ برقع پوش ایک خاتون عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

ذکا موبائل بھول بھال اسے تعجب سے دیکھے گیا۔ پوچھنے ہی لگا تھا کہ کون ہو بی بی جب... بی بی نے خود نقاب الٹ دیا۔ اسوہ تھی... جسے دیکھتے ہی خوشی کے سارے رنگ پھر سے اڑے تھے۔ ذکا کا موڈ بہت بری طرح سے آف ہوا تھا۔

"یہ کیا پہن آئی ہو؟" بے انتہا خفگی سے برقع کی جانب اشارہ کیا۔ تب تک اسوہ بیٹھ چکی تھی۔

"جان ہتھیلی پر رکھ کر آئی ہوں۔" گمبھیر لہجے اور مخمور نگاہوں سے متاثر نہ ہوتے ہوئے وہ چمک کر بولی۔

"نہ میرے پاس سلیمانی ٹوپی تھی نہ جادوئی چھڑی... مجبوراً" برقع میں آنا پڑا۔"

"اچھا لیو اٹ" ذکا کو اس کے اس دلیرانہ لیکچر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تب ہی موضوع بدلنا چاہا۔

"کچھ میٹھا میٹھا بولو نا..." اسوہ ہونٹ بھینچے... تند سی شکل بنائے اسے گھورتی رہی۔

"پہلے گھر میں بات نہ سہی... دیکھ تو لیتے تھے ایک دوسرے کو۔ جب سے مما کے سامنے تمہارا نام لیا ہے، تمہیں دیکھنے سے بھی رہ گیا ہوں۔ مما ہر لمحے آس پاس ہوتی ہیں۔" یہ بڑا بھاری غم تھا ذکا کے لیے۔

جس کا مداوا فی الحال اسوہ کے بس میں نہیں تھا۔ تب ہی چپ بیٹھی میز کی سطح کو گھورتی رہی۔ پھر اچانک برقع کی جیب سے موبائل نکال کر ذکا کے سامنے رکھ دیا۔

"اب تم کترینہ کیف کے ہونے جا رہے ہو..." اسوہ یکدم رنجیدہ ہو گئی تھی۔ "مجھ سے اپنی چیزیں واپس لے لو... یہ موبائل اور... اور اپنی لولی لنگڑی محبت بھی۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا؟" ساکت بیٹھے ذکا کا پارہ آخری درجے تک جا پہنچا۔

"پہلے تھا۔ اب ٹھیک ہو گیا ہے۔" وہ بھی تڑخی۔

"رکھو اسے... سنبھال کر... میری محبت کی سیڑھی ہے یہ۔ اسی کے سہارے تو میری محبت چل رہی ہے۔" ذکا نے زبردستی اس کی مٹھی کھول کر موبائل پکڑایا۔

"میں سیریس ہوں۔" اسوہ تھکی تھکی آواز میں آخری کوشش کے طور پر بولی۔

"مامی آج نادرہ کے ساتھ تمہاری کترینہ کیف دیکھنے گئی ہیں۔" بتاتے ہوئے حلق میں گولے پھنس گئے۔ ذکا بغور اسے دیکھتا رہا۔ "تب ہی تو یہاں آسکی ہوں۔" اس کے چہرے پر اداس مسکراہٹ پھیلی۔

"اور دادی؟"

"ان کو تو میں نے سچ سچ بتا دیا۔" اسوہ نے سکون واطمینان سے کہا۔ اور ذکا کا اطمینان رخصت کر دیا۔

"کیا؟"

"یہ کہ میں تم سے ملنے جا رہی ہوں۔"

"او گاڈ..." ذکا کو توقع نہیں تھی وہ اتنی آسانی سے اپنی اور اس کی محبت کا پول کھول دے گی۔

"اب میں ان کا سامنا کیسے کروں گا؟"

"یہ برقع پہن کر۔" ذکا کی پریشانی پر وہ چڑ سی گئی۔

"اللہ تمہیں لڑکی بنا رہے تھے... پھر پتا نہیں کیوں لڑکا بنا دیا۔" خوامخواہ ذکا پہ تاؤ آنے لگا۔ جو بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"تمہارے ساتھ جوڑی جو بنانی تھی۔" وہ لگاوٹ ... اور اسوہ صاحبہ تپ گئیں۔

"...ٹ اپ"

"اتنی پیاری نہیں ہو... جتنی اچھی لگتی ہو۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ اسوہ پہلے گھور کر دیکھتی رہی۔ پھر بہت دلفریب سے انداز میں مسکرا دی۔ جیسی بھی تھی... یہ ملاقات اچھی لگ رہی تھی۔



"فیضان کے لیے میں نے ذکا کے ساتھ والا کمرہ سیٹ کروا دیا ہے۔" بڑے جوش اور مسرت سے مامی نے ایسے بتایا جیسے کارنامہ سرانجام دے دیا ہو۔

کتاب میں منہ دیے ماموں اچھے خاصے بے زار ہوئے۔

"خوش تو ایسے ہو رہی ہیں جیسے پتا نہیں شہزادہ آ رہا ہے کوئی۔" سر اٹھائے بغیر... عرق ریزی سے کتاب کے ورق پر نظر جمائے ماموں با آواز بلند بڑبڑائے تو مامی کو پتنگے سے لگ گئے۔ مگر فیضان کی آمد کی خوشی شاید زیادہ تھی کہ پی گئیں۔

"خوش تو ہوں۔ بات ہی خوشی کی ہے۔" ہنوز مسکرا مسکرا بات جاری رکھی۔ پھر تھوڑا کھسک کر ماموں کے قریب ہوئیں۔

"فیضان شادی کی غرض سے آ رہا تھا۔ مدحت کہہ رہی تھی کوشش کرو اسے ثوبیہ پسند آ جائے۔" اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ انتہائی رازداری برت کر خوشی کی وجہ بھی بتا دی۔

"بغیر کوشش سے کروایا جا سکتا تو میری کوشش کامیاب ہو چکی ہوتی۔" ماموں بدبدائے تھے۔

"من من کیوں کر رہے ہیں... زور سے بولیں۔" مامی برا مان گئیں۔

ماموں پہلے بے تاثر آنکھوں سے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر کتاب بند کر کے سیدھے ہو بیٹھے۔

"فیضان کوئی بچہ تھوڑی ہے۔ جسے دو آپشنز میں سے مرضی کا آپشن پسند کرنے پر مجبور کیا جائے۔" ماموں نے گلا کھنکارنے کے بعد جو کہا وہ مامی کے سر پر سے گزر گیا۔

"دو آپشنز۔" ان کے تیور خود بخود تیکھے ہو گئے۔

"ہاں ثوبیہ... اور۔" پھر بے نیازی سے کہا۔ "اسوہ" یہ کہتے ہوئے نظریں چرانی پڑیں۔

مامی کی کرختگی لوٹ آئی۔ کھا جانے والے تاثرات کے ساتھ جتنی دیر ممکن ہوا ماموں کو دیکھ کر سہمایا۔

"ہمیشہ اپنی شکل جیسی بات کریے گا۔" پھر لفظ چبا چبا کر ادا کیے "باسی سڑی ہوئی۔" لحاف جھٹک جھٹک کر شکنیں دور کیں۔ اور رخ پھیر کر لیٹ گئیں۔

"آپ کی بھانجی سے کوئی دل گردے والا شادی کرے گا۔ میرے بھانجے اور بیٹے کی ہمت نہیں اسے برداشت کرنے کی۔"

غصہ اتنا شدید تھا سوتے وقت تک بڑبڑاتی رہیں ماموں کہہ کر پچھتائے کی تفسیر بن بیٹھے۔



آج نادرہ پھر سے جلوہ افروز تھی اس کے توسط سے مامی کا ٹکراؤ امیر ترین فیملی سے ہوا تھا۔ اپنا انعام وصول کرنے وہ پورے اعتماد کے ساتھ آ سکتی تھی۔ سو آئی بیٹھی تھی۔

نانی کی ناپسندیدگی اور ثوبیہ ذکا کی بے زاری محسوس کرنے کے باوجود بھی وہ زور و شور سے تبصرے کرنے اور قہقہہ لگانے میں مگن تھی۔ نانی کا ارادہ آج اس کے متھے لگنے کا نہیں تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ پوتے کی بات طے ہونے کا معاملہ ہے، بھلے ہو نہیں پوچھ رہی۔ پر وہ خود تو خاموش تماشائی نہیں بن سکتی تھیں۔

اسوہ البتہ جان بوجھ کر کمرے میں بند رہی۔ ذکا کے اس مال دار لڑکی سے رشتے کا سن کر ہی دماغ پھٹنے لگتا تھا۔

"بہت امیر کبیر فیملی ہے' لڑکی کا باپ مل اونر ہے' فیکٹریوں کے علاوہ پیٹرول پمپ' پلازے الگ ہیں ان کے۔"

مامی کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ذکا نے بے ساختہ ہونٹ بھینچے' مامی جو سلوک اس کے ساتھ شادی کے معاملے میں روا رکھ رہی تھیں' ایسا تو کسی لڑکی کے ساتھ بھی نہیں رکھا جاتا ہوگا۔

"بڑی بیٹی کی شادی کے وقت مثالی جہیز دیا تھا۔ دنیا آج تک یاد کرتی ہے۔"

مامی یہ سب دونوں بچوں اور نانی کو بتا رہی تھیں۔ مگر سن کوئی بھی نہیں رہا تھا۔ نانی کے چتون بنے ہوئے تھے۔ ثوبیہ بالکل بے تاثر بیٹھی تھی اور ذکا اگلے چند منٹوں میں یہاں سے اٹھنے کی کر رہا تھا۔

"میرے ذکا کی تو قسمت کھل گئی۔" جس وقت مامی نے یہ بات کہی۔ اسوہ نے اسی وقت لاؤنج میں قدم رکھا۔ چہرہ مرجھایا ہوا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ذکا اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔

"ذکا کی قسمت پہلے کی کھلی ہوئی ہے۔" نانی کو مامی کا یوں متاثر ہو جانا بہت برا لگا۔

"اماں جی آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ شہر کی معتبر ترین فیملیز میں سے ایک ہے۔"

مامی نے واقعی کچھ دیکھا تھا تو قصیدے پڑھ رہی تھیں' ورنہ تو اور کسی ان مٹ علامتی نشان کی طرح ہمہ وقت ثبت رہنے والے ان کے ماتھے کے بل بھی آج کل غائب رہنے لگے تھے۔

اسوہ سست قدموں سے قریب آ رہی تھی۔ ذکا کو اس کے تاثرات سے کچھ غلط ہونے کا گمان ہوا۔

"جو اس نوٹنکی نادرہ کے ہتھے چڑھ جائے۔ وہ معتبر کیسے ہو سکتی ہے۔" نانی نے بھی قسم کھا رکھی تھی' نادرہ کی کسی بات پر اعتبار نہ کرنے کی۔

"اور نزہت باجی یہ بھی تو بتائیں نا' لڑکی بالکل کترینہ کیف جیسی ہے۔" کنوؤں سے انصاف کرتی نادرہ نے ایک اور وجہ رشتہ بتائی۔

ذکا یک ٹک اسوہ کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر اشتعال اور برگشتگی تھی۔ عزائم خطرناک لگ رہے تھے۔

"ایمان سے بہت خوب صورت ہے' بہت مہذب اور سلیقے والی' ناپ تول کر بولتی ہے' تمیز سے اٹھنا بیٹھنا۔" مامی اسوہ کو قطعی نظر انداز کیے ہوئے تھیں' جو ان کے سامنے سے گزر گئی تھی۔

"ہیرا ہے ہیرا۔"

آخری لفظ مامی کے منہ میں تھا' جب اسوہ نے اسٹینڈ پر دھرے ایک قیمتی شوپیس کو جان بوجھ کر ہاتھ مارتے ہوئے گرا دیا۔ ڈیکوریشن پیس گر کر چور چور ہو گیا۔ مامی کی پتلیاں ساکت ہو گئی تھیں' اسوہ تیزی سے کچن میں جا گھسی۔

"میرا... میرا..." مامی کا سکتہ ٹوٹا تو بھینچی بھینچی آواز میں کہنا چاہا۔ "جہیز کا شوپیس۔" ثوبیہ' مامی کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ سہلانے لگی۔

"اوہو نزہت باجی۔ جانے دیں۔ اس سے زیادہ قیمتی سامان آپ کے گھر میں آنے والا ہے' بس ذکا کی..."

نادرہ کی بات پوری ہونے سے رہ گئی۔ مامی شوپیس کے غم میں بے ہوش ہو گئی تھیں۔



اسی رات اسوہ اسٹور میں موبائل پر ذکا کے لتے لے رہی تھی۔

"گیم نہیں ہے تو اور کیا ہے یہ؟" اس کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

"محبت میں گیم کہاں سے آ گئی؟" ذکا واقعی اس کی بات نہیں سمجھ پایا۔

"بس کرو محبت کی گردان۔" دبی آواز میں کہتے ہوئے اس نے دانت پیس ڈالے۔

"محبت محبت کر کے تم نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔" خوامخواہ آنسو گلے میں اٹک گئے۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔

"اسوہ پلیز یار! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔" ذکا لجاجت سے

بولا۔

"بات یہ ہے کہ تم ڈبل گیم کھیل رہے ہو۔" مگر اسوہ پر یہ لجاجت اثر انداز نہ ہو سکی۔

درحقیقت اس کی امید کے دیے بجھتے چلے جارہے تھے۔

"ڈبل گیم۔" ذکا نافہم انداز میں بڑبڑایا۔

"دونوں طرف سے سب اچھا ہے کے پرومو چلا رہے ہو۔ ادھر سے اپنی اماں کی جی حضوری کر کے ان کے بھی پپو بنے ہوئے ہو....."

"پپو؟"

"اور ادھر مجھے بھی گھاس ڈالتے تھک نہیں رہے ہو۔"

"شٹ اپ۔" ذکا بے ساختہ غصے میں آکر چیخا۔

"ان فیکٹ دونوں طرف سے مطلب نکال رہے ہو۔" وہ تنفر سے بولی تھی۔

"میرے سامنے نہیں ہو' ورنہ دو کس کے لگاتا۔" وہ شدید خفگی سے بولا۔

"تم کیا لگاتے... میں لگاتی۔" وہ ڈرنے' دبنے والی کہاں تھی۔

"واٹ؟"

"کترینہ کیف مل رہی ہے تمہیں۔" پھر اپنی بے بسی' کم مائیگی کا احساس ہوا تو آواز رونکھی ہو گئی۔ "ہونٹ سی کر بیٹھے رہتے ہو۔"

"میری چپ حالات کا تقاضا ہے۔" ذکا سمجھانا چاہ رہا تھا' مگر وہ بپھر گئی۔

"حالات کا تقاضا نہیں' تمہاری بزدلی اور من کی خواہش ہے۔"

"تم واقعی مار کھاؤ گی۔" دوسری طرف ذکا نے دانت بھینچے۔

"سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ تمہارے دل میں پھوٹتے لڈو شکل سے نظر آرہے ہوتے ہیں۔" ذکا نے بے ساختہ بال نوچے تھے۔

"اور پھر..." وہ دوبارہ رونکھی ہوئی۔ "گھر آئی لکشمی کو کون لات مارتا ہے؟"

"تم پاگل ہو گئی ہو۔" ذکا تاسف سے بولا۔

"واقعی پاگل ہوں۔" اس کی افسردگی میں بھی طنز غالب ہوا۔ "تمہاری محبت کی آس میں اچھے اچھے رشتے ٹھکرا دیے۔"

"تو میں بھی ایسا ہی کروں گا۔"

"کروں گا؟" وہ بھنائی۔ تبھی اسٹور میں کھٹکا سا ہوا۔

"بند کرتی ہوں۔" اسوہ نے عجلت میں موبائل بند کر کے سرہانے کیا۔ اسٹور میں داخل ہونے والے کا سایہ بھی بمشکل نظر آرہا تھا۔ اسوہ دم سادھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی جانب متوجہ رہی۔

سایہ حسب عادت یہاں وہاں ہاتھ مار رہا تھا۔ اسوہ نے کچھ سوچا اور دبے پاؤں بستروں سے نیچے اتر آئی۔ ایک چادر کھینچتی سائے کے قریب گئی اور اگلے ہی پل بنا وقت ضائع کیے چادر سائے کے اوپر ڈال کر خود اس کے اوپر بیٹھ گئی۔

"پکڑ لیا... پکڑ لیا... میں نے پکڑ لیا۔" پھر جو حلق پھاڑ کر چلائی تو گھر بھر اسٹور میں اکٹھا ہو گیا۔ آنکھیں ملتے ماموں' تسبیح گھماتی نانی' کتاب سمیت ثوبیہ اور کسی نئے خطرے کی بو سونگھتا ذکا۔

"پکڑ لیا۔" سب کی طرف دیکھ کر فرط جوش سے باچھیں پھیلائیں۔ "چور پکڑ لیا۔" تب تک سایہ اسے دور دھکیل کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"ما... می!" بے ساختہ برآمد ہوئی چیخ کا گلا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر گھونٹا۔ آنکھیں ابلنے کو تھیں' مامی پھنکار رہی تھیں۔

"ہاہاہا... کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔" ماموں نے ہی صورت حال قابو کرنے کی لاحاصل سعی کی۔

"چھوڑوں گی نہیں۔" مامی اس کی جانب لپکیں تو وہ چیخ مارتے ہوئے ماموں کے پیچھے ہوئی۔

"گھٹنے چھل گئے' جوڑے ہل گئے' پتا نہیں کس دشمنی کا بدلہ نکال رہی تھی۔" مامی کے چہرے سے بھی تکلیف نمایاں تھی۔ ذکا اور نانی نے تاسف سے اسے دیکھا' ثوبیہ جا چکی تھی۔

"اور یہ کر کیا رہی تھیں یہاں؟" کچھ یاد آنے پر انہوں نے پھر سے اس پر جھپٹنا چاہا۔

"باہر۔۔۔ باہر۔۔۔ تم بھی باہر چل کر بتانا کہ آدھی رات کو تم یہاں کیا کرنے آئی تھیں۔"

ماموں' مامی کو بازو سے پکڑ کر باہر لے گئے۔ اسوہ سر جھکاتی نانی اور زکا سے بھی پہلے بھاگی۔

نانی مایوس سی سرہلائے جارہی تھیں۔ اسے مامی کے سامنے اچھا' تمیز والی' مہذب بننے کے دیے گئے ان کے سارے درس ضائع گئے تھے۔



فیضان کی آمد اسی ہفتے متوقع تھی۔ مامی نے ہفتے کے پہلے دن سے "ہفتہ صفائی" منانا شروع کردیا۔ کیا نوکر چاکر اور کیا گھر کے افراد۔۔۔ سبھی کے ہاتھ میں جھاڑو تھمادی گئی۔ گھر شیشے کی طرح چمک گیا۔ فرنیچر کی ترتیب بدل گئی۔

لاؤنج اور ڈرائنگ روم کے صوفے نئے آگئے۔

فیضان صاحب نہیں آئے۔ پتا چلا وہاں کوئی مسئلہ ہوگیا' تو۔۔۔ تو اگلے ہفتے آئیں گے۔ اگلے ہفتے بھی صفائی ستھرائی جاری رہی۔ حقیقتاً" مامی نے کسی کو نہیں بخشا' ایک سوائے نانی کے۔

لاؤنج' ڈرائنگ روم' پردے' قیمتی ڈیکوریشن پیس گھر کی حالت بدل گئی۔ ساتھ ہی گھر کے افراد کا بھرکس نکل گیا۔

اس شام بھی زکا تھکا ہارا صوفے پر لیٹا ہوا تھا' مامی ناقدانہ پورے لاؤنج کا جائزہ لینے میں لگی تھیں اور اسوہ نئے خریدے گئے کرسٹل کے کینڈل اسٹینڈ کو چمکاتی زکا کے صوفے کے پاس کھڑی تھی۔ جب گرد میں اٹی نڈھال ہوئی ثوبیہ' مامی کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"بس مما! سب صاف ہوگیا؟" وہ منہ بسور کر پوچھنے لگی تو مامی پیار سے اسے دیکھنے لگیں۔

"سب کہاں؟" مامی نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ "یہ چہرہ صاف ہونا باقی ہے۔ اس کی جھاڑ پونچھ کرو۔۔۔ ہری اپ۔" ثوبیہ ہنوز منہ بسورے کھڑی رہی۔

"اور ان عدسوں کو بھی ریٹائر کرو' کانٹیکٹ لینس خریدو آج ہی آج۔"

"کیوں مما!" ثوبیہ نے مامی کے ہاتھ سے چشمہ لے کر دوبارہ ناک پر ٹکایا۔

"فیضان صاحب مجھے عینک میں دیکھ کر ڈر جائیں گے کیا؟" مامی صرف مسکراتی رہیں۔

"اور یہ اتنی لمبی صفائی کس خوشی میں؟ فیضان محکمہ صفائی میں ہیں کیا؟"

"فیضان تو آرہا ہے۔۔۔ لیکن یہ صفائی اور سٹنگ میں نے کسی اور وجہ سے کرائی ہے۔"

"وہ کیا؟" ثوبیہ نے سرسری پوچھا' جبکہ زکا اور اسوہ چونک گئے۔

زکا اٹھ بیٹھا تھا اور اسوہ کے کینڈل اسٹینڈ چمکاتے ہاتھ ست پڑ گئے۔ یعنی مہمان خصوصی کے اعزاز میں یہ سب نہیں تو کس کے اعزاز میں۔

"زکا کے سسرال والوں نے آنا ہے۔" کہہ کر مامی کہیں اور متوجہ ہوگئیں۔

دیکھا ہی نہیں کہ اسوہ کے ہاتھ سے کینڈل اسٹینڈ چھوٹ گیا تھا۔ جسے زکا نے کمال پھرتی سے جھک کر کیچ کرلیا' ورنہ اس کی شہادت اور ساتھ اسوہ کی بھی لازمی تھی۔

بنا زکا کی نظروں میں جھانکے اسوہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔



بالوں میں برش پھیرنے کے بعد گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ جونہی پلٹا' ہاتھ میں استری شدہ شرٹ تھامے کھڑی اسوہ کو دیکھ کر لرز ہی گیا۔ یہ پہلی بار تھا اسوہ خود چل کر اس کے کمرے میں آئی تھی۔ ورنہ مامی کے خوف سے دونوں یہ احتیاط ملحوظ خاطر رکھتے تھے کہ ایک دوسرے کے کمروں میں نہ جائیں۔

"تم؟" زکا کو خطرے کی بو کہیں قریب محسوس ہوئی۔ "میرے کمرے میں؟" وہ بولا نہیں منمنایا۔

"کیوں... یہاں کرفیو نافذ ہے۔" ذکا کی شرٹ بیڈ پر پھینکتے ہوئے وہ سکون سے بولی۔

"نہیں... مگر... وہ مما... تم آئی کیوں ہو؟"

"آر یا پار کرنے۔" اسوہ کا لہجہ ابھی بھی پرسکون تھا۔

"مطلب۔" ذکا کی گھبراہٹ دگنی ہو گئی۔

"ابھی اور اسی وقت وعدہ کرو آج رات تک مامی کو منا لو گے۔ نہیں تو میں اس کمرے سے نہیں جانے والی۔"

"وعدہ۔" پکڑ کر دروازہ کی طرف دھکیلنا چاہا۔

"شادی کی رات نکاح سے پہلے بھاگ جاؤں گا۔"

"یعنی دولہا بنو گے۔" اسوہ نے آگ بگولہ ہوتے ہوئے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

"ذکا!" یہ مامی کی آواز تھی کہیں قریب سے آتی ہوئی۔ "فیضان کی فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔" وہ پکارتی آرہی تھیں۔ ادھر ذکا کے پیروں تلے سے زمین کھسکنا شروع ہو گئی۔

"جا... جا جاتا ہوں مما!" اسوہ کو دبوچ کر ہانک لگائی۔

"بیڈ کے نیچے' بیڈ کے نیچے۔" آثار ایسے ہی تھے جیسے وہ اسے بیڈ کے نیچے گھسا کر دم لے گا۔

"نہیں چھپوں گی۔" وہ ڈھٹائی سے دور ہٹی۔

"مما مار ڈالیں گی۔" وہ زچ ہو گیا۔

"مار ڈالیں۔" وہ مطمئن تھی۔ "ایک اور سسی' ہیر محبت پہ قربان۔" ذکا نے پکڑ کر وارڈروب میں دھکیل دیا۔

"دیکھو یہاں نہیں... میری سانس۔" اسوہ کہتی رہ گئی۔ مگر ذکا نے پٹ بند کر دیے اور مامی نے دروازے کے پٹ عین اسی ٹائم کھولے۔ ذکا باقاعدہ ہانپ رہا تھا۔



اور فیضان آگیا۔ ذکا نے ازراہ مذاق پھولوں کی پتیاں پہلے سے منگوا رکھیں۔ پھر جس وقت وہ فیضان کو لیے لاؤنج میں داخل ہوا۔ پھولوں کی پتیوں والی پلیٹیں ماموں اور نانی کے ہاتھ میں تھیں۔ دونوں نے فیضان پر پتیاں نچھاور کیں۔ فیضان جو پہلے ہی جھینپ رہا تھا۔ اس انوکھے طریقے استقبال پر مزید سٹپٹا گیا۔

مامی جب اسے گلے لگا رہی تھیں تب نانی کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر مامی سے نظر بچاتے ہوئے ذکا نے پتیاں اسوہ پر پھینکنا شروع کر دیں۔ اتفاقیہ ماموں کی نظر بھی عین اسی وقت ذکا اور پھر اسوہ پر پڑیں۔ انہوں نے شرارت سے مٹھی بھر کر ذکا پر اچھال دیں۔ وہ ممنون نظروں سے باپ کو دیکھنے لگا۔

اسوہ پہلے ہی اس سے خفا تھی' اب مزید خفا ہو گئی۔ فیضان "فردا" فردا" سب سے ملا۔ ثوبیہ آج پیارے سے سوٹ میں ملبوس تھی۔ نانی نے بھی نیا سوٹ پہن رکھا تھا۔ فیضان کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی توقع نہیں تھی۔ سو لڑکیوں کی طرح شرما گیا۔

اسی رات اسوہ نے اپنی اور ذکا کی محبت کی ریت توڑی۔ روز رات کو ذکا سے فون پر بات نہ کر لیتی چین سے سوتی نہیں تھی۔ ذکا کا بھی یہی حال تھا۔ مامی سے نظر بچا کر کسی نہ کسی طرح اس نے یہ موبائل اسوہ کے حوالے کیا تھا۔ جو نہ کبھی خراب ہوا نہ بند۔ کیونکہ وہ صرف تب ہی استعمال ہوتا تھا جب رات میں ذکا کی کال آتی تھی۔

مگر اس رات اسوہ نے ذکا کی کال اٹینڈ نہیں کی۔ کوئی دس بار ذکا نے کال ملائی۔ اسوہ نے ہر بار کاٹ دی۔ اینڈ میں موبائل بند کر کے وارڈروب کھول کر کپڑوں کے نیچے پھینک دیا۔

اندازہ تھا ذکا پاگل ہو رہا ہو گا۔ مگر فی الحال یہ کرنے کے علاوہ اسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔



"وہاں پر لائف بہت ٹف ہے' ریسٹ کرنے کا تو تصور ہی نہیں ہے۔"

"اچھا۔" مامی نے یوں حیرت دکھائی جیسے اب تک لاعلم ہوں۔

"جی ہاں... کام، کام اور بس کام۔"

فیضان بہت تمیز اور تہذیب سے بولتا تھا۔ لہجہ نہایت رواں اور شائستگی لیے ہوئے تھا۔ مامی تو نثار تھیں ہی، نانی کو بھی وہ پسند آگیا۔

"بیٹا جی! ہم تو امریکہ کے سحر میں گرفتار ہیں۔" ماموں حسب عادت مزاحیہ انداز میں بولے۔

"انکل جی! دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔" فیضان نے اتنے پیارے انداز میں کہا کہ ماموں کا قہقہہ نکل گیا۔

"واہ... اردو تو آپ کی لاجواب ہے۔" تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔

"اس لیے کہ اماں، ابا نے وہاں ٹائٹ ماحول دے رکھا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"جب آپ کو شادی پاکستان میں کرنی ہے تو آپ اماں، ابا سمیت اس سوسائٹی کا حصہ کیوں ہو؟" عادت کے مطابق ثوبیہ نے بقراطی سوال پوچھا، تو مامی نے ہی نہیں نانی نے بھی آنکھیں دکھادیں۔ فیضان خود سوچ میں پڑ گیا تھا، کیا جواب دے۔

"لنچ ٹائم ہو رہا ہے... کھانا نہ کھالیں۔" فیضان نہ جانے کیا جواب دیتا، مامی نے جلدی سے بات بدل ڈالی، تو وہ مسکرا کر "شیور" بولتا کھڑا ہو گیا۔

محفل میں بیٹھے اور محفل سے کٹے، وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

ماموں، فیضان، مامی، ثوبیہ، نانی اور بعد میں اسوہ... ذکا نے تیز تیز قدم اٹھا کر اسوہ تک رسائی حاصل کی اور دیوار کی طرح سامنے تن کھڑا ہوا۔

"رات تم نے میری کال کیوں نہیں اٹینڈ کی۔" وہ سرگوشی میں سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"کیونکہ یہ کالز مجھے کچھ نہیں دے رہیں... سوائے ڈپریشن کے۔" وہ اس سے بھی زیادہ سنجیدگی و رکھائی سے بولی۔

دو دن پہلے تک وہ جس کے لیے قربان ہونے چلی تھی، آج اس سے منہ موڑے کھڑی تھی۔ ذکا کا دل چاہا کھینچ کر تھپڑ مار دے، لیکن...

"میرا اعتبار نہیں ہے۔" بھاری آواز میں صرف اتنا ہی پوچھ پایا تھا۔ "اب نہیں ہے۔" ذکا کی آنکھوں میں دیکھ کر سفاکی کا ثبوت دیتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

ذکا غصے کی شدت سے اپنے ہی ہاتھ پر مکے برساتا رہا۔



اور وہ جو مطمئن تھے، پرسکون تھے، اب ایک دم سے بے قرار و بے چین ہو گئے۔ لمبی لمبی فون کالز میں نہ تو قسمیں کھائی گئی تھیں، نہ کبھی عہد و پیمان بندھے تھے۔ بس ایک یقین تھا جس نے دونوں کے دلوں کو جوڑ رکھا تھا اور اب وہی یقین تحلیل ہو رہا تھا، دھندلا رہا تھا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ اتنی جلدی ابھی سے مت بدگمان ہو، مامی کے اسوہ اور اسے دور، دور رکھنے کے ہر حربے کے باوجود بھی وہ جب اتنے قریب آگئے تھے تو اب بھی ذکا کا رشتہ کرانے کا یہ حربہ ناکام ہو سکتا تھا۔ مگر وہ تو ہاتھ ہی نہیں آرہی تھی۔

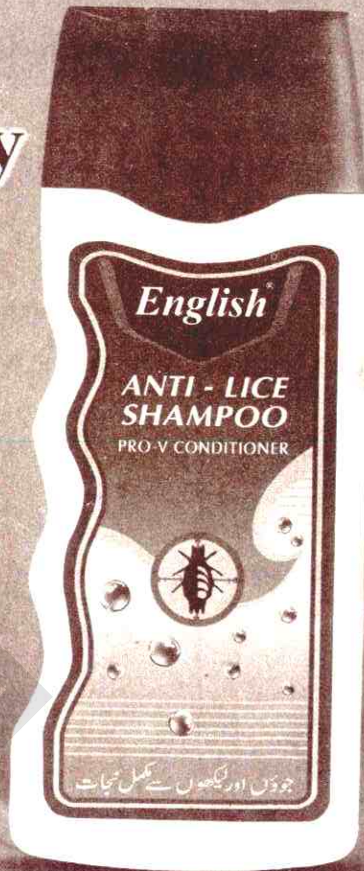
فون اس نے مستقل آف کر رکھا تھا۔ فیضان کی آؤ بھگت میں مصروف رہنے کی وجہ سے مامی کا دھیان بھی ان کی چوکیداری سے قدرے ہٹ چکا تھا یا شاید ذکا کی بات ڈالنے کے بعد سے وہ کچھ زیادہ ہی مطمئن ہو چکی تھیں کہ اسوہ کو اب خطرہ محسوس نہیں کرنے لگی تھیں۔ یعنی قدرت کی طرف سے مواقع میسر بھی آئے تو تب جب یقین کی ڈور ہاتھ سے پھسلنے لگی۔

اسوہ جب جب اس کے سامنے ظاہر ہوئی، آسودہ مطمئن اور پرسکون لگی اور خود اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ چہرہ ہی کھل کر بیان کرنے لگا تھا کہ وہ محبت کا مارا یا پھر ہارا ہوا ہے۔



چائے پینے کی طلب شدید ترین تھی کہ وہ شرم جھجک بالائے طاق رکھے ———— کمرے





WWW.PAKSOCIETY.COM

سے باہر آگیا۔ حالانکہ گھر کے سبھی افراد روزانہ باور کراتے نہیں تھکتے تھے کہ خالہ کا گھر اپنا گھر بنا جھجکے رہو، لیکن اس کی فطرت ہی شرمیلے پن کی تھی شاید، لاؤنج میں سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اسے فاصلے سے ہی ٹی وی کے سامنے کوئی بیٹھا نظر آگیا۔

اسوہ یا شاید ثوبیہ۔ سیڑھیاں اتر چکا تو واضح نظر آیا' اسوہ تھی' دبے قدموں قریب گیا تو متفکر ہوا۔ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ آئس کریم سے انصاف کرتے ہوئے وہ رونے کا شغل بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔

"اسوہ! آپ۔" فیضان کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔

آئس کریم سے بھرا ہوا چمچہ اسوہ کے منہ میں دبا تھا۔ انگلی سے ٹی وی اسکرین کی جانب اشارہ کرکے سوں سوں جاری رکھی۔ فیضان نے ٹی وی پر نظر دوڑائی اور مسکرا کر رہ گیا۔

"او آئی سی۔" کسی بھارتی فلم کا غمگین سین چل رہا تھا۔

"ایکچوئیلی... کافی بڑی مووی ہے۔" اسوہ کی آواز بھی بھاری ہو رہی تھی۔

"اگر مائنڈ نہ کریں تو؟" سنگل صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ بیٹھنے کی اجازت مانگنے لگا۔

"ارے پلیز... بیٹھیے بیٹھیے۔" اگرچہ اس وقت وہ صرف تنہائی کی متمنی تھی' لیکن ناچار اخلاقیات نبھانی پڑیں۔

"آپ کی خالہ کا گھر ہے۔ آپ ود آوٹ پرمیشن کہیں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔" فیضان قدرے تکلف سے بیٹھ گیا۔

فیضان ویسے ہی کم گو تھا' اور اسوہ اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ سو دونوں کے بیچ خاموشی تنی رہی۔

"آ... " ہچکچاتے ہوئے فیضان ہی خلاف عادت خاموشی توڑنے کا باعث بنا۔ "سب لوگ نظر نہیں آرہے؟"

"کیا؟" اسوہ دماغی طور پر کہیں اور تھی' بری طرح سے چونک گئی۔

"او... اچھا اچھا۔" سوال سماعتوں سے ٹکرایا تو تھا' سو دماغ حاضر کیا تو سمجھ بھی آگیا۔

"مامی اور ثوبیہ ذکا کی ہونے والی سسرال گئی ہیں۔ ماموں اور ذکا آفس' نانی کمرے میں۔" کسی طوطے کی طرح اس نے سبق سنایا اور پھر ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"آئی تھنک... آپ انڈین موویز شوق سے دیکھتی ہیں؟" فیضان خوامخواہ بول کر حیران کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"کس نے کہا؟" ایسی بے ساختگی تھی کہ فیضان کھسیا گیا۔

"نہیں۔" پھر یہ انداز ہوا کہ غلط انداز میں بات کی ہے تو تمیز سے جواب دینے لگی۔

"مجھے انڈین موویز کا کریز نہیں ہے۔ کبھی کبھار دیکھ لی' بس۔ مجھے انگلش ہارر موویز کا کریز ہے۔" اپنی پہلی بات کا داغ دھونے کے لیے اس نے اتنی لمبی وضاحت دی تو فیضان مسکرا دیا۔

"ریئلی؟" فیضان کو اس کی معصومیت اور بولنے کا اسٹائل بہت دلچسپ لگا۔

"بائے گاڈ... نانی اور میں نے کئی ڈراؤنی فلمیں دیکھی ہیں۔" وہ کچھ دیر قبل والی یاسیت سے باہر نکل آئی۔

"آپ بہت بہادر ہیں۔" فیضان کو مزہ آنے لگا تھا اسے سن کر۔

"آپ کی فیورٹ مووی کون سی ہے؟"

"اووم... سب سے پہلے ٹائی ٹینک اور سب سے آخر میں بھی ٹائی ٹینک۔" کہہ کر وہ پھر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔

اس بار فیضان کو محسوس ہوا کہ وہ صرف اس کا دل رکھنے کی خاطر بول رہی تھی' ورنہ چپ چاپ فلم دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ سوچ آتے ہی وہ اٹھنا چاہتا تھا' جب اچانک اسوہ نے پوچھا۔

"آپ مامی کا کیوں پوچھ رہے تھے؟"

"مجھے ایکھو ئیلی چائے پینی تھی۔" فیضان نے سر کھجایا۔
اسوہ ٹھس سی ہو بیٹھی۔
اس وقت اس کا کسی بھی کام کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔
"آپ مجھے کچن کے سامان کے بارے میں گائیڈ کریں تو میں خود بھی بنا سکتا ہوں۔" اسوہ کے چہرے کا اتار چڑھاؤ وہ باآسانی سمجھ کر بولا' تو وہ خجل سی ہو گئی۔
"آ... نہیں..." عین اسی لمحے لاؤنج کے داخلی دروازے سے زکا داخل ہوا تھا۔
"چائے میں بنا دیتی ہوں پر میری چائے یا میں پیتی ہوں یا نانی۔"
زکا کا ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ گن گن کر قدم اٹھاتا وہ ان کے قریب آنے لگا۔
"کوئی بات نہیں' میں بھی پی لوں گا۔" لہجہ' گلہ سب کچھ نارمل تھا۔ مگر زکا کو ہتھوڑے کی طرح لگا۔
"السلام علیکم۔" دونوں کے قریب پہنچ کر بے تاثر سا سلام بے دلی سے جھاڑا۔
اسوہ چائے بنانے کے لیے کھڑی ہو چکی تھی۔
"وعلیکم السلام۔" فیضان نے خوش دلی سے جواب دیا۔ زکا کی نظریں اسوہ پر تھیں۔
"میں چائے لاتی ہوں' ویٹ۔" اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتی فیضان سے مسکرا کر کہتی وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ زکا ہونٹ بھینچے ساکت و جامد کھڑا رہا۔
"بیٹھو یار!" فیضان نے خوش اخلاقی برتی' وہ مضطرب سا ہوش میں آیا۔
"میں آتا ہوں۔" بریف کیس صوفہ پر رکھ کر... فیضان پر پھیکی مسکراہٹ اچھالتا وہ کچن میں آیا' جہاں وہ چائے بنا رہی تھی۔
"اسے کمپنی دینے کے لیے ایک تم رہ گئی تھیں؟" اس کے بالکل نزدیک جا کر دانت بھینچتے ہوئے کہا تھا۔
"تمہارے سسر بیمار ہیں۔ مامی' ثوبیہ کو لے کر ان کی عیادت کو گئی ہیں۔ ماموں گھر پہ نہیں۔ تم آفس' نانی کمرے میں تو میں رہ گئی نا!" بنا زکا کو دیکھے وہ طنزیہ بتاتی چلی گئی۔
"بڑا ہنس بول رہی تھیں؟" زکا کے لفظ عام سے' مگر لہجہ زہریلا تھا۔
اسوہ نے ساری احتیاط جھٹک کر بغور اسے دیکھا اور سمجھنے میں دیر نہیں لگائی کہ وہ فیضان سے جل رہا ہے۔
"ہاں... کیونکہ میں خوش اخلاق ہوں۔" زکا کی آنکھوں سے جھانکتی بے حد ناراضگی سے ذرا نہ متاثر ہوتے ہوئے اس نے سکون سے کہا۔
"مجھے تو ایسی خوش اخلاقی کبھی نہیں دکھائی۔" وہ بے حد ضبط سے کام لے رہا تھا۔
"جو ڈیزرو کرتا ہے اس کے لیے مخصوص ہے۔" اس کے کندھے اچکانے کی دیر تھی۔
زکا نے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف رخ کرنے کے لیے کھینچا' تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی۔
"مامی نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں تم پھنے خان بن جاؤ۔" انتہائی سخت لہجے میں وہ بھڑکی تھی۔
"ایک مال دار اور حسین لڑکی سے شادی کر کے تم اپنا فیوچر بنا سکتے ہو تو امریکہ پلٹ ہینڈسم سے فرینک ہو کر میں کیوں نہیں؟" زکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کس دل کے ساتھ اس نے یہ سب کہا تھا۔
اس کا اندازہ فی الحال زکا لگانے سے قاصر تھا کہ وہ بالکل بدلی ہوئی' ظالم' سفاک لگ رہی تھی۔ (اور یہ صرف اسوہ جانتی تھی کہ کس جبر کے ساتھ وہ یہ سب بولی تھی۔) چائے کا کپ بھر کر وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔ مگر زکا کے دل میں اپنی جگہ ہمیشہ سے زیادہ راسخ کر گئی تھی۔



"دل خوش ہو جاتا ہے زکا کے سسرال جا کر۔" نائٹ کریم کا ڈھکن بند کرنے کے بعد مامی چہرے کو ٹشو پیپر سے صاف کرتی ماموں کے پاس بیڈ پر آ بیٹھیں۔
کتاب بند کر کے ماموں نے بیگم کے چہرے کا مطالعہ کیا اور حیران سے رہ گئے۔ مامی آج کل کچھ زیادہ ہی نکھرتی جا رہی تھیں۔

"شکر ہے.... کہیں تو خوش ہوتا ہے۔" ماموں نے طنز کیا۔ مامی جان بوجھ کر نظرانداز کر گئیں۔

"ویسے ان کی طرف سے ہاں ہو گئی کیا؟" قدرے توقف کے بعد ماموں نے سرسری سا پوچھا۔

"کہہ رہے تھے اس ہفتے تک جواب دے دیں گے۔" ماموں پھر طنزیہ مسکرائے۔

ہاں ہوئی نہیں تھی اور مامی کا دل پتا نہیں کیوں خوش ہو جاتا تھا وہاں جا کر، تبھی دروازہ بجا۔

"مما!" حسب عادت ذکا نے پکارا بھی۔

"بڑی عمر ہے میرے بیٹے کی۔" مامی کے چہرے پر ممتا کے رنگ روشن ہوئے۔

"آجاؤ بیٹا! پوچھتے کیوں ہو۔" مامی کی اجازت کے بعد ذکا اندر داخل ہوا۔

عجیب حلیہ تھا ڈھلکے کندھے، بے رونق آنکھیں اور بڑھی شیو' آتے ہی ذکا نے شاکی نظروں سے باپ کو دیکھا تھا' وہ مسکین و بے بس سے ہو بیٹھے۔

"خیریت صاحبزادے! آج سنتوش کمار کی یاد دلا رہے ہو۔"

"مما!" ماموں کو نظرانداز کیے وہ ماں کے سامنے جا بیٹھا۔

"پلیز مما!" مامی نے فوراً "پینترا بدل کر چہرے سے مسکراہٹ بھگائی۔

یوں بھی آج کل وہ ذکا کے معمولات دیکھ کر کھٹک رہی تھیں۔ اور اب اس کا یوں آکر گھٹنے پکڑ کر منت سے بولنا' ان کا ماتھا ٹھنک گیا۔

"مجھے کسی کترینہ' کسی بپاشا سے شادی نہیں کرنی۔" وہ رو دینے کو تھا۔

"ہائیں۔" ماموں کو بیٹے کی جان کے لالے پڑ گئے' ایسی بہادری!

"اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو.... تو میری شادی اسوہ سے...."

"ہائے میں بدنصیب۔" مامی نے دوہتھڑ مار ڈالے اپنے سینے پر.... سر گھومنے لگا تھا ان کا۔

"چنڈال کی خاطر۔" سانس اکھڑ سی گئی تھی۔

ذکا کی شکل مزید قابل رحم ہو گئی۔ مامی نیم بے ہوش ہوئی جا رہی تھیں۔

"میرا بیٹا! میرے سامنے۔" اور اگلے ہی پل مامی لہرا کر بے ہوش تھیں۔

"بیگم!" ماموں لپک کر پاس گئے' گال تھپتھپا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

"بیگم! بھئی بیگم ہوش کرو' بہت ہو چکی' بیگم!" ذکا بدحواس ہوا پانی کا گلاس لے آیا۔ "بیگم.... نہ کرو یار! بچہ پریشان ہو رہا ہے۔" گلاس پکڑ کر ماموں نے مامی کے چہرے پر چھینٹے برسائے' مامی پھر بھی بے حس و حرکت رہیں۔

"آئی ایم ساری مما!" ذکا ان کے ہاتھ پکڑ کر آزردگی سے کہنے لگا۔ "آپ جیتیں۔" اس کے لہجے میں ہار ماموں کے دل سے جا لگی' مامی کسمسا رہی تھیں۔

"دودھ نہیں بخشوں گی' جادوگرنی پیچھے پڑی ہے میرے بچے کے۔" نیم وا آنکھوں کے ساتھ مامی بین کر رہی تھیں۔ "دوبارہ اس کا نام لیا تو مرا ہوا منہ دیکھنا میرا۔" مامی کی اس دھمکی پر ذکا نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

"آئندہ نام نہیں لوں گا۔" ذکا نے کس قدر ضبط کے ساتھ کہا تھا۔

ماموں جان سکتے میں تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ذکا کوئی بھی انتہائی قدم کیوں نہیں اٹھا پا رہا؟ اسے اپنی ماں کی فطرت کا اندازہ تھا۔ اسے گھر کے ماحول میں فرسٹریشن نہیں چاہیے تھی۔

اسے اپنی محبت حاصل کرنے کی لگن ضرور تھی۔ مگر باقی سب کی محبتوں کے ساتھ۔



فیضان اپنے ہمراہ لایا فوٹو البم کھولے بیٹھا تھا۔ نانی دائیں طرف تو بائیں طرف مامی بیٹھی تھیں۔ درمیان میں فیضان۔

"یہ میرے آنے سے کچھ دنوں پہلے کی ہے۔" ایک تصویر دکھاتے ہوئے اس نے بتایا۔

"مدحت وسی کی ویسی سوکھی سڑی ہے۔ موٹی نہیں ہوئی۔" نانی نے بطور خاص اس تصویر کا جائزہ لینے کے بعد تبصرہ کیا تو فیضان کا جاندار قہقہہ گونج اٹھا۔

"یہی اسمارٹنیس تو اماں کی ہوتی ہے۔" فیضان کے لہجے میں فخر تھا۔ معاً" زوردار چیخ گونجی۔

آواز اسوہ کی تھی اور کچن سے آئی تھی۔ فیضان البم ایک طرف رکھتا کچن کی طرف تیز قدموں سے بھاگا۔ نانی بھی گھٹنے پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں، مگر ان سے بھی پہلے مامی نے جست لگائی۔

کچن کا منظر دل ہلا دینے والا تھا، مامی نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ دبائی۔ سامنے زخمی خون آلود انگلی لیے اسوہ اور اس کا وہی ہاتھ پکڑے فیضان متفکر کھڑا تھا۔

"نہیں۔" مامی کے لیے صورت حال صدماتی تھی۔

"ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں، ٹھیک ہو جائے گا۔" فیضان کی پریشانی مامی کے طوطے اڑا رہی تھی۔

اسوہ کی ہچکیاں تواتر سے جاری تھیں۔ نانی بھی حواس باختہ ہوئی پاس کھڑی تھیں۔

"آ..... نہیں۔" مامی کو سمجھ نہیں آیا صورت حال کیسے مرضی کے مطابق موڑیں۔ ان کی "نہیں" پر فیضان نے عجیب نظروں سے انہیں دیکھا تو بوکھلا کر وضاحت دینے لگیں۔ "مم..... میرا مطلب ہے..... معمولی زخم ہے، مرہم لگا....."

"اتنی بلیڈنگ ہو رہی ہے خالہ! یہ معمولی زخم نہیں ہے۔" فیضان نے مامی کو بات بھی پوری نہیں کرنے دی۔

مامی بے بسی سے اسوہ کو دیکھنے لگیں۔ جس کی عقل اتنی تکلیف کے باوجود بھی کام کر رہی تھی۔ مامی کو فیضان کی فکرمندی اور اسوہ کے لیے ایسی حساسیت پریشان کر رہی تھی۔

اسوہ کے لیے بس یہ جاننا کافی تھا، اب وہ مزید دل سے رونے میں لگ گئی۔

"بچے..... سوچ کیا رہے ہو، بس لے جاؤ، خون بہتا جا رہا ہے، پتا نہیں کوئی رگ نہ کٹ گئی ہو۔" نانی کے کہنے پر اسوہ نے قدم فیضان کے ساتھ آگے بڑھائے۔ ابھی تک اس کا ہاتھ فیضان کے ہاتھ میں تھا۔

"مم..... میں بھی چلتی ہوں۔" مامی کسی صورت بھی اس سے آگے کچھ اور ہو جانا برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

"خالہ! آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔" فیضان نے مامی کی یہ پیشکش بھی سہولت سے لوٹا دی۔

"میں ساتھ ہوں نا۔" بس پھر باقی کیا رہ جاتا تھا۔

"میں ہوں نا۔" نے مامی کی شکل ہی نچوڑ دی۔

"اللہ خیر۔" نانی اسوہ اور فیضان کو گاڑی تک پہنچانے پیچھے ہو لیں، اور مامی خطرے کی بو سونگھتی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

اسوہ نام کا خطرہ..... کیسے کیسے نہیں انہیں لاحق تھا۔ کوئی سمجھ پاتا بھی تو کیسے۔



اور ابھی مامی خوابوں میں بھی فیضان اور اسوہ کو ساتھ ساتھ دیکھ کر سنبھل نہیں پائی تھیں کہ دوسرا دھچکا بھی فوراً" لگ گیا۔

فرمائش کر کے چائے بنوانے والا، فیضان گزشتہ کچھ دنوں سے اس فرمائش کو بھولے ہوئے تھا۔ مگر مامی کو تو یاد تھا۔ سو اس رات ڈنر کے بعد فیضان کے لیے اس کی پسند کے مطابق چائے بنا کر اس کے کمرے تک چلی آئیں۔

دروازہ بند تھا۔ مامی نے بجایا تو چند لمحوں کی تاخیر کے بعد فیضان نے کھول دیا۔

"خالہ آپ..... آیئے نا۔" اس کی مہربان مسکراہٹ جس کے سب دلدادہ تھے، قائم و دائم تھی۔

"یہ چائے دینے آئی تھی۔" مامی نے مسکرا کر کپ آگے کیا۔

"او۔" فیضان کے ہونٹ بے ساختہ سکڑ گئے۔

"کیا ہوا؟" عادت سے مجبور مامی کھٹک گئیں۔

"چائے تو میں نے پی لی۔" اس نے سرسری لہجے میں بتایا۔

"ابھی پندرہ منٹ پہلے۔" مامی کی دلی کیفیت سے بے خبر وہ اپنی ازلی نرم مسکراہٹ کے ساتھ بتانے لگا۔ مامی حیران پریشان کھڑی تھیں۔

"اسوہ سے کہا تھا وہ دے گئی تھی۔" اب مامی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کی تصویر بن گئیں۔

"ان فیکٹ۔۔۔ اسوہ بہت زبردست چائے بناتی ہے' یونیک سی۔" فیضان اپنی دھن میں کہے گیا۔ مامی کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔

"اوکے۔۔۔" مسکرانے کی کوشش میں شکل کا کباڑہ ہو گیا' مگر مامی کو ضبط سے بھی تو کام لینا تھا۔

"دچلتی ہوں۔" فیضان نے اثبات میں سر ہلا کر دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ مامی قدم گھسیٹتی خالی الذہن چل رہی تھیں۔

"یونیک سی۔۔۔ وہ کیسی ہوتی ہے؟" ان کی پریشانی آخری حد پر تھی۔



گھنے بادلوں کی حکمرانی موسم کو حسین بنا رہی تھی۔ اگرچہ باہر نکلنے پر ٹھنڈ محسوس ہوتی تھی' لیکن وہ کافی دنوں بعد اپنے من پسند مشغلے یعنی پھولوں' پودوں سے باتیں کرنے لان میں آگئی اور یہاں آکر وہ کیاریوں کی حالت ٹھیک نہ کرے ممکن ہی نہیں تھا۔

"ہائے۔۔۔ کیا ہو رہا ہے۔" جس وقت مٹی میں مٹی ہوئی مصروف عمل تھی فیضان قریب آکھڑا ہوا۔

"کچھ نہیں۔" سر اٹھا کر وہ مسکرائی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔

"یہ۔۔۔" فیضان نے اس کی زخمی انگلی کی جانب اشارہ کیا۔ "ٹھیک ہو گئی۔"

"ہوں۔" اسوہ بغور مٹی میں لتھڑے ہاتھ دیکھ کر قدرے اداس ہوئی۔

"اس سے زیادہ گہرے کٹ ہیں دل پہ۔" لہجہ بہت دھیما اور کھویا کھویا سا تھا۔ فیضان سن نہ پایا۔

اپنی اس کیفیت سے فوراً" نکل کر اس نے فیضان کو سرتاپا دیکھا۔ وہ تیار ہوا کھڑا تھا۔

"کہیں جا رہے ہیں آپ؟"

"اووم۔" فیضان نے سوچنے کی ایکٹنگ کی۔ "صرف میں نہیں' ہم دونوں۔"

"میں بھی۔" اسوہ نے تعجب سے یقین دہانی چاہی۔

"لیں۔۔۔ میرے فادر کے ملنے والے ہیں ان کے گھر۔۔۔ اکٹھے چلتے ہیں۔"

اسوہ کا بالکل بھی موڈ نہیں تھا' نہ خواہش' انکار کرنے کی غرض سے مناسب الفاظ ڈھونڈتے ہوئے ذرا کی ذرا نظریں دور بر آمدے پر گئیں اور وہ منجمد رہ گئی۔ وہاں مامی قہربار ہوئی کھڑی تھیں۔

اتنی دور سے بھی اسوہ کو ان کی نظریں شعلے برساتی محسوس ہوئیں۔ مارے گھبراہٹ کے نظریں چرا کر آسمان کی طرف دیکھنا چاہا تو ٹیرس بھی زد میں آگیا۔

ایک اور دھچکا یہاں بھی منتظر تھا۔ زکا ریلنگ پکڑے بے بسی ولاچاری سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسوہ کے دل کی کیفیت مزید خزاں رسیدہ ہوئی۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ شاید تھوڑی بہت چالاکی سیکھتی جا رہی تھی۔ دور موجود دو دلوں کو کچوکے لگانے کے لیے اس نے بالکل اچانک فیصلہ کیا تھا جانے کا۔

"ثوبیہ کو بھی آفر کریں۔" اسوہ پانی والے پائپ سے ہاتھ دھو آئی' فیضان نے عام سے انداز میں کہا۔

"وہ نہیں آئے گی' آئن اسٹائن کی جانشین۔"

یہ غلطی وہ نہیں کر سکتی تھی' سو فیضان کو اس نیکی سے منع کر دیا' یوں بھی مامی جو نظارہ دیکھ رہی تھیں وہ اپنے آپ میں مکمل تھا۔ ثوبیہ کی گنجائش تھی ہی نہیں۔

"او۔۔۔ کافی پڑھا کو لگتی ہیں۔"

"اس کی چار آنکھوں سے نہیں لگتا آپ کو۔" اس کا اشارہ ثوبیہ کے چشمے کی طرف تھا۔ دونوں پورچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"چار آنکھیں؟" فیضان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

زکا کی حسرت بھری اور مامی کی چنگاریاں چھوڑتی نظروں نے دونوں کو گاڑی میں بیٹھنے تک دیکھا تھا۔



اسوہ سے لاتعلق رہنے کے جتنے بھی ارادے باندھے تھے وہ اسوہ کی فیضان سے نزدیکیاں دیکھ کر دھڑام ہوگئے۔ تبھی تو اس دن لاؤنج میں سے گزرتی اسوہ پر نظر پڑی تو اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر کھینچتا ہوا کوریڈور کے آخری سرے پر لے گیا' جہاں فی الوقت کسی کی نظر نہیں پڑسکتی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" بازو چھڑا کروہ غرائی تھی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" خود پر کنٹرول کر کے وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔" وہ بدلحاظی سے بولی تھی۔

"میں نے تم سے پوچھا نہیں ہے۔" اندر سے اٹھتے ابال کو دبا کر ذکا نے دانت پیسے۔

"اتنے بہادر تم کب سے ہوگئے تنہائی میں مجھ سے بات کرنے لگے؟" وہ اس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔

"تم اتنی بہادر کب سے ہوگئیں' جس کسی کے ساتھ جب دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر چلی جاتی ہو؟"

"جس کس کے ساتھ نہیں' مامی کے بھانجے کے ساتھ۔" اس کے لہجے کا سکون ذکا کا سکون غارت کررہا تھا۔

"ایسا اعتبار تم نے مجھے کبھی نہیں سونپا؟" وہ کاٹ دار لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"تم نے اتنا اعتماد ہی نہیں دیا۔" اسوہ کی مصنوعی دلیری کو اس ایک سوال نے ٹھوکر لگائی تھی۔

ذکا دانت بھینچ کر چپ اور اداس اسے دیکھتا رہا۔ وہ اتنی سنگدل' اتنی اجنبی ہورہی تھی کہ بازپرس کرنے والے سارے الفاظ مر گئے۔

"ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے تم نے کبھی مجھے غور سے نہیں دیکھا۔" بہت دکھ بھری شکوہ کناں نظروں سے ذکا کی آنکھوں میں دیکھ کر اس نے کہا اور پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کے آگے رکاوٹ کھڑی کی۔

"اور..." گہری سانس لے کر وہ بالکل نارمل ہوگئی تھی۔ "فیضان کو یہ تک پتا چل گیا کہ ریڈ کلر مجھ پہ بہت سوٹ کرتا ہے۔" بڑے ذومعنی لہجے میں جتاتی وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ ذکا کے دل کا بوجھ بڑھا کے۔



فیضان اور اسوہ ایک دوسرے کو اہمیت دے رہے ہیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ مامی کے شب و روز بے چین و مضطرب گزرنے لگے۔ وہ چند دنوں کی خوش اخلاقی' چہرے کا نکھار سب غائب ہوگیا تھا۔ ابھی بھی کچن سمیٹتے ہوئے وہ کام کم کررہی تھیں' دکھڑے زیادہ رو رہی تھیں۔

"پرواہی نہیں کسی کو... کولہو کے بیل کی طرح جتی ہوئی ہوں' نوکرہوں نا سب کی۔" تب ہی ثوبیہ ہوائیاں اڑاتے چہرے کے ساتھ کچن میں داخل ہوئی۔

"مما! میری بک رکھی تھی باہر صوفے پر۔ اب نہیں مل رہی۔" ابھی بھی وہ یہاں وہاں ایسے دیکھ رہی تھی جیسے یہاں پڑی ہو۔

مامی کا پارہ اور چڑھ گیا۔

"ہاں پڑی تھی... میں نے اٹھا کر واشنگ مشین میں ڈال دی۔" وہ حقیقتاً خونخوار نظروں سے دیکھ کر بولیں۔

"مما!" ثوبیہ نے منہ بسور ڈالا۔

"یہی کتابیں پڑھ پڑھ کر آنکھوں پہ عدسے لگوا لیے دوربین کے... اب کیا سر سفید کرنا ہے؟"

"مما! کیا کہہ رہی ہیں؟" مامی کا غصہ بے وقت اور اچانک تھا' ثوبیہ روہانسی ہوگئی۔

"میں کہہ رہی ہوں... فیضان کو آئے کتنے دن ہوئے ہیں اور تم نے ڈھنگ کی چار باتیں بھی نہیں کیں اس سے۔" مامی کا بس نہیں چل رہا تھا ثوبیہ کو کسی بھی طرح سیدھا کردیں۔

"میں کیوں کروں ڈھنگ کی باتیں؟" ثوبیہ منمنائی۔ مامی نے سر پیٹ لیا۔

"آپ ہیں نا۔" اب مامی کا دل چاہا کس کر چانٹا لگا دیں۔

"آپ ہیں نا۔" مامی نے ہوبہو اس کی نقل اتاری۔ "اس نے مجھ سے نہیں تم سے شادی کرنی ہے۔"

"شا... شادی۔" ثوبیہ کا منہ کھل گیا۔
"ہاں... شادی۔" مامی نے پتیلا پٹخ ڈالا۔



اس رات اتنی ٹھنڈ نہیں تھی۔ وہ چاروں لان چیئرز پر بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب سے زیادہ زبان اسوہ کی چل رہی تھی۔ فیضان بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ثوبیہ کو بھی مخاطب کرلیتا۔ جو ڈھنگ کی باتیں سوچتے سوچتے ہلکان ہوئی جارہی تھی کہ جنہیں کرکے اس مقناطیس کو پھانسا جائے جو آج بلا اجازت دل میں اتر رہا تھا۔

ذکا مکمل طور پر سنجیدگی سوار کیے ہوئے تھا۔ فیضان کے ایک، دو بار پوچھنے پر سر درد کا بہانہ بنا کر خود سے اس کا ارتکاز ہٹانے میں کامیاب ہوگیا تھا اور جس کے ارتکاز کی خواہش ہو رہی تھی، وہ ادھر ادھر کی اوٹ پٹانگ فیضان سے تو شیئر کر رہی تھی اور اس پر ایک نگاہ غلط تک ڈالنا حرام کیے بیٹھی تھی۔

"فیضان بھائی ہو جائے پلیز۔" اسوہ بڑے لاڈ سے فرمائش کر رہی تھی۔ ذکا بے تاثر سا کافی کے مگ کو تکے گیا۔

"آج نہیں... آج موڈ نہیں بن رہا۔" فیضان نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"موڈ نہیں بن رہا۔" اسوہ نے آنکھیں پھیلالیں۔ "اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے، اوپر چاند چمک رہا ہے، سب ایک ساتھ ہیں، سنا بھی دیں۔"

"گلا بھی ٹھیک نہیں ہے۔" فیضان نے باقاعدہ گلا کھنکھار کر ثبوت دینا چاہا۔

"جیسا بھی ہے آپ سنائیں، ثوبی تم کہو نا۔" اسوہ نے گم صم بیٹھی ثوبیہ کی مدد چاہی۔

"کیا؟" وہ اپنے خیالات میں تھی، بوکھلا کر پوچھا تو اسوہ نے سر پیٹ لیا۔

"اوہ... گانا سنانے کا کہو۔"

"سنادیں فیضان بھائی! اچھا سا۔" اپنا چشمہ ٹکاتے ہوئے ثوبیہ نے قدرے ہچکا کر کہا۔

"اچھا سا۔" فیضان کو ہنسی آگئی۔ "اوکے۔"

کچھ دیر خاموش رہ کر موڈ بنایا، اور پھر عاطف اسلم کا۔

مل کے بھی ہم نہ ملے تم سے نہ جانے کیوں
میلوں کے ہیں فاصلے تم سے نہ جانے کیوں
کیسے بتائیں کیوں تجھ کو چاہیں، یارا بتا نہ پائیں

گایا تو محفل سے بے زار ہوا ذکا بھی متوجہ ہوگیا۔ فیضان کی آواز پر عاطف اسلم کی آواز کا گمان ہو رہا تھا۔ ذکا نے یوں ہی اسوہ کو دیکھا۔ اس کی بھی نظریں ارادتاً اٹھی تھیں۔ ذکا کی نظروں سے جھانکتا محبت کا جہاں اسے سحر زدہ نہ کردے، گھبرا کر نظروں کا زاویہ بدل ڈالا۔

ذکا کے دل سے آواز نکل رہی تھی کہ یہ گانا میں تمہارے نام کرتا ہوں۔ اور اس کے دل کی زبان سمجھتی اسوہ اب خود گھبرائی بیٹھی تھی کہ فیضان سے گانے کی فرمائش ہی کیوں کی۔

یہ لوگ سیڑھیوں سے قریب ہی تھے۔ آواز سن کر مامی بھی برآمدے میں آگئیں۔ اور ایک بار پھر منجمد ہوگئیں۔ جو سماں بندھا ہوا تھا۔ وہ ثوبیہ کے لیے یقیناً نہیں تھا۔ جس کے لیے تھا اس کے لیے مامی سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھیں۔



مامی کے چہرے پر چھائی وحشت ماموں کو ہولا رہی تھی۔ درحقیقت وہ جس طرح بکھری بکھری اور شکست خوردہ سی نظر آرہی تھیں اپنی اٹھائیس سالہ رفاقت میں ماموں نے انہیں اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہاری ہوئی بیٹھی تھیں۔ مگر تسلیم کرنے کا خوف ان کے چہرے پر لرزاں تھا۔

ماموں کو ان پر ترس سا آیا۔ بے وجہ کی ضد میں آکر انہوں نے بیٹے سے تو خوشی چھینی ہی تھی، بیٹی کی بھی راہ مسدود کرنے کا باعث بن گئی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے۔" ماموں نے کچھ کہنے کی خاطر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ خود بول اٹھیں۔

"فیضان کا رجحان اسوہ کی جانب ہے۔" بتاتے ہوئے



مامی کی آواز بھرا گئی۔

"ایسا ہی ہونا تھا۔" ماموں طنزاً گویا ہوئے۔ "بری نیت کا انجام اچھا کب ہوتا ہے؟"

مامی نے تڑپ کر ماموں کو دیکھا۔ جھلملاتی آنکھوں کے سامنے دھندلا چہرہ تھا۔ آنکھیں میچیں تو ایک ساتھ کئی آنسو چھلک پڑے۔ ماموں یہی چاہتے تھے وہ رودیں۔

"اپنی بیٹی کی خوشی کا سوچنا بری نیت ہے کیا؟" ان کا گلا رندھ گیا۔

"دوسری بیٹی کا رستہ روک کر اپنی بیٹی کا رستہ ہموار کرنا کہاں سے اچھی نیت ہے؟" مامی پر خود احتسابی کے در وا ہونے لگے۔

آنکھوں کے سامنے فلم ری وائنڈ ہو کر چل پڑی تھی۔ اسوہ کے ماں' باپ کی اچانک حادثاتی موت' اس کا یہاں آنا' مامی کا اسے قطعی کوئی توجہ نہ دینا' ثوبیہ پیدائش کے بعد اور زیادہ بری نظروں اور بدزبانی سے چھلنی کرنا کہ ثوبیہ کے مقابلے میں وہ بہت حسین تھی' اور ثوبیہ بے حد معمولی صورت کی۔

دونوں کی ایک جیسی ڈریسنگ کے باوجود بھی اسوہ سب کا دل موہ لیتی تھی اور ثوبیہ پس منظر میں رہ جاتی تھی' پھر ذرا بڑی ہوئی تو ذکا کی توجہ کی وجہ سے مامی کی ڈانٹ پھٹکار' تھوڑی اور بڑی ہوئی تو ذکا کو اس کے سائے سے بھی بچانے کے لیے اس پر لگائی مختلف بندشیں' اور نت نئے رشتوں کی آمد' مامی کی آنکھوں سے سیل رواں تھا۔

"ٹھیک ہے' یہاں پیدا نہیں ہوئی تھی' لیکن پلی بڑھی تو اس گھر میں نا۔"

لوہا گرم دیکھ کر ماموں ایک کے بعد ایک جذباتی ضرب لگاتے گئے۔ مامی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھیں۔

"تم نے شروع دن سے آج تک اسے غیر سمجھ کر دیکھا۔۔۔ ہمیشہ کڑوی زبان استعمال کی' جیسے وہ تمہاری جائیداد چھیننے آگئی ہو۔" ماموں برابر بھڑاس نکالتے رہے۔

مامی آئینے میں موجود اپنے عکس پر نگاہ جمائے ہوئے تھیں۔ "اور دیکھو۔۔۔ تمہاری ایک نہ چل سکی۔" ماموں استہزائیہ ہنسے۔ "نہ تدبیر' اور نہ کوئی تخریب۔" ماموں نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ "قدرت کی کرنی سے' تمہاری سب سے بڑی جائیداد تمہارا بیٹا اسوہ کے نام ہونے کے لیے مچل گیا۔"

مامی کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"تم اسوہ کو کس خوف کے تحت ریجیکٹ کرتی آئی ہو؟" عکس سوالیہ ہوا۔ "صرف اس وجہ سے کہ اس میں تمہیں اپنا آپ نظر آتا ہے؟" مامی ششدر تھیں اس انکشاف پر۔ "تمہیں یہ خوف لاحق رہا کہ جیسے تم نے اپنی ساس سے اس کا بیٹا چھین لیا' بالکل ویسے' اسوہ بھی تم سے تمہارا بیٹا چھین لے گی؟" ضمیر کی آواز تلخ تھی' مامی کو اذیت پہنچنے لگی۔ "کیونکہ اسوہ میں تمہیں اپنا آپ نظر آتا ہے۔" آنسو جھر جھر بہنے لگے۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ سچ ہے۔" روتے ہوئے کہتی وہ بیڈ پر ڈھے گئیں۔ ماموں نے تاسف سے دیکھا تھا۔

"لیکن میری ثوبیہ۔۔۔" دکھ سے چور آنسوؤں بھری آواز میں انہوں نے کہنا چاہا۔

"جس کے لیے رشتے آکر پلٹ جاتے ہیں' جسے اپنے' اپنانے پر راضی نہیں۔" مامی کی یہ آہ بکا ماموں کا دل کاٹ رہی تھی۔

"وہ ساری زندگی کے لیے نامراد رہ جائے؟" اس سوال میں چھپی حسرت' یاس ماموں کو بھی تڑپا گئی۔

مامی کے آمرانہ رویے کے تابوت میں فیضان کی وہ فون کال آخری کیل ثابت ہوئی' جسے سننے کے بعد مامی خود احتسابی کے اس دور سے گزری تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں سب کچھ مرضی ومنشا کے مطابق نہیں ہوتا' اور وقت بھی اپنی چال خاموش چاپ کے ساتھ چل جاتا ہے۔

فیضان اپنی ماں سے کہہ رہا تھا کہ اسے جو لڑکی پسند آئی ہے وہ بہت انوسینٹ ڈفرنٹ اور پیاری ہے۔ جس کا نام وہ انہیں خود امریکہ آکر بتائے گا۔ مامی جان' جان چکی تھیں وہ لڑکی اسوہ کے علاوہ کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

☆ ☆ ☆

فیضان کی واپسی کی تیاریوں نے سب کو افسردہ کردیا تھا' اتنے دنوں سے اسے گھر میں 'ایک فرد کی جگہ بخوشی دے دی گئی تھی' اور اب وہ جانے لگا تھا تو سب کے دل رنجور ہو رہے تھے۔

"میری کل کی سیٹ کنفرم ہو چکی ہے۔" جس وقت دھیمی آواز میں وہ یہ بتا رہا تھا مامی اسی وقت کچن سے لاؤنج میں آرہی تھیں' آزردہ اور کبیدہ۔

"پھر میں اماں کو ساتھ لے کر آؤں گا۔" ماحول کی گمبھیرتا کم کرنے کے لیے اس نے گویا خوش خبری سنانی چاہی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ عرصہ ہوا تمہاری ماں کو دیکھے ہوئے۔" نانی مسکرائی تھیں۔

"کس سلسلے میں؟" مگر مامی کے دل میں چبھی پھانس نے انہیں مسکرانے بھی نہیں دیا۔

ذکا کے صوفے کے قریب کھڑی ہو کر انہوں نے جس سنجیدگی سے بلاوجہ پوچھا اس سے فیضان گڑبڑا گیا اور باقی متعجب ہوئے۔

"آ... وہ۔" اس بے چارے سے جواب ہی نہ بن پایا۔ بھلا کیا بتاتا؟ مامی خود کیوں نہیں سمجھ رہی تھیں۔

"ایکچوئیلی میں نے اماں سے ذکر کیا تھا کہ......"

گہری سانس لے کر خود کو سنبھال کر فیضان نے کہنا شروع کیا تو جیسے مامی کا دل مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ وہ سب کچھ سننے جا رہی تھیں جو سننا نہیں چاہتی تھیں۔

بے ساختہ ثوبیہ کو دیکھا۔ وہ بھی فیضان کی واپسی سے اداس ہوئی بیٹھی تھی۔

"خالہ مجھے۔" فیضان نے جھجک' ہچکچاہٹ پھر کسی وقت پر اٹھا رکھتے ہوئے ڈائریکٹ مامی کو مخاطب کیا' مامی بالکل دم سادھے بیٹھی تھیں۔ "میں آپ سے۔"

"لیکن اسوہ تو منسوب ہے۔" فیضان کی بات پوری ہونے سے پہلے مامی جیسے ڈراؤنے خواب سے جاگ کر بنا سوچے سمجھے ہڑبڑاتے ہوئے تیز لہجے میں بولیں۔

پورے لاؤنج کو سانپ سونگھ گیا۔ فیضان غریب خود اس اچانک حملہ پر ہکا بکا ہو بیٹھا تھا۔

"مم۔ میرے....." کسی پر بھی نگاہ ڈالنے کی غلطی کیے بغیر وہ فیضان کو مرکز نگاہ بنائے' ساکت پتلیوں اور سرسراتی آواز میں بولیں۔ "میرے ذکا کے ساتھ۔"

اور جیسے زمین آسمان ہل گئے ثوبیہ کے ہاتھ سے کتاب تو ماموں کے ہاتھ سے ریموٹ چھوٹ گیا۔

نانی کی بوڑھی سماعتوں کو کمزوری نے سن کر دیا انہیں لگا شاید سننے میں غلطی ہو گئی۔ مگر ایک وہ غلط سن سکتی تھیں سب تو نہیں' یہاں تو سب کے کان اور آنکھیں کھل گئی تھیں اور جن کی ذات کو موضوع بنا کر اتنا بڑا فیصلہ سنایا گیا تھا۔ ان کے رد عمل کے کیا کہنے....

اسوہ کی شکل یوں بنی ہوئی تھی جیسے عموماً" وہ انگلش ڈراؤنی فلموں کی بدروحوں' چڑیلوں یا ویمپائر کو دیکھ کر بنا لیتی تھی' آنکھیں ابل کر باہر نکلنے کو بے تاب اور جسم پر کپکپی تھی۔

ادھر زکا کو لگا زمین گھوم رہی ہے' آسمان سر پہ آرہا ہے۔ حقیقتاً اسے چکر آرہے تھے۔

ایک ان ہونی اچانک ہوئی ہو کر سامنے آئی تھی سو رد عمل بھی ان ہونا ہی ہونا تھا۔ اور فیضان اس کی عقل بھی فی الحال کام کرنا چھوڑ چکی تھی۔

"یہ بات......"

ارد گرد کیا ہو رہا ہے؟ سب کیا سوچنے لگے ہیں؟ کسی کے بھی تاثرات جاننے کی کوشش کیے بغیر مامی رٹے ہوئے سبق کے ساتھ ابھی بھی جاری تھیں۔ جیسے کسی روبوٹ میں چابی بھر دی گئی ہو

"صرف انہیں۔" انہیں سے مطلب ماموں.... جواب بالکل پرسکون اور شاداں فرحاں ہو چکے تھے۔ "اور مجھے معلوم ہے بچوں کو ابھی ہم نے نہیں بتایا۔"

زمین کے ساتھ ساتھ زکا کو لگا وہ خود بھی چکرا رہا ہے۔ خوشی بالکل غیر متوقع تھی۔ اسی لیے الٹا ہی اثر کر رہی تھی۔

"ہم نے سس... سوچا' وقت آنے پر سب کو پتا چل جائے گا۔ گھر کی بات ہے بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن......"

لیکن اس کے بعد دھماکا ہو گیا۔ زکا ایک طرف لڑھک چکا تھا نانی اور ماموں لپک کر اس کے پاس گئے۔

"ابے یار!" ماموں ہاتھ سے پنکھا جھلتے ہوئے مسکرائے لہجہ کھنک رہا تھا۔

"یہ کوئی بات ہے بے ہوش ہونے کی... اٹھ میرا بیٹا! شیر بن۔" نانی نے پھونکیں ماریں' ماموں نے گال تھپتھپائے تب کہیں جا کر وہ اٹھا۔ پلکیں جھپک جھپک کر صورت حال سمجھی اور اگلے ہی لمحے ماموں کے سینے سے جا لگا۔

"ڈیڈی.... ڈیڈی!" لہجہ بالکل ستر کی دہائی کے ہیروز والا ہو گیا تھا۔

"گلے بعد میں ملنا یار! ابھی بہت وقت ہے۔" ماموں نے پیٹھ تھپک کر اسے جیسے یقین دہانی کرائی۔

اسوہ ابھی تک ساکت و صامت تھی۔ نظریں جہاں تھیں وہاں سے ہٹنا بھول گئی تھیں۔ نانی کی پھونکیں اب مامی پر اڑنے لگیں اعتبار نہیں تھا کب ارادہ بدل ڈالیں۔ سو انہیں بھی پکا کرنا تھا۔

"ہاں.... ہاں.... بہت گڈ نیوز ہے لیکن.... میں تو۔" ہلچل قدرے تھمی تو نقار خانے میں فیضان بے چارگی سے کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ سب سے پہلے مامی متوجہ ہوئیں پھر باقی سب۔

"میں تو آپ سے ثوبیہ کے لیے بات کر رہا تھا۔"

جس جلد بازی سے مامی نے اسوہ اور زکا کے منسوب ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ رفتار سے فیضان نے اپنے دل کا مدعا بیان کیا' یہ خوف سوار کہ کہیں مامی اب ثوبیہ کی بھی بھولی بسری نسبت سے مطلع نہ کر دیں۔

اس بار مامی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ثوبیہ نے بھی ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

"میں نے تو اماں کو بھی بتا دیا کہ آئی.... آئی لائک ثوبیہ۔"

کچھ بھی تھا خمیر مشرق تھا بھرے مجمع میں بیٹھ کر اعلان محبت کرتے اگر امریکن پلٹ ہونے کا ثبوت دیا تو نظریں نیچی اور لہجہ مدھم کر کے مشرقیت کا ستارہ بھی سجا لیا۔ اب مامی پر ان ہونی اثر پزیر ہو رہی تھی۔

زکا اور اسوہ کی طرح وہ خوشی کے مارے غیر یقین اور چکرا بھی رہی تھیں۔ اور اپنی جلد بازی کا بھاری بھرکم غم بھی طوق بن کر گلے میں لٹکا بیٹھی تھیں۔ تب ہی تو... دو لمحوں میں مامی بھی لڑھک گئیں۔

ماسوائے اسوہ اور زکا کے سب ان کی طرف بھاگے زکا اب فارم میں آچکا تھا۔ اسوہ کی غصیلی ماتھے تک ٹیڑھی آنکھوں کی پروا کیے بغیر بڑی فرصت محبت سے

دیکھ رہا تھا۔

"بیگم... بھئی بیگم!" بے ہوش بیگم کو ہوش میں لانے کے لیے ماموں اپنی سی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ "بیگم نہ کرو ناں... دیکھو... خوشی کے موقع پر بے ہوش ہونے کی نئی روایت ڈالی ہے تم ماں بیٹے نے۔"

مگر مامی ہنوز بے ہوش۔



"تم" بجتے دروازے کو کھولا تو سامنے مسکراہٹ سجائے ذکا پر نظر پڑتے ہی وہ چلائی ذکا نے مزے سے بھنویں اچکائیں۔

"میرے کمرے میں؟"

"کیوں... یہاں کرفیو نافذ ہے؟" وہ زیادہ پھیل کر کھڑا ہو گیا۔ ٹیک لگا کر۔

"ہٹو نکلو... مامی آ گئیں تو؟" اسوہ اب نئے کسی محاذ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اللہ اللہ کر کے تو بات بنی تھی۔

"تو کیا ہو گا؟"

"بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔" اس کی ڈھٹائی پر اسوہ نے دانت پیسے۔

"پروا نہیں۔" وہ یوں بولا جیسے سارے محاذ سر ہو گئے ہوں اسوہ جھنجلا کر چپ ہو گئی۔

"تم نے اتنا تنگ کیا ہے۔" وارفتہ نظریں، بدلتا لہجہ۔ اسوہ اس بات سے گھبرا رہی تھی۔

"تم سے وہ دو دو ہاتھ بھی تو کرنے ہیں۔" وہ دلچسپی سے اس کی سرخ پڑتی رنگت دیکھ رہا تھا۔

"کب تنگ کیا؟"

"پورا مہینہ ٹینشن دی ہے تم نے مجھے۔" ذکا نے مصنوعی منہ پھلایا تھا۔

"اور تم نے جیسے مجھے مٹھائیاں کھلائی ہیں۔" کترینہ کیف سے اس کے نہ ہو سکنے والے رشتے کی یاد آئی تو غم و رنج بھول کر نئے سرے سے جنگ کا آغاز کیا۔ "مزے سے دلہا بننے جا رہے تھے۔"

"وہ تو میں اب بن رہا ہوں۔" مزے سے کہا تو اسوہ کی زبان پھر چپ ہوئی۔ اگلے ماہ کی بائیس تاریخ کو یہ شادیانے بجنے تھے۔ ثوبیہ اور اس کے ایک ساتھ۔

"تمہارا... اور صرف تمہارا۔" ماتھے پر جھولتی اس کی آوارہ لٹ کھینچ کر وہ شوخی سے بولا تو اسوہ کچھ اور سمٹ کر پیچھے ہٹی۔ پیشتر اس کے ذکا کی گستاخیاں دراز ہوتیں نانی واش روم سے نکل آئیں۔

"اے اسوہ... کون سا صابن رکھ دیا ہے موا آنکھوں میں گھس گیا۔" آنکھیں چندھی اسوہ کے قریب جا کر ذکا کو دیکھتے ہی تکلیف بھول کر کھل گئیں۔

"تم؟" نانی سخت لہجے میں بولی تھیں۔

"جی... اسوہ سے ملنے..."

"اسوہ سے ملنا جلنا بند۔" نانی پورے جلال میں تھیں۔

ذکا ٹھیک ٹھاک پریشان ہوا۔ اب جب ہر چیز سیٹ ہو گئی تھی۔ ایک اور ظالم سماج دیوار بن گیا۔

"شادی سے پہلے تمہارا اس سے پردہ ہے۔" ذکا کو لگا یہ مامی والے بدلے لے رہی ہیں۔

"میرا یا اس کا؟" وہ ہلکا سا چیخا۔

"اب جاؤ۔" نانی نے حقیقتاً آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

اسوہ کی دبی دبی ہنسی ذکا کا دل جلا رہی تھی۔ رخ پھیر کر اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ نانی سمجھیں چلا گیا۔ انھوں نے بھی صابن زدہ آنکھوں کو مزید دھونے کے لیے واش روم کا قصد کیا۔

"سنبھال کر رکھو۔" نانی قریب ہی تھیں ذکا نے موبائل اسوہ کے ہاتھ میں دے کر سرگوشی کی۔

"ہماری محبت کا کنکشن۔" کہنے کے بعد وہ تو چلا گیا۔ اسوہ آپ ہی آپ مسکراتی رہی۔



عنیقہ محمد بیگ



وہ عجیب، بہت عجیب سا ہو گیا۔ محبت نے اسے ایسے عجیب رنگ میں بھگو دیا کہ جو کوئی اسے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس کی زندگی اب گھڑی کی سوئیوں پر ٹک ٹک کر رہی تھی وہ اپنا ہر کام وقت پر کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اور اگر کوئی کام اس کا وقت پر نہ ہو پاتا تو اس پر عجیب سی وحشت طاری ہو جاتی۔۔۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔۔۔ اور شاید اس کے پاس سچ میں کچھ نہیں بچا تھا۔

اس کی زندگی۔۔۔ اس کی محبت نور۔۔۔

جو ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

نور جس لڑکی کو اس نے بے پناہ چاہا۔۔۔ وہ اسے کب۔۔۔ کیوں چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔۔۔ کبھی کبھی وہ سوچتا شاید وہ اس کی محبت کے قابل نہیں تھا۔۔۔ اور سچ بھی یہی تھا شاید۔

نور دل و جان سے اس کی تھی۔۔۔ مگر عاصم کی لاپروائی سے وہ دور بہت دور ہوتی گئی۔۔۔ محبت وقت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔۔۔ نور نے بھی اس سے ہمیشہ اس کا "وقت" ہی تو مانگا تھا۔ مگر بدلے میں ہمیشہ اسے انتظار ہی ملا۔۔۔ وہ ہمیشہ اس سے شکوہ کرتی۔ اور وہ نور کی بات پر کبھی سنجیدہ نہ ہوتا۔۔۔ شاید اسے اپنی محبت پر بہت غرور تھا۔۔۔ کہ وہ اس کی مٹھی میں بند رہے گی۔۔۔ مگر نور کے لیے محبت بے معنی سی ہو کر رہ گئی۔۔۔ ہر دفعہ اس کی آنکھیں اس کے چہرے کو کھوجتی رہتیں۔ کبھی وہ بزنس ٹور پر لندن۔۔۔ تو کبھی امریکہ۔۔۔ تو کبھی جاپان، کامیاب بزنس مین بننے کی دوڑ میں وہ جیت تو گیا۔۔۔ مگر اس سفر میں اس نے اپنی محبت کھو دی۔۔۔

نور نے اس کے نام کی انگوٹھی اتار پھینکی اور اپنے تایا زاد ہاشم سے بیاہ کر کے ہمیشہ کے لیے اپنی محبت کو دفن کر گئی۔ اسے یقین نہیں آیا تھا۔۔۔ جب بزنس ٹور سے وہ گھر واپس لوٹا تو اس کے ملازم اشرف بابا نے نور کی طرف سے بھیجا تحفہ اسے تھما دیا۔ اس نے بہت محبت سے تحفہ کھولا۔۔۔ مگر پھر اس میں منگنی کی انگوٹھی اور ایک خط میں بے شمار شکوے اور شادی کی خبر پڑھتے اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔۔۔

وہ بار بار اس کے نمبر پر کال کرنے لگا۔۔۔ دوسری طرف نمبر بند جانے پر اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔۔۔ اس نے بے چینی سے نور کی والدہ کو کال کی۔۔۔ دوسری طرف شاید وہ اس کی منتظر بیٹھی تھیں، بے شمار شکوے سننے کے بعد اسے پھر یقین ہو گیا کہ یہ مذاق نہیں تھا۔۔۔ بلکہ وہ سچ میں اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

اور ان دونوں کی جدائی کا سبب وقت تھا۔۔۔ اس کا قیمتی وقت۔

وقت نے اس سے اس کی نور چھین لی۔۔۔ جو اس کی زندگی تھی، اس کی زندگی کا اب سب سے بڑا دشمن اس کا اپنا وقت تھا۔۔۔ وہ نور کی جدائی کے بعد وقت کا ایسا پابند ہوا۔۔۔ جیسے وہ وقت کو ہرانا چاہتا ہو۔

اس کے گھر کے ملازم۔۔۔ آفس ورکرز سب جانتے تھے کہ عاصم گھڑی کی سوئیوں پر چلنے والا شخص ہے اور جو لوگ وقت پر نہیں چلتے۔۔۔ وہ انہیں خود سے دور کر دیتا۔

اپنی اس عادت کی وجہ سے اس کے کئی دوست چھوٹ گئے ـــــــــ مزید اور کیا کیا اس کی زندگی میں ہونا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا اور اب جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔



"حد کرتی ہو لڑکی!... چادر لینے کا بھی ڈھنگ بھول گئی ہو۔ چادر گردن پر لپیٹنے کے بجائے شانوں پر اوڑھو۔" فرخندہ نے غصے سے رانی کو دیکھتے اپنی بڑی چادر کو خود پر لپیٹا۔

"اماں... ایک تو آپ بھی ناں... جینے نہیں دیتیں یہ کرو وہ نہ کرو' حد ہے زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا... اور آپ...؟"

"اف... بک بک مت کرو... جیسا میں کہہ رہی ہوں... ویسا کرو... اور جلدی کرو۔" فرخندہ نے آنکھیں دکھائیں۔

"اماں... چلتے ہیں ناں اتنی جلدی کس بات کی ہے۔" وہ تیزی سے چپل پہننے لگی۔

"تجھے کچھ نہیں پتا... صاحب وقت کے بہت پابند ہیں۔ پہلے دن ہی دیر سے پہنچے تو ملازمت گئی۔" فرخندہ جو بیمار رہنے کی وجہ سے اب اپنی جگہ پر رانی کو لگوانا چاہتی تھی... اس کی حرکتوں پر فکرمند تھی...

اس نے تیار ہونے کے بعد تیزی سے الماری کھولی اور اپنا سیل فون چھوٹے سے بیگ میں ڈالا۔

"یہ کمبخت ساتھ نہیں جائے گا... اسے گھر پر رکھو۔" فرخندہ نے غصے سے چبا کر کہا۔

"اماں... کام ختم ہو گا تو میں آپ کو فون کر کے بلوالوں گی نا۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا... وہ گھبرا گئی تھی کہ سیل فون گھر پر چھوڑ دیا تو قاسم کو فکر پڑ

جائے گی۔

فرخندہ غصیلی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"اماں... کیا ہو گیا ہے؟ قسم سے سارے کام وقت پر کروں گی۔ لے جانے دو اماں!" اس نے ماں کی منت کی۔

"تجھے صاحب کا نہیں پتا... ایک منٹ بھی کہیں کام میں اوپر نیچے تو نے کر دیا تو میرے ہاتھ سے یہ ملازمت گئی... اور یہ ملازمت گئی تو اس گھر کا چولہا بند ہو جائے گا... اب بڑھاپے میں اپنے ماں باپ سے بھیک منگوائے گی کیا؟"

"اوہو... اماں... اب ایسا بھی کچھ نہیں ہو جائے گا۔ اعتبار نہیں ہے مجھ پر؟" وہ الٹا ناراضی سے بولی۔ مگر ساتھ ہی بیگ میں سے سیل فون نکال کر ماں کو تھما دیا۔

فرخندہ کے چہرے پر سکون کی لہر چھا گئی... اور اس نے سیل فون دوبارہ اس کی الماری میں رکھ دیا... اور فکر مندی سے گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"چل جلدی نکل۔"

"اماں! تمہارے صاحب کیا ہٹلر ہیں؟" اس نے جل کر پوچھا۔

"چپ چاپ چل بس... زیادہ باتیں نہ بنا۔" فرخندہ نے تیزی دکھائی گھر پر تالا لگایا اور چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں رکشے پر سوار ہو گئیں...

"اماں... صاحب کے کتنے بچے ہیں؟" اس نے یونہی سوال کیا۔

"بچے نہیں ہیں... اور سن! صاحب کے متعلق کسی بھی ملازم سے کچھ نہ پوچھنا۔" فرخندہ نے ڈپٹا۔

"کیوں؟ انہوں نے شادی نہیں کی؟" وہ تجسس سے بولی۔

"اری لڑکی... نوکروں کا کام صرف کام کرنا ہوتا ہے... ان کی ذاتی زندگی پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔"

"پھر بھی اماں! کچھ تو بتا..." وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"اچھا پہلے وعدہ کر... مجھے شکایت کا موقع نہیں دے گی۔" فرخندہ نے اس سے وعدہ مانگا... جو اس نے جھٹ سے دے دیا۔

"صاحب بیچارے کو محبت نے ایسا کر دیا... سنا ہے... ان کی منگیتر انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔"

"وہ کیوں؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"میں یہ نہیں جانتی..." فرخندہ نے آنکھیں دکھائیں۔

"نام کیا تھا اس کا؟"

"نور۔"

"کتنا پیارا نام ہے۔ اماں! کاش آپ بھی میرا نام سوچ سمجھ کر رکھتیں... رانی ایسی رانی جس کی کوئی حویلی نہیں۔"

اس نے معصومیت سے کہا تو فرخندہ کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی... اس نے دوسری طرف منہ کر لیا۔ اسے پہنچنے کی جلدی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ رکشے سے اتری تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنا شان دار بنگلہ اس نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ایسے گھر تو کبھی خوابوں میں بھی نہ دیکھے تھے۔

"اماں! تو اس محل میں کام کرتی ہے؟" سفید سنہری رنگوں سے سجا یہ بنگلہ آس پاس کے تمام بنگلوں کو مات دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ منہ سے آواز بھی سرسراتی ہوئی نکل رہی تھی۔

"بس کر۔ ایسے پاگلوں کی طرح مت دیکھ... چپ چاپ پیچھے پیچھے آ میرے۔" فرخندہ نے ڈپٹا اور اپنے قدم باورچی خانے کی جانب بڑھا دیے جو اس کا اصل ٹھکانا تھا۔

وہ باورچی خانہ دیکھ کر پھر حیران ہو گئی... اتنا بڑا باورچی خانہ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا... ہر چیز اپنی

جگہ سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ وہ باورچی خانے کی لمبائی چوڑائی دیکھتے اندازہ کرنے لگی اس کا تو پورا گھر باورچی خانے جتنا ہو گا۔ فرخندہ کے علاوہ اس باورچی خانے کا کام کلثوم بھی دیکھتی تھی ـــــ فرخندہ نے جاتے جاتے رانی کو سمجھا دیا۔ کہ کلثوم کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹانا۔

مگر رانی نے محسوس کیا... کلثوم اس بات کا زیادہ ہی فائدہ اٹھانے لگی۔ بنگلہ اتنا بڑا تھا کہ کام کرتے کرتے اسے وقت کا علم نہ ہو سکا... مگر اس نے ماں کے حکم کے مطابق بہت توجہ سے کام کیا تھا۔

شام کے چھ بج رہے تھے... جب گھر کے سارے ملازمین مستعد سے ہو گئے۔

یہ وقت عاصم کے گھر آنے کا تھا...

کلثوم کے کہنے کے مطابق اس نے تمام کھانے کی چیزیں تیار کرلی تھیں۔ کھانا وہ فرخندہ سے بھی اچھا بنا لیتی تھی۔ مگر پھر بھی وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔

گاڑی کا ہارن بجا۔ اس نے باورچی خانے کی کھڑکی سے باہر جھانکا... گارڈ نے سلام کر کے گیٹ کھول دیا... سفید چمکتی گاڑی شان سے اندر داخل ہو گئی۔

وہ گاڑی کے دروازے کو بے تابی سے دیکھنے لگی... وہ عاصم کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اور پھر آخر کار وہ گاڑی سے باہر نکلا... سیاہ رنگ کے پینٹ کوٹ میں وہ بہت باوقار لگ رہا تھا... پھر اس کی نظریں اس پر سے نہ ہٹ سکیں۔ جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوا۔

"اری لڑکی... کہاں کھو گئی ہے... جلدی سے پانی لے کر جا۔" کلثوم نے اسے کہا... اور خود سلاد تیار کرنے لگی... جو اس کا روز کا کام تھا۔

"میں... میں لے کر جاؤں گی خالہ!" وہ گھبرا کر بولی۔

"ہاں... بی بی تم ہی لے کر جاؤ گی... اور صاحب کو بھی تم خود ہی اپنے متعلق۔ بتاؤ گی؟" کلثوم نے اس پر واضح کر دیا کہ اس گھر میں ہر کوئی اپنی محنت سے مقام بناتا ہے۔

وہ پانی لے کر ٹھیک ساڑھے چھ بجے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ اندر سے ایک باوقار آواز ابھری...

"آجاؤ..."

وہ سہمی سہمی سی پانی لے کر اندر داخل ہو گئی۔

"جی السلام علیکم..." اس نے ٹیبل پر پانی رکھتے ہوئے کہا... اور نظریں جھکالیں۔

"وعلیکم السلام... تم رانی ہو...؟" اس نے سرسری سا دیکھ کر پوچھا۔

"جی... میں رانی... فرخندہ میری والدہ۔"

اس سے پہلے کہ وہ لمبی چوڑی تقریر کرتی...

اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اپنا کام کرتی رہنا... تم جا سکتی ہو۔"

رانی چپ چاپ کمرے سے باہر آ گئی اور لمبی سانس لے کر منہ میں بڑبڑائی... عجیب ہیں۔



"تمہیں کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں... میں جو ہوں... تم اب نہیں جاؤ گی۔"

وہ رات جب گھر واپس لوٹی تو اس کے نمبر پر قاسم کی بے شمار کالز اور میسجز آئے ہوئے تھے۔

"قاسم... ایسا کیسے ہو سکتا ہے... اماں کو ابھی تمہارا علم نہیں۔ میں کیسے تم سے مدد لے سکتی ہوں۔"

"تم اماں سے میری بات کرو..." وہ خفگی سے بولا۔

"نہیں میں اماں سے ابھی بات نہیں کر سکتی... وہ کیا سوچیں گی... کہ ابھی ایک دن میں کام پر گئی ہوں... اور ساتھ ہی شادی کی بات... نہیں نہیں... تمہیں میرا انتظار کرنا ہو گا۔" اس نے پریشانی سے جواب دیا۔

قاسم اس کی بات سن کر چپ ہو گیا۔ وہ پریشانی سے بولی۔

"قاسم میں تمہاری ہوں ۔۔۔ اور ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی ۔۔۔ مجھ پر یقین کرو۔" وہ اپنی محبت کا یقین دلانے لگی۔

"ہاں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ میں جانتا ہوں ۔۔۔ کہ تم صرف میری ہو ۔۔۔ مگر میں اس معاشرے سے ڈرتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کوئی چھین نہ لے۔" اس نے پیار سے جواب دیا۔ وہ پچھلے تین سال سے محنت کر رہا تھا کہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر رانی کو اپنا بنا لے گا۔

"مجھے کوئی تم سے جدا نہیں کر سکے گا ۔۔۔ صرف موت ہی ہو گی ۔۔۔ جو مجھے تم سے جدا کر سکے گی۔" رانی نے اپنی محبت کی انتہا بتا دی۔

"صاحب کے بنگلے جیسا تمہارے لیے بنگلہ بناؤں گا ۔۔۔" وہ عاصم کے بنگلے کی پہلے تعریف کر چکی تھی۔

"اچھا ۔۔۔ سچ پھر اسے میں اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی۔" وہ پر جوش سی ہو گئی۔

"تم دعا کرو ۔۔۔ شاید اللہ تمہاری دعاؤں سے مجھے سب کچھ دے دے ۔ جس کی خواہش میں رکھتا ہوں۔" اس نے پیار سے درخواست کی۔

"قاسم انشاء اللہ ۔۔۔ اللہ ہمارے حق میں بہتر کرے گا ۔۔۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ تم صاحب کی طرح کام میں اتنے مگن ہو جاؤ ۔۔۔ کہ تمہیں میں ہی یاد نہ رہوں۔" وہ فوراً "نور" کو یاد کر کے ڈر سی گئی۔

"خیریت ۔۔۔ ایسا کیوں کہہ رہی ہو ۔۔۔؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"صاحب کے پاس بے شک دولت بہت ہے ۔۔۔ مگر پھر بھی وہ غریب ہیں ۔۔۔ ان کی محبت "نور" ان کی زندگی سے چلی گئی ۔۔۔ میں نے اماں سے سنا ہے ۔۔۔ کہ صاحب انہیں وقت نہیں دے پاتے تھے ۔۔۔ ہر وقت کام' کام ۔۔۔ اور پھر۔" اس نے افسردگی سے بات چھوڑ دی ۔۔۔ اس کی سانس پھولنے لگی ۔۔۔ وہ صاحب کے چہرے کی اداسی بھول نہ پائی۔

"نہیں میں کبھی تمہیں بھول نہیں سکتا ۔۔۔ مگر خفا ضرور ہو جاؤں گا ۔۔۔ اگر تم نے کل سیل فون گھر پر چھوڑا ۔۔۔ تم اب ہر وقت اپنا سیل فون پاس رکھو گی۔"

اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"اچھا ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ مگر میں فون نہیں ۔۔۔ صرف میسجز پر بات کر سکوں گی۔" وہ ہنسی۔

"منظور ہے۔" وہ بھی ہنسا۔

اور پھر دونوں پیار کرنے والے دیر تک باتیں کرتے رہے۔

ایک ہفتہ سے اسے وقت کے ساتھ ساتھ چلنا پڑ رہا تھا ۔۔۔ صبح جلدی اٹھ جانا اور پھر ہر کام وقت پر کرتے کرتے وہ بیزار سی ہو گئی ۔۔۔ مگر سیل فون لے جانے کی وجہ سے وہ فریش سی ہو جاتی ۔۔۔ وہ اپنی ماں سے کچھ نہ کہہ سکی۔ مگر گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ چلتے۔ وہ تھک سی گئی تھی۔ ہر وقت اس کی نوکری کو خطرہ لگا رہتا تھا۔ یہ فکر ہی اس کے کام کرنے میں دشواری پیدا کر رہی تھی۔

اور ایک صبح اس کے پاؤں تلے زمین نکل گئی ۔۔۔ جب وہ ناشتے کی ٹرالی عاصم صاحب کے کمرے میں رکھ آئی تو اسے باورچی خانے میں آ کر یاد آیا۔ کہ وہ شوگر پاٹ تو ٹرالی میں رکھنا بھول گئی تھی ۔۔۔ اس نے کلثوم کو اس بات کے متعلق بتایا تو وہ اپنا دل تھام کر بیٹھ گئی۔

"اری لڑکی یہ ۔۔۔ یہ کیا ظلم کر دیا ۔۔۔ تم نے صبح صبح برباد کر دیا۔"

کلثوم خالہ تو رونے لگیں ۔۔۔ کیوں کہ صبح کا ناشتا وہ تیار کرتی تھیں' مگر آج انہوں نے رانی کو یہ ذمہ داری سونپ دی ۔۔۔ جس پر وہ اپنا سر پیٹنے لگیں۔

"خالہ ۔۔۔ میں ابھی شوگر پاٹ رکھ آتی ہوں۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"پاگل لڑکی ۔۔۔! ابھی تھوڑی دیر میں ہم دونوں کی چھٹی کا اعلان آتا ہو گا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی ۔۔۔

"خالہ! ابھی پانچ منٹ ہیں۔ صاحب پورے نو بجے ناشتا کرتے ہیں ۔۔۔ اور وہ ابھی اپنی لائبریری میں ہیں۔" اس نے تیزی سے شوگر پاٹ کھولا ۔۔۔ اور تھوڑی سی چینی اپنی مٹھی میں دبا کر بھاگی۔

"اللہ خیر کرے ۔۔۔ بچی کامیاب ہو جائے۔" کلثوم

نے وال کلاک کی طرف نظریں گاڑ دیں۔

وہ پاگلوں کی طرح سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کمرے میں پہنچی... مگر افسوس وہ کپ میں چینی نہ ڈال پائی... کیوں کہ عاصم پہلے ہی کمرے میں موجود تھا... اور یوں اس کے بغیر اجازت اندر داخل ہونے پر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" عاصم غصے سے بولا۔

"وہ... وہ۔" اس نے وہ ہاتھ دوپٹے میں چھپا لیا... جس میں تھوڑی سی چینی اٹھا لائی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں... جواب دو۔" اب کہ وہ بھرپور غصے میں تھا۔

"صاحب... وہ... وہ..." اسے برسوں اسٹور کی صفائی کرتے ہوئے ایک کارڈ ملا تھا... بس پر نور لفظ ہزاروں دفعہ لکھا ہوا تھا... اس نے بس اسی کارڈ پر بات شروع کر دی۔

"صاحب! وہ... وہ اسٹور میں آپ کی قیمتی چیزوں میں سے ایک قیمتی چیز رہ گئی تھی۔ میں نے بس آپ کو اس کے متعلق بتانا تھا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے ہی بات کر ڈالی... کہ اب صرف اس کی محبت ہی اس کا دھیان بٹا سکتی ہے... کیوں کہ وہ جانتی تھی... محبت ایسی دنیا کا نام ہے... جس میں سوچ نہیں بستی...

"کون سی قیمتی چیز۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ایک پرانا پھولوں کا کارڈ ہے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

"پرانا پھولوں کا کارڈ... وہ قیمتی چیز ہے؟" وہ چیخا... اب کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"صاحب... صاحب... اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔" اس نے دوبارہ ہمت باندھی... اور بول پڑی جبکہ عاصم کے سامنے اب اس کا وجود کانپ رہا تھا۔

"کیا لکھا ہے۔" وہ غصے سے گھورنے لگا۔ کہ جیسے رانی اس کو بے وقوف بنا رہی ہے۔

"صاحب... وہ 'وہ... نور... یہ لفظ اس کارڈ پر ہزاروں دفعہ لکھا ہوا تھا... اس لیے میں نے سوچا... کہ آپ کے لیے قیمتی چیز صرف آپ کا وقت ہے... اور نہ جانے اس کارڈ پر نور اتنی بار لکھتے وقت آپ کا کتنا قیمتی وقت لگا ہو گا... تو سوچا... کہ آپ سے اس بات کا ذکر کر دوں۔"

"نور..." برسوں بعد آج رانی کے منہ سے اس کے سامنے نور کا نام آیا تھا۔ اس کے چہرے سے غصہ ایک دم غائب ہو گیا... اور وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"صاحب... آپ ٹھیک تو ہیں۔" وہ اس کی خاموشی پر گھبرائی۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے حکم دیا... وہ آرام سے فرش پر بیٹھ گئی... کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے زبان کھولی۔

"نور میری محبت تھی... میری پہلی محبت... میں کبھی اسے نہیں بھول پایا... وقت نے مجھ سے میری نور چھین لی۔" پھر وہ اپنی اور نور کی پہلی ملاقات اس کو سنانے لگا۔

اس نے باتوں ہی باتوں میں کب پھیکی چائے پی لی... وہ نہیں جان پایا۔ جب کہ وہ سہمی بیٹھی غور سے اس کی چائے ختم ہونے تک کانپتی رہی۔

وہ پھیکی چائے کی چسکی لیتے لیتے اپنی محبت کو بیان کرتا رہا... آج وہ وقت کی قید سے آزاد ہو چکا تھا... اس کا سیل فون کئی بار بجا... مگر اس نے توجہ نہ دی... آخر کار اس محبت کی کہانی کو کلثوم کی دستک نے چونکایا... تو وہ اپنی دنیا سے باہر آ گیا۔

"صاحب! کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں؟" کلثوم نے شائستگی سے بتایا... اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا... وہ دو گھنٹے آفس سے لیٹ ہو چکا تھا اس نے کلثوم کو مہمانوں کو چائے دینے کا حکم دیا... اور پھر خود بھی خاموشی سے باہر چلا گیا۔

اس کی اٹکی سانس بحال ہوئی... اور وہ مٹھی جس میں تھوڑی سی چینی اس نے دبا رکھی تھی... اس نے مسکراہٹ کے ساتھ منہ میں ڈال لی... اور مسکرا کر بولی۔ "سچ میں محبت میٹھی سی ہوتی ہے... بہت میٹھی سی!"

☆☆

"سفید پھولوں سے ڈھکا۔ آپ کا گھر اتنا خوب صورت' گویا پھولوں سے بنا ہوا ہو۔" مسز سکندر کا لہجہ خاصا توصیفی تھا۔

"واقعی صالحہ بھابھی! پوری کالونی میں کسی گھر کی فرنٹ لک اتنی پیاری نہیں' جتنی آپ کے گھر کی' کالونی کے دوسرے گھروں میں بھی مختلف رنگوں کے پھولوں کی بیلیں موجود ہیں' لیکن آپ کے گھر پر سجے سفید پھول اتنا سکون آمیز تاثر دیتے ہیں کہ دل بے ساختہ آپ کے گھر کا رخ کرنے کے لیے مچل اٹھتا ہے۔" مسز توصیف نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"تو آجایا کریں نا۔ آپ کا اپنا ہی گھر ہے اور رہی بات سکون کی تو اس گھر کی خوب صورتی اور اس میں بسنے والا سکون صرف اور صرف میری بہو فاطمہ کی میری طرف اٹھنے والی نگاہوں میں ستائش ہی ستائش تھی۔

"معاملہ فہم۔" رات کو سونے سے پہلے میرے لبوں نے کئی بار اس لفظ کو سرگوشی میں ادا کیا۔ "آپ نہیں جانتیں امی! کہ بہو کے طور پر میری امی کی "کم فہمی" ہی میری معاملہ فہمی کا سبب بنی ہے۔ آپ کی سمجھ دار بہو کی ماں کتنی ناسمجھ بہو تھی۔ اگر آپ جان جائیں تو شاید کبھی یقین ہی نہ کرپائیں۔"

اپنی ساس سے خیال ہی خیال میں مخاطب میں سالوں پیچھے چلی گئی۔



"پھپھو زہرہ آگئیں۔ پھپھو زہرہ آگئیں۔" میں

نور عین



مرہون منت ہے۔ حامد اور نوید کی بیویوں نے تو مجھے بڑا مایوس کیا تھا' لیکن بھلا ہو فاطمہ کے ماں باپ کا' جنھوں نے اپنی بیٹی کی ایسی تربیت کی کہ ہمارا گھر ہی سنور گیا۔"

"کہتے ہیں نا کہ رشتہ کرتے وقت لڑکی کی ماں کو دیکھنا چاہیے۔ فاطمہ کی ماں بھی ضرور اپنے وقت میں ایسی ہی کامیاب اور معاملہ فہم بہو رہی ہوں گی۔"

مسز سکندر نے قیاس آرائی کی۔

کچن سے ملحقہ ڈرائنگ روم میں میری ساس پڑوس میں رہنے والی مسز سکندر اور مسز توصیف سے باتیں کررہی تھیں اور ان کی باتیں بالکل واضح میرے کانوں میں اترتی ہوئی۔ میری سماعتوں میں رس گھول رہی تھیں۔ جلدی جلدی چائے تیار کرکے جب میں ڈرائنگ روم میں پہنچی تو مسز توصیف اور مسز سکندر کی

اونچی آواز میں چلاتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور بازو پر پڑنے والی زوردار جوتی پر میں بازو پکڑے بے اختیار زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"پتا بھی ہے کہ ماں کے سر میں شدید درد ہے' پھر بھی اتنی زور زور سے چیخ رہی ہے۔ کون سی نئی بات ہوئی ہے۔ تمہاری پھپھو تو ہر دوسرے دن ہی آجاتی ہے۔ اس میں اتنا اچھلنے کی کیا ضرورت ہے۔" ماما نے مجھے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر تقریباً "پٹختے ہوئے کہا۔

جوش جذبات میں ان کی بلند آواز صحن میں بیٹھی ان کی ساس اور نندیں بخوبی سن رہی تھیں' حسب عادت وہ یہ اندازہ نہیں کرپائی تھیں۔

"میں ابھی پاپا کو بتا کر آتی ہوں کہ آپ نے مجھے بلاوجہ اتنا مارا ہے۔" ماما کے روکنے کی بھرپور کوشش


عید مبارک

کے باوجود میں بھاگ کر صحن میں پہنچی، جہاں موجود چاروں نفوس کے چہرے غضب ناک ہو رہے تھے۔

"دیکھ لیں بھیا! میں پورے دو مہینے بعد میکے آئی ہوں، پھر بھی بھابھی کو میرا آنا گوارا نہیں۔ کیا شادی کے بعد میرا اس گھر پر کوئی حق نہیں رہا؟" بولتے بولتے پھپھو زہرہ کی آواز بھرا گئی۔

"ارے زہرہ! رو نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس رفیعہ کے سر میں درد ہے، اسی لیے چڑچڑی ہو رہی ہے اور ویسے بھی یہ تمہارے بھائی کا گھر ہے، وہ کون ہوتی ہے تمہیں منع کرنے والی۔" ابو کی شرمندگی غصے میں ڈھلی۔

"یہ دیکھیں پاپا! ماما نے میرے بازو پر جو مارا ہے۔" میں نے اپنی سرخ کلائی ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ جس پر دادی نے مجھے فوراً اپنے ساتھ لپٹایا۔ "ہائے ہائے سارا غصہ میری فاطمہ پر نکال دیا۔ ساری مصیبت تو کام کرنے کی ہے اور کام کرنے سے تو اس کی جان جاتی ہے۔ پورے بیس لوگوں کا کھانا اکیلے بنا لیا کرتی تھی میں اور بہو ملی تو ایسی جو چھ سات لوگوں کو اکٹھا دیکھ لے تو اسے کوئی نہ کوئی بیماری چمٹ جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی ہم کھانا خود ہی پکالیں گے۔" رابعہ پھپھو نے قطعیت سے کہا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرو۔ کھانا میں بازار سے لے آؤں گا۔ تین تکے اور ایک چکن کڑاہی کافی ہوگی نا امی!" ابو نے دادی سے پوچھا۔

"جی اور ہاں ساتھ میں ڈھیر ساری چٹنی بھی لائیے گا۔" رابعہ پھپھو نے چٹخارا لیتے ہوئے دادی کی جگہ جواب دیا۔

"ٹھیک ہے لیتا آؤں گا۔" پاپا نے پانچ سالہ معیز کو گود میں اٹھایا۔

"پھپھو! ریما کو مجھے پکڑا دیں مجھے اس کے ساتھ کھیلنا ہے۔ معیز تو میرے ساتھ لڑتا رہتا ہے۔" میں نے دو سالہ ریما کو پھپھو کی گود سے اتارنے کی کوشش کی۔

"ریما میری بہن ہے تمہاری نہیں۔ امی! آپ ریما کو فاطمہ کو نہیں دیجیے گا۔" معیز زہرہ پھپھو کے سامنے تن کر کھڑا ہوا۔

"بدتمیزی مت کرو معیز!" زہرہ پھپھو نے معیز کو ڈپٹا۔ "اور فاطمہ! تم اپنی امی کے پاس جاؤ۔ ریما کے ساتھ کھیلنے کی کوئی ضرورت نہیں، پھر رفیعہ بھابھی کہیں گی کہ ریما کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے تمہاری پڑھائی کا حرج ہوتا ہے۔" زہرہ پھپھو نے روکھے لہجے میں کہتے ہوئے مجھے پیچھے دھکیلا۔

"ارے زہرہ! ہوش کے ناخن لو۔ فاطمہ کو کیوں ڈانٹ رہی ہو۔ اس کی ماں تو سدا کی ایسی ہے۔ اس کا غصہ اس معصوم پر تو نہ نکالو۔ اپنے بھائی کا ہی خیال کرلو، وہ تم سے کتنا پیار کرتا ہے۔" دادی نے مجھے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا۔

"ارے امی! بس ایسے ہی غصہ آگیا تھا۔ اصل میں والدین کا رویہ ہی بچوں کے ساتھ پیار بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ یقین کریں امی! اگر بھائی اتنے اچھے نہ ہوتے تو اس عورت کے بچوں کو کوئی منہ بھی نہ لگاتا۔"

"جاؤ بیٹا! ریما کے ساتھ کھیلو لیکن اپنا ہوم ورک پورا کرلینا۔" پھپھو نے ریما کو گود سے اتار کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

دادی اور پھپھو اکثر مجھے نادان بچی سمجھتے ہوئے ماما کے بارے میں ساری بھڑاس میرے سامنے ہی نکال دیتی تھیں، لیکن شاید انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ بچے تمام باتیں اسفنج کی طرف جذب کرلیتے ہیں۔

اس دن ماما پھر شام کو ہی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھیں، دوپہر کے کھانے میں وہ اپنی الماری میں موجود بسکٹوں سے پیٹ بھر چکی تھیں۔ پھپھو کو روکھا سا سلام کرکے وہ کچن میں آئیں تو میں برتن دھونے کی کوشش میں اپنے کپڑے بھگو چکی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو فاطمہ؟" ماما نے میری کمر پہ زور سے دھموکا جڑا۔

"ماما! مجھے برتن دھونے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ

برتن دھلواؤں۔" کمر میں اٹھنے والی ٹیسوں کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے ماما کی خوشامد کی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ پہلے ہی اتنا کام بکھرا ہوا ہے اور تم مزید بڑھا رہی ہو۔ جاؤ جا کر رابعہ پھپھو سے پڑھو اور اس سے کہنا کہ تمہیں کپڑے بھی بدلوا دے۔"

ماما نے میرے ہاتھ دھلوا کر مجھے اسٹول سے نیچے اُتارا۔

"بس کھانا اور سونا ہی آتا ہے ان ماں بیٹیوں کو۔ پتا نہیں کب ان مصیبتوں سے جان چھوٹے گی۔ کام کر کر کے مر جاؤ۔ اس گھر میں بہو کے نصیب میں تو کوئی سکھ ہی نہیں۔" برتن دھوتے ہوئے ماما کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں۔

"تم ابھی تک یہیں ہو اور کتنا تنگ کرو گی تم مجھے؟" ماما نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے دروازے میں کھڑے دیکھ کر سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"ماما! وہ پاپا نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں کہ ہاٹ پاٹ میں نان اور تکے رکھے ہیں اور فریج میں چٹنی بھی ہے' آپ کھا لیجئے گا۔" میں نے جلدی سے بات پوری کی۔

"ہونہہ اتنا ہی خیال ہوتا میرا تو مجھے اس جنجال میں نہ پھنساتے تمہارے پاپا۔ کتنی لاڈلی تھی میں۔ اپنے گھر میں کبھی ہل کر پانی بھی نہیں پیا تھا اور یہاں.... یہاں پر تو کام کر کر کے میری ہڈیاں تک گھس گئی ہیں' مجھے نہیں کھانا نان تکہ' کہہ دینا اپنے باپ سے۔" وہ تنک کر بولیں۔

"ایک تو میرے سر میں سارا دن درد رہا' میرا حال تک نہیں پوچھا اور اب یہ فضول کی ناراضی.... اب پتا نہیں کتنے دن بات نہیں کریں گے۔ نہیں کرتے تو نہ کریں مجھے بھی کوئی پروا نہیں۔ تم جاؤ جا کر دادی سے پوچھ کر آؤ کہ شام کو کھانے میں کیا بنانا ہے۔" ماما نے سنک کا نل بند کر کے اپنے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھے۔

"پتا نہیں ماما سارا کام بول بول کر کیوں کرتی ہیں' اب اتنا زیادہ کام بھی نہیں ہوتا۔ رابعہ پھپھو صفائی کرتی ہیں۔ سبزی دادی بنا دیتی ہیں' پھر بھی ماما ہر وقت ناراض ہی رہتی ہیں۔ میں تو بڑی ہو کر انعم کی ماما کی طرح گھر کا سارا کام کیا کروں گی۔ وہ کتنا ہنس ہنس کر گھر کا سارا کام کرتی ہیں۔"

میں دل ہی دل میں پڑوس میں رہنے والی **حفصہ** آنٹی کو سراہتے ہوئے دادی کے کمرے کی طرف بڑھی۔



"دادی سے کہنا' میرے سر میں درد ہے۔ آج کھانا باہر سے منگوالیں۔" ماما نے میرے بولنے سے پہلے ہی مجھے پیغام تھما کر آنکھیں موندلیں۔

پانچ سال کا طویل عرصہ بھی ماما کے رویے کو بدل نہیں پایا تھا۔

البتہ گزرتے ہوئے وقت نے مجھے خاصا سمجھ دار بنا دیا تھا۔ دادی کے سامنے ہمیشہ خاموش رہنے والی ماما اب خاموش نہیں رہتی تھیں۔ شاید بچوں کے بڑھتے قد ان کے قدم مضبوط کر گئے تھے اور دادی میں پہلے جیسی توانائی نہیں تھی۔

آج پھپھو زہرہ کو رابعہ پھپھو کے رشتے کے سلسلے میں کچھ مہمانوں کو لے کر آنا تھا۔ پاپا نے کل شام ہی ماما کو بتا دیا تھا اور آج' ماما حسب معمول سر درد میں مبتلا بستر سنبھالے ہوئے تھیں۔

"تمہاری ماں کی وجہ سے میں نے ہمیشہ ہی شرمندگی جھیلی ہے۔ کام کرنے سے تو وہ شروع سے ہی جان چھڑاتی ہے پھر چاہے اس مقابلے کے لیے اسے مرنے کا ڈراما کیوں نہ کرنا پڑے۔" غصے سے پاپا کے ماتھے کی رگ پھول رہی تھی۔

"پاپا! آپ اپنا موڈ خراب نہ کریں۔ کون سا پہلی مرتبہ ہو رہا ہے۔ فی الحال آپ غصہ ایک سائیڈ پر رکھیں اور کولڈ ڈرنکس لے آئیں۔

باقی کیا کرنا ہے پھپھو اور دادی سے پوچھ کر ہم بنا لیں گے۔ آپ پریشان مت ہوں۔"

میری بات سن کر پاپا نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور

چلے گئے۔

پھر میں نے ارم نے اور رابعہ پھپھو نے مل کر چاٹ اور کسٹرڈ بنایا۔ رول اور پیسٹریز پاپا سے منگوالیں۔ دادی کے منع کرنے کے باوجود میں نے ماما کا ٹی سیٹ نکال لیا تھا۔

کیوٹ سی رابعہ پھپھو ان کو بہت پسند آئی تھیں۔

ٹی سیٹ میں نے شام کو ہی دھو کر ٹیبل پر رکھ دیا تھا تاکہ خشک ہونے پر اسے دوبارہ پیک کر سکوں۔

میں کچن میں برتن دھونے میں مصروف تھی جب کچھ ٹوٹنے کی زوردار آواز نے مجھے دہلا دیا۔

میں دوڑتے ہوئے کچن سے باہر آئی تو ماما کے ہاتھ میں چینک دیکھ کر حیران رہ گئی جسے انہوں نے بے دردی سے زمین پر دے مارا تھا۔ دادی، رابعہ پھپھو اور پاپا بھی دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر آئے۔

ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی ماما کو دیکھ کر سب سارا معاملہ سمجھ گئے تھے۔

"کس سے پوچھ کر میرے جہیز کی چیزیں نکالی گئی ہیں؟ میری چیزیں اور مجھ سے پوچھنا گوارہ بھی نہیں کیا۔"

ماما باقاعدہ دھاڑ رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا۔" دادی کی میری طرف اٹھنے والی بے بس نظریں کچھ جتاتی ہوئی سی تھیں۔

اب اس معاملے کو مجھے خود ہی ہینڈل کرنا تھا۔

"کیا ہو گیا ماما! یہ ٹی سیٹ اور بیڈ شیٹ میں نے نکالی تھی۔ دادی تو منع کر رہی تھیں۔ ایسی چیزیں مہمانوں کی تواضع کے لیے ہی تو ہوتی ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

میں نے جھک کر ٹوٹی ہوئی چینک اٹھائی۔

چٹاخ۔ میرے گال پر ماما کے تھپڑ نے پانچ لال نشان چھوڑ دیے۔

"آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر میری کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔" اپنی شہادت کی انگلی اٹھا کر مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف مڑیں۔

پاپا فوراً" ان کے پیچھے گئے۔ اور میں ماما اور پاپا کے کمرے سے ملحقہ اپنے اور ارم کے مشترکہ کمرے میں سر تک چادر اوڑھے آنسو بہاتے ان کے جھگڑے کی آوازیں سن رہی تھی۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی فاطمہ پر ہاتھ اٹھانے کی۔ اپنی دو کوڑی کی چیزوں کی وجہ سے تم نے میری معصوم بچی کو تھپڑ مار دیا۔" پاپا غصے سے بولے۔

"لیکن خیر اس میں تمہارا بھی کیا قصور، رشتوں کو نبھانا تو تمہیں کبھی آیا ہی نہیں۔ ایسا تماشا لگاتے ہوئے تمہیں اپنی اور میری عزت کا کوئی خیال ہی نہیں آیا تب ہی تو اتنی معتبر ہو تم اس گھر میں۔" پاپا کا لہجہ گہرا طنز لیے ہوئے تھا۔

"میں آپ کی عزت کا خیال کیوں کروں ہآپ کے گھر سے مجھے کبھی عزت ملی ہے کیا؟ کام کر کر کے ہڈیاں تک گھس گئیں۔ میرا سارا زیور آپ نے زہرہ کی شادی میں بیچ دیا ابھی تک آپ کی ماں بہنوں کو برداشت کر رہی ہوں مگر قدر، ستائش، عزت نام کی بھی نہیں ملی۔"

"میں بہت خوش ہوتا اگر تم واقعی ان خوبیوں کی حامل ہوتیں۔ میری ماں بہنیں تو کب کی بے اماں ہو چکی ہوتیں۔ اگر میں زبردستی ان کو اپنے ساتھ نہ رکھتا۔ تم نے تو شادی کے دوسرے مہینے ہی اپنی بہن کے کہنے پر علیحدہ گھر کا مطالبہ کر دیا تھا یہ سوچے بغیر کہ میں اپنی بیوہ ماں اور دو کمسن بہنوں کا واحد سہارا ہوں۔ اور کام کی تو تم نے خوب کہی۔ زہرہ کی شادی کے بعد رابعہ کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کس طرح تمہارے ساتھ گھر کا کام کرواتے رہے ہیں۔ میں اس بات سے انجان نہیں۔ کچن کا تھوڑا بہت کام جو تم مارے باندھے کرتی رہی ہو، وہ کب کا رابعہ سنبھال چکی ہے۔ میرے رشتہ داروں کے آنے پر ہمیشہ تمہاری طبیعت خراب رہی اور...

رہی بات زیور کی تو زہرہ کی شادی کے وقت قرض نہ ملنے پر تم سے اگر زیور لیا تھا تو تم نے بھی یہ مکان زبردستی اپنے نام کروا لیا تھا۔

دعائیں دو اپنے بچوں کو جن کی وجہ سے میں تمہیں

برداشت کر رہا ہوں۔ ورنہ تمہیں کب کا اپنی زندگی سے نکال چکا ہوتا۔" پاپا کا برفیلا لہجہ ماما کو آگ لگا گیا۔

"میرے نصیب ہی خراب تھے جو میری شادی آپ جیسے بے رحم اور سنگدل انسان سے ہوئی۔ میری بہن کو دیکھیں کیسے اتنے بڑے محل میں عیش کر رہی ہے' نہ ساس نندوں کا بکھیڑا نہ روپے پیسے کی تنگی۔"

"ناشکری عورت ہو تم..... تم جیسی عورتیں ہی جہنم میں جائیں گی۔ جس بہن کے نصیب کے قصیدے پڑھ رہی ہو نا۔ اس کی زندگی کی اذیتیں بھول گئی ہو۔ جوا' شراب' عیاشی کا ایسا کون سا مظاہرہ ہے جو تمہارے بہنوئی نے نہیں کیا۔ حرام کے دو پیسے تمہاری بہن کے ہاتھ پر رکھ کر دوبارہ پلٹ کر نہیں دیکھتا اور تم اپنی بہن کا موازنہ اپنے ساتھ کر رہی ہو۔ اپنے آپ کو بدنصیب کہتی ہو' تف ہے تم پر۔"

"کوئی غرض نہیں مجھے آپ کی ان تمام خوبیوں سے۔ کاش آپ میں ان ساری خوبیوں کے بجائے صرف ایک خوبی ہوتی کہ آپ ایک اچھے شوہر ہوتے۔"

ماما کا جواب سن کر مجھے بے اختیار ہی جھرجھری آ گئی۔

"کچھ نہیں ہو سکتا تمہارا بدنصیب اور نامراد تو میں رہا جسے تم جیسی عورت کا ساتھ ملا۔ میری زندگی خراب کرنے کی قصوروار صرف اور صرف تم ہو۔" پاپا کا افسردہ اور بے بس سا انداز میرے ذہن کے پردے پر چپک گیا۔

"پاپا مجھے نفسیات پڑھنی ہے۔" میٹرک میں سائنس کے ساتھ اے گریڈ لینے کے باوجود میں نے نفسیات پڑھنے کو ترجیح دی تھی' تاکہ میں انسان کے جذبات و احساسات کو اچھی طرح سمجھ پاؤں۔

مجھے ان محرکات کا پتا چلانا تھا۔ وہ قصور ڈھونڈنے تھے' جنہوں نے ماما کو پاپا کی نظروں میں گرا دیا تھا اور چار سال کی انتھک محنت کے بعد مجھے وہ سارے قصور مل گئے تھے۔ جنہیں میں نے بڑی احتیاط سے اپنی ڈائری کے حوالے کیا تھا۔

ماما کا پہلا قصور خود ساختہ خود ترسی تھا۔ ایک بائیس سالہ لڑکی پانچ چھ لوگوں پر مشتمل گھر بڑی آسانی سے سنبھال سکتی ہے' لیکن ماما یہ کام ایک بوجھ سمجھ کر کیا کرتی تھیں' اور اس پر نا سمجھی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی ناگواری کو اپنے سسرال والوں سے چھپا بھی نہیں پاتی تھیں اور اس پر مستزاد کہ وہ سسرال والوں سے سراہنے کی امید رکھتی تھیں۔ دوسری صورت میں سسرال والوں سے ان کی ناراضی بڑھ جاتی تھی۔

ماما کا دوسرا قصور اپنے حالات کے مطابق نہیں بلکہ دوسروں کے مشوروں پر زندگی گزارنا تھا۔ پاپا کی مجبوری جاننے کے باوجود وہ ہمیشہ میرے ننھیال والوں خاص طور پر خالہ کے کہنے پر انہیں دادی اور پھپھو سے الگ ہونے پر مجبور کرتے ہوئے یہ بھول بیٹھیں کہ وہ پاپا کی نظروں میں اپنی عزت گرا رہی ہیں' مگر شکر الحمد اللہ میرے پاپا ناخلف نہیں تھے۔

ناشکری ماما کا تیسرا قصور تھا۔ میرے بے تحاشا ہینڈسم پاپا جو میرے بڑے بھائی ہی لگتے ہیں' سگریٹ پان کے علاوہ ہر قسم کی علت سے دور وہ ایک مکمل انسان تھے' لیکن ماما نے ان کی ان خوبیوں کو کبھی درخور اعتنا نہیں جانا۔

ماما کے سارے حقوق پورے کرنے میں انہوں نے بلاشبہ کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ خاندان کے ہر فنکشن پر ماما کی سج دھج خاندان کی ساری خواتین سے زیادہ ہوتی تھی۔

ہم تینوں بہن بھائی دادی کی گود میں پروان چڑھے۔ ہمیں پڑھانے کی تمام تر ذمہ داری رابعہ پھپھو نے اٹھا رکھی تھی اور ہم تینوں اپنے ان تمام کزنز سے بہتر گریڈز لاتے تھے جو مہنگے مہنگے اکیڈمی ٹیوشن میں پڑھ رہے تھے۔ لیکن سسرال والوں کی بدولت ملنے والی سہولتیں میری ماما کو کبھی نظر ہی نہیں آئی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا قصور سسرال اور میکے کا موازنہ کرنا اور پھر میکے والوں کو سسرال پر فوقیت دینا بھی تھا۔

یہ جانے بغیر کہ ان کا یہ طرز عمل انہیں سسرال

سے دور کر رہا ہے۔

بلاشبہ یہ میری دادی کا بہت بڑا وصف تھا کہ ماما کی ان ساری کارگزاریوں کی داستان نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ہاں لیکن وہ اپنے رویئے کو تلخ ہونے سے بچا نہیں پائی تھیں۔

اتنے ڈھیر سارے قصور جب ایک بہو کے حصے میں آجائیں تو وہ بے گناہ تو نہیں رہتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دادی اور پھپھوؤں نے بھی ان سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن ایک شادی شدہ لڑکی کو اس بات کا ادراک ہونا ضروری ہے کہ اسے سسرال میں اپنی جگہ خود ہی بنانی ہوگی۔

ان ساری باتوں کو جاننے کے بعد ایک بات تو میں نے سوچ لی تھی بلکہ گرہ میں باندھ لی تھی کہ کم از کم میں اپنی ماما کی غلطیوں کو نہیں دہراؤں گی۔ مجھے ایک کامیاب، سمجھ دار اور ہر دلعزیز بہو بننا ہے ایسی بہو جس کے سسرال والے اس پر ناز کریں۔ اور ایسا میں نے تب سوچا، جب دادی کے کہنے پر زہرہ پھپھو نے معیز کے لیے مجھے میری ماما کی بیٹی ہونے پر مسترد کیا۔



ان چار سالوں میں وقت نے بہت تیزی سے آگے کا سفر طے کیا تھا۔ رابعہ پھپھو کی شادی ہو چکی تھی۔ دادی نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ اب ان کا زیادہ تر وقت یاد الٰہی میں گزرتا تھا۔

اور ماما کو وہ سب کچھ حاصل ہو گیا تھا جس کی وہ تمنا کر رہی تھیں۔ اب اس گھر میں وہ بلا شرکت غیرے مالک تھیں بظاہر پاپا ان کی ہر بات مانتے تھے۔ لیکن پاپا کے دل میں اپنی عزت وہ اپنی نادانیوں کے باعث کھو چکی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو کبھی فرصت سے باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔

سادہ سی پُرخلوص محبت کرنے والی زہرہ پھپھو کی اس بات پر میں بہت ہرٹ ہوئی تھی اور ان سے دل ہی دل میں ناراض بھی تھی۔

لیکن بعد میں میں نے تسلیم کیا کہ ایک ماں کے طور پر وہ حق بجانب تھیں۔ یقیناً" میں بھی اپنی بھابھی اپنی ماں جیسی نہیں چاہوں گی اور ویسے بھی معیز بھائی مجھے بھائی کے طور پر ہی اچھے لگتے تھے۔

بی اے کے فوراً" بعد پاپا نے میری شادی اپنے ایک کولیگ کے بیٹے سے طے کردی۔

عدنان کا نمبر بہن بھائیوں میں تیسرا تھا۔ ان کے دونوں بڑے بھائی الگ الگ پورشنز میں رہتے تھے۔ جبکہ عدنان اپنے ماں باپ اور دو غیر شادی شدہ بہنوں کے ساتھ گھر کے سامنے والے حصے میں مقیم تھے۔

ان کے گھر میں بہت سی سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ گھر بھی پرانے طرز کا تھا۔

ہاں عدنان کی جاب بہت اچھی تھی اور ترقی کے چانسز بھی تھے۔

ماما فقط یہ سوچ کر راضی ہوئی تھیں کہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح عدنان بھی جلد ہی گھر والوں سے الگ ہو جائیں گے۔

اس ایک بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے پاپا کو اپنی رضامندی دے دی۔ رہی بات میری تو مجھے لگتا تھا کہ مجھے اس سے بہتر رشتہ مل سکتا ہے۔



جن دنوں لڑکیاں اپنے حسن کو بڑھانے اور وزن کم کرنے کے جتن کرتی ہیں۔ ان دنوں میری فکر اور تیاریاں مختلف تھیں۔ میں گھر کا سارا کام اکیلے کرنے کی کوشش کرتی تھی تاکہ کام کرنے کی عادت ہو سکے۔

زیادہ کام کرنے سے میری کمر میں اکثر درد ہو جاتا تھا۔ سو میں نے اپنی ڈائٹ کا بھرپور خیال رکھا۔ کچھ وٹامنز اور فوڈ سپلیمنٹ بھی لے لیا کرتی تھی۔

میری شادی سے دو ہفتے پہلے دادی اور ماما کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ سارا سارا دن میرے جہیز کی پیکنگ کرتے ہوئے وہ دونوں روتی آبدیدہ رہتی تھیں شاید دونوں کا درد مشترک ہو گیا تھا۔

شادی سے ڈیڑھ ہفتہ قبل میرا یہ خیال کہ ماما بدل

گئی ہیں خیال خام ہی ثابت ہوا۔

میری شادی بقر عید کے دس دن بعد طے پائی تھی۔ گھر میں میرے ننھیال اور ددھیال والے ڈھیروں لوگ جمع تھے۔ پاپا قربانی کے لیے خاصا موٹا تازہ بکرا لائے تھے۔

عید کے دن جب قربانی کا وقت آیا تو دادی نے پاپا سے فرمائش کی کہ اس دفعہ قربانی دادی کے نام کی کی جائے۔ پاپا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ فوراً" مان گئے۔

"نہیں یہ قربانی میرے نام کی ہو گی۔" ماما نے سارے لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے پاپا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"ایک بکرے کی قربانی ایک گھر کی طرف سے کافی ہوتی ہے، ہم سب ایک گھر کے افراد ہیں' ہمارا کھانا پینا ساتھ ہے یہ قربانی ہم سب کی طرف سے ہے اگر اماں کی خوشی کے لیے یہ کہہ دیا جائے کہ تو کیا فرق پڑتا ہے۔" پاپا نے نرمی سے سمجھایا لیکن امی اپنی ضد پر اڑی رہیں۔ دادی آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئیں۔

میں ماما کی نادانی پر افسوس کرتے دادی کے کمرے میں پہنچی۔ دادی کا جھریوں بھرا چہرا آنسوؤں سے تر تھا ان کا کمزور وجود لرز رہا تھا گھر کی بزرگ خاتون کی پورے خاندان کے سامنے بے عزتی ہوئی تھی۔ دادی کا یوں بے بس ہونا مجھے رلا گیا۔

"دادی پلیز ماما کو معاف کر دیں آج عید کا دن ہے ان کے لیے دعا کریں کہ اللہ انہیں ہدایت دے' آپ پریشان نہ ہوں۔ پاپا کبھی آپ کی بے عزتی نہیں ہونے دیں گے۔"

زہرہ پھپھو نے دادی کو بازوؤں کے گھیرے میں لیا۔ رابعہ پھپھو بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہم تینوں کے ساتھ لپٹ گئیں۔

شام کو پاپا پہلے والے بکرے کی طرح ایک اور بکرا لیے گھر میں داخل ہوئے۔ اسے باندھ کر وہ پہلے والے بکرے کو لے کر دادی کے پاس آئے۔

"اس بکرے کی قربانی آپ ہی کے نام سے ہو گی۔ مجھے اپنی ماں کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔" پاپا نے دادی کے ہاتھ عقیدت سے چومتے ہوئے۔

اور پھر عید کے دوسرے دن ہمارے گھر دو قربانیاں ہوئیں۔ ایک دادی کے نام کی اور ایک ماما کے نام کی۔ لیکن ماما اپنی ضد پوری ہونے کے باوجود کمرے سے باہر نہیں آئیں۔

"بیٹا! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ اپنے شوہر کو جلد سے جلد اپنی مٹھی میں لے کر الگ ہو جانا' ورنہ ساری زندگی اس سسرال نام کے جہنم میں جلتی رہو گی۔ اور ہاں! ساس نندوں کی زیادہ خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں بس اپنے کام سے کام رکھنا۔"

شادی سے ایک روز پہلے مجھے شادی شدہ زندگی گزارنے کے اصول سمجھاتی میری ماما یہ نہیں جانتی تھیں کہ میرا دل ان کی اس بات سے تاسف سے بھر گیا تھا۔



شادی کے تیسرے دن جب میں چائے کی ٹرے اٹھائے لاؤنج میں پہنچی تو میری نندیں جیٹھ جیٹھانیاں ساس سسر سب وہیں پر موجود تھے۔

"ابی چائے۔" اپنے سسر کو چائے پیش کرنے کے بعد میں ٹرے لیے اپنی ساس کے پاس آئی۔ عدنان کی دیکھا دیکھی میں نے اپنی ساس کو امی اور سسر کو ابو کہنا شروع کر دیا تھا۔ چائے پیش کرتے ہوئے میرے لب مسکرا رہے تھے۔

"بڑی خود سر ہو' خود ہی چائے بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ مجھ سے پوچھ تو لیتیں۔ ہمارے ہاں سب سے پہلے کھیر پکوائی کی رسم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی گھر کی بہو کسی اور کام میں ہاتھ ڈالتی ہے۔ مگر آج کل کی لڑکیاں بڑوں سے مشورہ لینا تو گناہ سمجھتی ہیں۔ اس گھر میں میرا حکم چلتا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔ مجھ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کرنا اور ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ عدنان میرا

بہت فرماں بردار بیٹا ہے۔ تمہارے کہنے میں نہیں آئے گا بے شک شکایت لگا کر دیکھ لینا۔" میری ساس نے نخوت سے کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا۔

"اف!" درد کی ایک تیز لہر نے میرے پورے جسم کا ایک چکر مکمل کیا۔ اتنی تذلیل پر چائے کی ٹرے میرے ہاتھ میں لرز کر رہ گئی۔

امی کی بات نظر انداز کر کے میں نے بڑی مشکل سے وہاں موجود تمام لوگوں تک چائے کے کپ پہنچائے۔

اپنی جیٹھانیوں کی تمسخر بھری ہنسی مجھے زہر میں بجھے بھالوں کی طرح چبھتی رہی۔



"فاطمہ بیٹی! کیا کر رہی ہو۔" میں عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔ اپنے سارے آنسو نماز پڑھنے کے دوران میں بہا چکی تھی۔ جب میرے سسر کمرے میں داخل ہوئے تو میں جائے نماز لپیٹ رہی تھی۔

"بیٹا! رو رہی تھیں کیا؟ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔" میری سوجی ہوئی آنکھوں اور گلابی چہرے نے شاید انہیں سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

"نہ میرا بچہ! رونا نہیں۔ اس گھر میں تم اکیلی نہیں ہو۔ تمہارا باپ تمہارے ساتھ ہے۔ تم مجھے ہما اور حنا کی طرح ہی عزیز ہو۔ رہی بات تمہاری ساس کی تو بیٹا! دل کی بری نہیں بس زندگی کے تلخ تجربات نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔" وہ میرے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔

"یہ گھر دیکھ رہی ہو؟ اپنی ریٹائرمنٹ پر میں نے پندرہ مرلے کا پلاٹ لے کر یہ چار کمرے بنوائے تھے۔ بچوں کو پڑھاتے لکھاتے اور پھر ان کی شادیاں کرتے گھر کی مرمت اور اس کی تعمیر بچوں کی کامیابی پر ٹالتے رہے کہ بچے کامیاب ہوں گے تو سب کچھ بہتر ہو جائے گا اور جب نوید اور حامد اس قابل ہوئے تو انہوں نے گھر کے پچھلے حصے میں اپنے اپنے پورشنز بنائے اور ہمیں اپنی زندگی سے نکال دیا۔

یہ تو اللہ کا خاص کرم ہے کہ عدنان کی تنخواہ اتنی اچھی ہے اور کچھ میری پنشن ملا کر گھر کا خرچ احسن طریقے سے چل رہا ہے ورنہ تو ہم جیتے جی مر جاتے۔

سچ تو یہ ہے بہو! کہ ہم عدنان کی شادی کرنا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔ کم از کم جب تک حنا اور ہما کی شادیاں نہ ہو جاتیں۔ دونوں کی پڑھائی اور تمہاری ساس کے جوڑوں کے درد کی وجہ سے اس گھر کا نظام مفلوج ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً" عدنان کی شادی کرنی پڑی لیکن تمہاری ساس اور نندیں خوفزدہ ہیں بیٹا! اس وقت سے جب ان کا یہ بیٹا، یہ بھائی بھی انہیں چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسا لے گا اور یہی خوف تمہارے اور ان کے درمیان ان دیکھی دیوار ہے۔ تمہیں اپنے صبر برداشت اور مستقل مزاجی سے اس دیوار کو گرانا ہے۔ ان کے خوف کو دور کرنا ہے۔ ایک بار یہ دیوار گر جائے پھر دیکھنا تمہاری زندگی کیسے روشنی سے بھر جائے گی۔

اور مجھے یقین ہے تم ایسا کر لو گی۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔" میرا سر تھپتھپاتے ہوئے میرے مہربان سسر مجھے بالکل بابا کی طرح ہی لگے جو مجھے ہمیشہ سیدھا راستہ دکھاتے آئے تھے۔

"جی ابو! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میری کپکپاتی آواز میں ارادے کی مضبوطی واضح تھی۔



"امی! وہ رابعہ پھپھو نے مجھے اور عدنان کو کھانے پر بلایا ہے آپ سے اجازت لینی تھی۔" جواباً" مطالعہ کرتے ہوئے میری ساس نے مجھے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے گھور کر دیکھا۔

"ٹھیک ہے چلی جانا لیکن جانے سے پہلے برتن دھو کر بریانی بنا لینا۔ ساتھ میں سلاد اور چٹنی بھی۔ حنا اور ہما کے پیپرز ہونے والے ہیں۔ انہیں تنگ نہ کرنا۔" حکم جاری کر کے وہ دوبارہ مطالعہ میں گم ہو گئیں اور میں چپ چاپ کچن میں چلی آئی۔

ان کی ایسی باتوں کو نظر انداز کرنا اور ہر بات میں

مثبت پہلو تلاش کرنا میں نے سیکھ لیا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا" پر یقین کامل رکھتے ہوئے میں مسلسل سسرال میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ہما حنا اور امی کا سرد رویہ عدنان کی موجودگی میں سرد نہیں ہوتا تھا۔

بریانی کو دم لگا کر میں برتن دھو رہی تھی جب ہما نے کچن میں آکر کباب تلنے کا آرڈر دیا۔ برتن چھوڑ کر میں نے فریزر سے کباب نکال کر باہر رکھے۔ اسی وقت عدنان اچانک کچن میں آدھمکے۔

"ارے تم ابھی تک کچن میں ہی ہو' تیار نہیں ہونا کیا؟" عدنان فکر مند ہوئے۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے۔

"بس یہ برتن دھولوں پھر کباب فرائی کر کے ابھی تیار ہوتی ہوں۔"

"دیکھو ذرا کیا حلیہ بنا لیا ہے۔ ماسی لگ رہی ہو۔ ہما! تم ہی تھوڑی ہیلپ کروا دو' ورنہ تو ہم ڈنر کے بجائے ناشتے پر ہی پہنچیں گے۔" عدنان کے عام سے لہجے پر بھی ہما کا رنگ زرد پڑا۔

"جی بھائی! کام ہی کروا رہی تھی۔" ہما کی میری جانب اٹھنے والی نظریں التجائیہ تھیں۔

"آپ جائیں بھابھی! تیار ہو جائیں باقی کام میں خود ہی کرلوں گی۔" ہما نے اپنائیت سے کہا۔ اس کا بدلا ہوا انداز مجھے سرتاپا سرشار کر گیا۔

"نہیں ہما! میں کرلوں گی۔ آٹھ بجے جانا ہے۔ ابھی تو ساڑھے چھ ہی ہوئے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں کام مکمل ہو جائے گا۔ تم جا کر اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرو۔" اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے میں نے کھنکتے لہجے میں کہا۔

☆ ☆ ☆

"ارے فاطمہ تم... آؤ بیٹھو۔" عفت بھابھی نے صوفے پر سے بچوں کی کتابیں اٹھاتے ہوئے میرے لیے جگہ بنائی۔

ان کا کمرا بہت گندہ ہو رہا تھا۔ میرے جیسی نفاست پسند لڑکی پر عفت بھابھی کا پہلا تاثر ہی بہت غلط پڑا تھا۔

"ہاں بھئی! کیسی گزر بسر ہو رہی ہے۔ سچ اس دن امی جان نے سب کے سامنے تمہاری اتنی انسلٹ کی' مجھے بہت برا لگا۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ ان کے ساتھ گزارا کرنا بہت مشکل ہے اور وہ ہما اور حنا بہت ہی چغل خور اور کام چور لڑکیاں ہیں۔" عفت بھابھی کی زبان نے زہر اگلا۔

"نہیں بھابھی! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ دونوں تو بہت ہی پیاری بچیاں ہیں۔ میرے ساتھ کافی ہیلپ کرواتی ہیں اور رہی بات امی کی تو بڑوں کی ڈانٹ کا میں برا نہیں مانتی۔ ویسے میرے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا ہے۔ سب ہی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے اپنے سسرال والوں کی حمایت لی۔

"اچھا۔" ان کا اچھا کافی طنز لیے ہوئے تھا۔ "ابھی نئی نئی ہو۔ کچھ دنوں میں وقت خود ہی سب کچھ سمجھا دے گا۔ اچھا یہ بتاؤ! پرسوں پہلی تاریخ ہے۔ کیا ارادہ ہے؟" بھابھی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"کیا مطلب۔" میں حیرت زدہ تھی کہ پہلی تاریخ کو کیا خاص بات ہے۔

"ارے بھئی تمہارے شوہر نامدار کو اس دن تنخواہ ملنی ہے۔"

"تو۔" میں ابھی تک حیرت زدہ تھی۔

"تو یہ کہ ابھی سے اپنا خرچ بند ھوالو۔ ورنہ تمہارے حصے کے پیسے بھی گھر میں ہی کھپ جائیں گے۔ میرے میاں کی تنخواہ پچیس ہزار تھی تو میں نے دس ہزار خرچ بندھوایا تھا۔ تمہارے میاں کی پینتیس ہزار ہے۔ آگے تم خود سمجھ دار ہو۔"

"دس ہزار؟ لیکن دس ہزار کا آپ کیا کرتی تھیں؟"

"ارے بھئی کپڑے جوتے مہینے کے اخراجات ان ہی کے لیے تو خرچ بندھوایا جاتا ہے۔ آخر بیوی کا نان

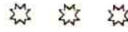
نفقہ شوہر کی ذمہ داری ہوتا ہے۔"
"لیکن بھابھی دس ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔"
"بس کرو فاطمہ! مہنگائی دیکھو ذرا۔ میں کون سا سارا خرچ کر دیتی تھی۔ بچت کرتی رہی۔ جب ہی تو الگ ہونے میں کامیاب ہو سکی۔ جب ان کے سامنے الگ پورشن بنوانے کے لیے نوٹ رکھے تو.... آج تک زیر دام ہیں میری اس عقل مندی کی وجہ سے۔
تم بھی یہی حربہ اپناؤ ورنہ یہ لوگ تمہاری جان کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" عفت بھابھی مجھ سے گہری اپنائیت جتانے کے چکر میں اپنی کینچلی اتار چکی تھیں۔
"اچھا بھابھی! میں چلتی ہوں۔ عدنان آنے والے ہوں گے۔ مجھے چائے بنانی ہے۔" اپنی ناگواری کو چھپائے میں بمشکل وہاں سے واپس آ رہی تھی کہ لاؤنج سے آنے والی آوازوں نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔
"امی! بھابھی ویسی نہیں ہیں جیسی ہم سمجھتے ہیں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ دیکھیں نا! کل ہمارے کام نہ کرنے کی بھنک عدنان بھائی کے کان میں پڑنے ہی نہیں دی۔" ہما میری تعریف میں رطب للسان تھی۔ میرے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔
"اچھی نہیں ہے گھنی میسنی ہے۔ یہ تو میں نے قابو کیا ہوا ہے۔ ورنہ کب کی رسی تڑوا کر میاں سمیت بھاگ چکی ہوتی۔" میری ساس کے الفاظ نے جیسے دن کی سفید روشنی پر رات کی کالی سیاہی مل دی۔
"ہاں ہما! امی نے ہی قابو کیا ہے' ورنہ بھابھیاں کبھی اچھی ہو سکتی ہیں کیا؟ اتنی تعریفیں کر رہی ہو ان کی' دیکھنا ذرا بھائی کی تنخواہ پر کیسے اپنا حق جمائیں گی' ہمیں ماہانہ اخراجات کے لیے بھائی جو دو دو ہزار روپیہ دیتے ہیں' بھابھی کی وجہ سے ہمیں ان سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"
"اس معاملے میں تو تم لوگوں کو کمپرومائز کرنا ہی پڑے گا۔ بہو جتنے پیسے مانگے گی۔ ہم اسے اتنے ہی دیں گے' ورنہ اسی بات کو بنیاد بنا کر وہ عدنان کو ہم سے الگ بھی کر سکتی ہے۔ اس لیے اگر تم دونوں کو پانچ پانچ سو میں بھی گزارا کرنا پڑے تو شکایت نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو پوری کے چکر میں آدھی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔"
"ہاں پھر پڑھنا ان کے قصیدے۔" حنا کا لہجہ طنزیہ تھا۔ جواباً" ہما کی خاموشی سے میں سلگ اٹھی تھی۔ خاموشی سے کچن کے راستے اپنے کمرے میں آ کر میں اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رکھ پائی تھی۔



"یہ لیں امی! تنخواہ۔" ہم سب لاؤنج میں چائے پی رہے تھے' جب عدنان نے سفید لفافہ امی کی طرف بڑھایا۔
"یہ لو بہو! اب اس پر تمہارا حق ہے۔" امی نے عدنان کے ہاتھ سے لفافہ لے کر میری طرف بڑھایا۔
"ارے نہیں امی! مجھے بھلا گھر چلانا کہاں آتا ہے۔ یہ آپ کا کام ہے آپ ہی کر سکتی ہیں۔" میں نے رسانیت سے کہا۔
"اچھا تو پھر اپنی ضروریات کے لیے کچھ رقم لے لو۔ اس تنخواہ کے علاوہ میری انکم کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔" عدنان نے مسکراتے ہوئے مجھے آگاہ کیا۔
"ہاں بہو! بتا دو تمہیں کتنے روپے چاہئیں اپنے ماہانہ اخراجات کے لیے۔"
"عفت بھابھی تو دس ہزار لیتی تھیں۔ آپ پندرہ تو لیں گی۔" ہما نے شاید مجھے پندرہ ہزار کی حد میں رکھنے کے لیے عفت بھابھی کی مثال دی۔
"کیوں بھئی! میں تمہیں ایک کے بجائے پانچ چھ نظر آتی ہوں۔ جو اتنے پیسے لوں گی۔ میرے پاس تو ابھی بری اور جہیز کا بھی ڈھیروں سامان موجود ہے' بس امی! جتنے پیسے آپ ہما اور حنا کو دیتی ہیں' اتنے ہی مجھے بھی دے دیں۔" میری بات سن کر وہ سب دنگ رہ گئے تھے۔
"لیکن بھابھی! ہمیں تو دو دو ہزار روپے ملتے ہیں۔ آپ اتنے پیسوں میں گزارا کیسے کریں گی۔ عفت اور ثمن بھابھی تو...."
"ہاں تو کافی ہیں۔ مزید کسی چیز کی ضرورت ہو گی تو

امی سے کہہ دوں گی۔ ہیں نا امی! آپ دے دیں گی نا۔" میں نے مسکرا کر امی سے پوچھا۔

اور پھر امی نے میرے نہ نہ کرنے کے باوجود تین ہزار روپے میری مٹھی میں دبائے' میرے ماتھے کو چومتے ہوئے ان کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ ہمارے درمیان کھڑی دیوار پر آج پہلی زوردار ضرب پڑی تھی۔



"تم دونوں تو میرے کمرے میں آتی ہی نہیں۔ میں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں ہی تمہارے پاس آجاؤں۔" حنا اور ہما کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میری آواز خاصی بلند تھی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیزی سے دیکھا۔

"تمہارے پیپرز کب ختم ہو رہے ہیں۔" میں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

"بس کل لاسٹ ہے۔" ہما نے جواب دیا۔

"آؤٹنگ پر چلیں کہیں؟" میں نے کچھ جوش سے پوچھا۔ ان دونوں کی بھی آنکھیں چمکیں۔

"کہاں؟" دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"تم بتاؤ۔" میں نے معاملہ ان پر چھوڑا۔

"وہ... پرسوں... حنا کی برتھ ڈے ہے... اگر..." ہما نے کچھ جھجکتے ہوئے کہنا چاہا ہی تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔ ہم پرسوں کیک لے کر سی سائیڈ چلیں گے۔ وہیں کیک کاٹیں گے۔ ڈنر کریں گے اور... حنا کو اس کی پسند سے گفٹ بھی دلا دیں گے۔ کیسا؟"

وہ دونوں میرے پروگرام پر تقریباً" چیخ پڑیں۔ اور پھر دو دن بعد ہم نے ایک بھرپور شام گزاری۔ ہما اور حنا کے چہرے پر خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ امی اور ابو بھی خوش اور عدنان بھی سرشار سے' اور میں... میری تو خوشی دیدنی تھی۔

"آیئے امی!" ٹیکسی سے اترتے ہوئے میں نے اپنی ساس کا ہاتھ پکڑ کر انہیں سہارا دیا۔ جب ہم سب ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو گیٹ کے قریب بے چینی سے ٹہلتی ہوئی ثمن بھابھی نے روکا۔

"کہاں گئے تھے تم لوگ؟"

"وہ بھابھی آج حنا کی برتھ ڈے تھی نا تو عدنان ہم سب کو کھانا کھلانے لے کر گئے تھے۔"

"اچھا۔" ثمن بھابھی نے نخوت سے کہا اور اپنے پورشن کی طرف قدم بڑھائے۔

"انہیں کیا ہوا؟" میں نے اچنبھے سے کہا۔

"جل گئی ہوں گی' ہمارا ہوٹلنگ کرنا کہاں برداشت ہوا ہو گا ان سے۔" ہما نے کندھے اچکاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دیا۔

رات کو عدنان نے چائے کی فرمائش کی۔ میں اٹھنے ہی لگی تھی کہ امی نے حنا سے چائے بنانے کو کہا۔ حنا بغیر کسی اعتراض کے ہم سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔

☆ ☆ ☆

"آجائیں' دروازہ کھلا ہے۔" اپنے کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز پر میں بے اختیار اٹھ بیٹھی۔

"ہم نے سوچا۔ تم سے گپ شپ لگائی جائے۔" عفت بھابھی نے ثمن بھابھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا کیا بھابھی آپ نے۔" میں نے بھی بہت پیار سے جواب دیا۔

"کل تو بڑی سیریں ہو رہی تھیں۔ مگر کچھ عجیب سا لگا۔ میاں بیوی کے رومانٹک ڈنر میں سسرال والوں کا کیا کام؟" ثمن بھابھی نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے نہیں بھابھی! وہ ہمارا کوئی پرسنل ڈنر نہیں تھا۔ ہم تو حنا کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے گئے تھے۔" میں ان کی غلط فہمی دور کی۔

"پھر تو ہو چکی تم لوگوں کے درمیان انڈر

اسٹینڈنگ۔" عفت بھابھی نے طنزیہ کہا۔

"انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ کرنے کے لیے اکیلے ڈنر کی کیا ضرورت ہے۔ ہم گھر میں بھی ساتھ رہتے ہیں۔" میں قدرے اچنبھے سے پوچھا۔ "اور مجھے ویسے بھی فیملی کے ساتھ تفریح کرنا بہت پسند ہے۔"

"اس طرح اپنا گھر کیسے بناپاؤں گی۔" عفت بھابھی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"اپنا گھر... یہ ہے تو میرا گھر... الگ گھر بنانے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔" میں ان کی بات سمجھ گئی تھی' مگر پھر بھی پوچھا۔

"رہنے دو عفت! اسے ابھی سمجھ ۔۔ نہیں آئے گی۔ اسے کیا پتا اکٹھے رہنے سے بچوں کی شخصیت کتنی کنفیوزڈ ہو جاتی ہے۔ ہر کسی کی روک ٹوک اور بے جا مداخلت سے بچوں پر کتنا برا اثر پڑتا ہے۔ اسے ابھی معلوم نہیں' مگر یہ وقت کون سا زیادہ دور ہے' دیکھیں گے کہ بچوں کے بعد یہ "اپناپن" کتنی دیر تک قائم رہتا ہے۔" ثمن بھابھی نے عفت بھابھی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

کہ جو لوگ سمجھنا نہ چاہیں ان کو سمجھانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے ۔ اس رات پندرہ سالہ معید کو چھپ چھپ کر سگریٹ پیتے دیکھ کر مجھے عفت بھابھی پر شدید افسوس ہوا۔ جن کی لاپروائی کی وجہ سے معید کچھ زیادہ ہی کانفیڈنٹ ہو گیا تھا۔



"عفت بھابھی بتا رہی تھیں کہ آپ لوگ ہما کا رشتہ طے کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ ہم سے تو کسی نے نہیں پوچھا۔" ثمن بھابھی نے چائے کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے جتایا۔

"ارے کہاں بھابھی! ابھی تو ذکر ہی چھڑا ہے۔ سب کے مشورے کے بعد ہی رشتہ فائنل ہو گا اور رشتے کا کیا ہے آپ بھی تلاش کرلیں۔ ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" میں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

"ویسے بھی بہو! ابھی تو ہم نے گھر پر اتنا خرچ کیا ہے۔ اتنی جلدی تو ہم بھی ہما کی شادی نہیں کر سکتے۔ ابھی تو رشتہ ہی طے کریں گے۔ شادی تو ایک ڈیڑھ سال تک ہی کرپائیں گے۔ ابھی تو دیکھنے دکھانے کا سلسلہ ہی چلے گا بس۔"

"میری بہن کا رشتہ تو طے ہو گیا ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے۔ امی نے کہا تھا کہ کل تک مٹھائی بھیج دیں گی۔ آپ کی طرف بھی بھجواؤں گی۔"

"یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے۔ اپنی امی کو بھی میری طرف سے مبارک باد دینا۔" میری ساس نے خوش دلی سے کہا۔

"ویسے ہماری نیہا خوب صورت بھی تو بہت ہے۔ رنگت تو اتنی سفید ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے۔ دور سے ہی اس کا گورا رنگ چاندنی کی طرح چمکتا ہوا نظر آجاتا ہے۔ گورا رنگ ہی لڑکے والوں کی ڈیمانڈ ہے۔ سانولی لڑکیاں تو نہ جانے کتنی بار ریجیکٹ ہوتی ہیں۔ ہما! تم بھی کوئی فیشل ویشل کروالو۔ کہو تو تمہیں اپنے پارلر سے اپائنٹمنٹ لے دوں؟ دیکھو کیسے رنگ خراب ہو رہا ہے۔" بات سے بات جوڑتی وہ ہما کو شرمندہ کر گئیں۔

"ویسے ایک بات ہے فاطمہ! اس گھر کی تینوں بہوؤں اور بہوؤں کی بہنوں کے رنگ میدے کی طرح سفید ہیں۔ اب ارم کو ہی دیکھ لو' ماشاء اللہ چاندنی جیسا رنگ ہے اس کا۔" ثمن بھابھی نے مجھے اپنا ہمنوا بنانے کے لیے ارم کو بلاوجہ گھسیٹا۔

ثمن بھابھی کی مسکراہٹ میں جیتنے کا فخر تھا وہ جانتی تھیں کہ میکے اور سسرال کے موازنے میں ہر لڑکی میکے والوں کو ہی چنتی ہے لیکن مقابل میں تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابھی! ارم کا رنگ تو واقعی بہت گورا ہے۔ لیکن وہ اپنے بالوں کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہے۔ اس کے بال کندھوں سے آگے بڑھ کر ہی نہیں دیتے۔ ویسے نیہا بھی تو پریشان

رہتی ہو گی نا اپنے قد کی وجہ سے۔ اس کا قد کاٹھ چھوٹا ہے۔ لیکن ماشاء اللہ چہرہ بہت خوب صورت ہے۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں انہیں جواب دیا۔

"اور عفت بھابھی کی بہن نوین کا وزن کتنا زیادہ ہو گیا ہے۔ ساری خوب صورتی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اگر فگر متناسب نہ ہو تو۔ آج کل تو لوگ دبلی پتلی مانگتے ہیں اور لمبے بال بھی لڑکوں کو بہت پسند ہوتے ہیں۔ اور ہما اپنے لمبے سلکی بالوں' متناسب فگر اور لمبی ہائیٹ کے ساتھ سنہری رنگت لیے ہم سب کی بہنوں سے زیادہ نمبر لیتی ہے۔" میری بات پر جہاں بلش ہوتی ہما کو دیکھ کر میری ساس اور حنا کے چہرے کھل گئے۔ وہیں ثمن بھابھی کی آنکھوں میں عجیب سی بے یقینی آ ٹھہری۔

"امی! نوید کہہ رہے تھے کہ اس بقر عید پر آپ اپنا قربانی کا جانور خود ہی خرید لیں۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے کولیگز کی دعوت کرنی ہے اور عفت بھابھی کے میکے والے بھی عید پر یہاں آ رہے ہیں اسی لیے آپ اس دفعہ جانور خود کر لیجئے گا۔" جلدی جلدی بات مکمل کر کے ثمن بھابھی جھٹ پٹ کمرے سے باہر نکلیں۔

"اب کیا ہو گا؟ اس بار تو قربانی کرنے کی سکت بالکل نہیں ہے۔ پچھلے سال ابراہیم صاحب کی بیماری کی وجہ سے قربانی نہ کرنے پر نوید اور حامد نے جو پانچ سات کلو گوشت ہمیں دیا تھا' وہ تب سے ہی عفت اور ثمن کی آنکھوں میں کھٹک رہا ہے۔ اس دفعہ کیسا پکا انتظام کیا ہے کہ..." آہستگی سے بولتے ہوئے میری ساس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں بہت گہری تھیں۔

"کوئی بات نہیں امی! اگلی عید پر ان شاء اللہ قربانی ضرور کریں گے۔" ہما نے امی کے کندھوں کو نرمی سے دبایا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"یہ لیں امی! بیس ہزار روپے۔ ہم اس دفعہ قربانی ضرور کریں گے۔"

"لیکن یہ پیسے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟"

امی نے حیرانی سے کہا۔

"امی! یہ میری کمیٹی کے پیسے ہیں۔ ان پیسوں میں بکرا آجائے گا۔"

"لیکن بہو! یہ کمیٹی تو تم نے اپنے کمرے کے پردے اور کارپٹ ڈلوانے کے لیے ڈالی تھی۔ نہیں بہو! میں یہ پیسے نہیں لے سکتی۔" امی متامل تھیں۔

"اللہ کی راہ میں دی جانے والی قربانی میرے جوڑے ہوئے پیسوں سے کی جائے' اس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی سعادت ہو گی بھلا؟" میں نے مسکرا کر کہا تھا۔

"پردے اور کارپٹ پھر آجائیں گے۔ آپ پلیز یہ رکھ لیں اور ہاں! عدنان کو نہ بتائیے گا۔ بلاوجہ شرمندہ ہوں گے۔ یہ ہم ماں بیٹی کا آپس کا معاملہ ہے۔ پلیز امی!" میں نے ہزار ہزار کے بیس نوٹ زبردستی ان کی مٹھی میں دبائے۔

"سدا خوش رہو!" مجھے دعا دیتے ہوئے ان کے جھرّیوں بھرے چہرے پر ڈھیر سارا اطمینان اُترا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ابو' امی' فاطمہ' حنا' ہما... کہاں ہو تم سب۔" عدنان بلند آواز میں ہم سب کو پکارتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے تو ہم سب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہوا بیٹا! خیریت تو ہے؟" عدنان کے چہرے سے ٹپکتی خوشی اور ہاتھ میں مٹھائی کے ڈبے نے ہماری تشویش کو حیرت میں بدلا۔

"ابو' امی! میری پروموشن ہو گئی ہے۔ تنخواہ بھی ڈبل اور سال میں دو بونس بھی ملا کریں گے۔" عدنان نے باری باری ہم سب کے منہ میں میٹھے میٹھے رس گلے ٹھونستے ہوئے کہا۔

"جیتے رہو بیٹا! ہمیشہ یونہی خوش رہو۔ ترقی کرتے رہو۔" میرے سسر نے عدنان کا کندھا تھپتھپایا۔

"شاد رہو آباد رہو۔" میری ساس نے عدنان کا ماتھا چومتے ہوئے دعا دی۔

"بھیا! اب تو ہماری پاکٹ منی بھی ڈبل ہو گی نا۔"

حنا اور ہما بھی بے حد خوش تھیں۔

"ہاں بھئی سب کچھ ہو گا۔ یہ دیکھو چالیس ہزار کا بونس ملا ہے۔ خوب تگڑی قربانی کریں گے۔" عدنان نے چالیس ہزار امی کو پکڑائے۔

"یہ لو بہو! تمہارے پیسے۔" عدنان کی شرمندگی کا خیال کیے بغیر امی نے ان کے سامنے ہی گن کر بیس ہزار روپے میری طرف بڑھائے۔

"رہنے دیں امی!" عدنان کی سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں امی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"نہیں بیٹا! تم رکھو یہ پیسے۔ اللہ بڑا **مسبب الاسباب** ہے۔" امی نے پیسے میرے ہی انداز میں میری مٹھی میں دبائے۔

"بے شک تو بڑا کارساز ہے۔" آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے ان الفاظ کو سہ بار دہرایا۔

آج محلے کی عورتوں کے سامنے میری ساس نے مجھے معاملہ فہم اور سمجھ دار بہو کا لقب دیا تھا۔ میرا دیرینہ خواب 'میری حسرت' آج آدھی ادھوری ہی سہی پوری ہوئی تھی۔

"میں سرخرو ہو جاؤں گی امی! اگر آپ مجھے میری غیر موجودگی میں نہیں بلکہ میرے سامنے سراہیں۔" نیند کی وادی میں جانے سے پہلے میں نے خود کلامی کی۔

☆ ☆ ☆

"ہاں تو ماما! اب بتائیں زویا کس پر گئی ہے۔" گیلے ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے میں نے زویا کو گود میں لیے بیٹھی اپنی ماما سے پوچھا۔

"بالکل تم پر گئی ہے۔ تم بھی اتنی ہی پیاری ہوا کرتی تھیں۔" ماما نے زویا کے ماتھے کو پیار سے چومتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی میری فاطمہ کی طرح بڑی صابر شاکر بچی ہے۔ یاد ہے بچپن میں فاطمہ نے بھی کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔ جب سے آئے ہیں ایک دفعہ بھی نہیں روئی۔" دادی نے مسکراتے ہوئے میری تعریف کی۔

"فاطمہ! عدنان کب تک گھر آتا ہے۔ سات بج گئے ہیں ابھی تک گھر نہیں آیا۔"

"وہ پاپا! اصل میں آج کل پروموشن کی وجہ سے کام زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لیے دیر ہو جاتی ہے۔ ورنہ تو چھ سات بجے تک گھر واپس آجاتے ہیں۔" میں نے پاپا کے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ جواباً" انہوں نے میرا سر بڑے پیار سے تھپتھپایا۔

"پاپا! آپ ہمیشہ فاطمہ آپی کو مجھ سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔" ارم نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"ارے نہیں میں تو تم دونوں سے ہی بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔" پاپا نے ارم کو اپنے دوسرے بازو کے گھیرے میں لیا۔

"آپی آپ کا گھر بہت پیارا ہے اور آپ کے کمرے میں پردوں اور کارپٹ کی ڈارک بلو اور آف وائٹ اسکیم کتنی پیاری لگ رہی ہے نا۔"

"گھر کی تعمیر پر کافی خرچ آیا ہو گا۔ لگتا ہے عدنان کی جاب بڑی اچھی جا رہی ہے۔" ماما کے کہنے پر میں نے گڑبڑا کر پاپا کو دیکھا تو جواباً" انہوں نے مجھے اشارہ سے خاموش رہنے کا کہا کہ زیور بیچنے والی بات کا علم صرف میرے پاپا کو تھا۔ انہوں نے مجھے خوب سراہا تھا لیکن ماما کو بتانے سے بھی منع کیا تھا۔

میں چائے بنانے گئی تو ارم کو ہما اور حنا کے کمرے میں چھوڑ گئی کہ وہ بڑوں کے درمیان بور نہ ہو۔ ساس کو بلا کر دادی اور ماما کے پاس بٹھایا۔ پاپا تو پہلے ہی ابو سے گپ شپ لگا رہے تھے۔

میں کچن میں مختلف لوازمات بنانے میں مگن تھی اور میری بیٹی زویا باری باری سب کی گودوں میں گھوم رہی تھی۔ میرے میکے والے اس بار میرے گھر بقر عید کرنے آئے تھے۔

"فاطمہ! تم کیا سارا وقت پھرکی کی طرح گھومتی رہتی ہو۔ اس گھر میں اور لوگ بھی رہتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی فرض ہے یا نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہاری نندیں تو سارا دن پلنگ ہی توڑتی رہتی ہیں۔ گھر کے

سارے کام صرف ایک ہی انسان کی ذمہ داری تھوڑی ہے۔ میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اپنے شوہر کو لے کر الگ ہو جانا مگر نہیں تم باپ بیٹیوں نے کبھی میری بات مانی ہے جو اب مانو گی۔" ماما کو موقع ملا تو وہ کچن میں میرے کان بھرنے آگئیں۔

"مجھے ہی دیکھ لو' ساری زندگی سسرال کے لیے وقف کردی۔ بدلے میں کیا ملا تمہارے پاپا کی بے اعتنائی اور عمر بھر کی تنہائی۔ تمہارے ابو کے دل میں میری لیے کوئی جگہ بننے ہی نہیں دی تمہارے دودھیال والوں نے۔" ماما مجھے سمجھاتے ہوئے دلبرداشتہ ہوئیں۔

"ماما! آپ پاپا سے معافی مانگ لیں۔ آپ سے غلطیاں ہوئیں ہیں ماما! آپ مانیں یا نہ مانیں ورنہ یہ تنہائی آپ کو ڈستی رہے گی۔"

"کیوں معافی مانگوں میں۔ میں نے کیا کیا ہے؟" ماما نے نخوت سے کہا۔

"مجھے میری غلطیاں نہ گنواؤ۔ سسرال والوں سے الگ نہ ہو کر تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ اس کی فکر کرو۔" ماما نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماما! مجھے الگ نہیں ہونا۔ میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔ میری ساس نندیں میرے کہے بغیر ہی میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ہما اور حنا کالج جانے سے پہلے صفائی کر کے جاتی ہیں۔ کپڑے بھی وہ ہر سنڈے کو مشین لگا کر خود ہی دھو لیتی ہیں۔

میری ساس نے میرے منع کرنے کے باوجود صفائی کے لیے ماسی رکھ دی۔ باقی تو کھانا اور برتن ہی رہ جاتے ہیں اور پانچ چھ لوگوں کا کھانا بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

اور زویا کو سارا وقت میرے ساس سسر ہی سنبھالتے ہیں۔" میں نے رسانیت سے اپنی بات سمجھائی۔

"یقین کریں امی! عدنان اگر مجھے کبھی ہلکا سا بھی ڈانٹ دیں تو امی ابو ان کی خوب خبر لیتے ہیں۔ کوئی منہ سے کہے نہ کہے' لیکن میرے لیے میرے سسرال والوں کی آنکھوں میں امڈتی ستائش مجھے گھنٹوں سرشار رکھتی ہے اور اسی سرشاری میں سارا کام کیسے ہو جاتا ہے' پتا ہی نہیں چلتا۔ آپ کو پتا ہے' عفت بھابھی اپنے بیٹے کے لیے ابھی سے زویا کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں بہو فاطمہ جیسی ہی چاہیے۔ اور سراہنا کسے کہتے ہیں۔"

"تو پھر ابھی سے سوچو نا! عدنان اپنی ساری جمع پونجی اپنی بہنوں کی تعلیم اور شادی پر خرچ کردے گا تو پھر تمہارے اور زویا کے لیے کیا بچے گا۔"

ماما نے میری بات مجھ پر ہی مارنی چاہی۔

"ماما! زویا کو مجھے بھی بہت کچھ دینا ہے۔ لیکن صرف اچھی تربیت' باقی رہی دنیاوی چیزیں تو وہ اس کے مقدر سے مل جائیں گی۔ بہنیں بھی تو بیٹیاں ہی ہوتی ہیں اور عدنان اپنی بہنوں کو پوری عزت پورے مان سے رخصت کریں' یہ ان کا ہی نہیں میرا بھی بہت بڑا خواب ہے۔ اللہ بہترین کارساز ہے۔ وہ میرے کام جس طرح سنوارتا آیا ہے' آئندہ بھی اسی طرح سنوارے گا۔ اس بات پر مجھے پورا یقین ہے۔" ماما کے گلے میں بانہیں ڈالے میں انہیں مطمئن کر رہی تھی۔

"کچھ بھی کہہ لو فاطمہ! سسرال والے بہو کو بیٹی کا مقام کبھی نہیں دیتے۔" ماما کہاں ماننے والوں میں سے تھیں۔

"لگتا ہے عدنان آگئے۔" بیل کی آواز پر میں نے ماما سے کہا۔ بات ادھوری رہ جانے پر ماما خاصی بدمزہ ہوئی تھیں۔



"فاطمہ! جلدی سے سلیپرز لے آؤ۔ ابو آوازیں دے رہے ہیں۔" عدنان جو کہ عید کی نماز پڑھنے کے بعد واش اینڈ ویر کے ایک پرانے سے سوٹ میں ملبوس مجھے آوازیں دے رہے تھے۔

"یہ لیں۔" میں نے سلیپرز ان کے پاؤں کے پاس رکھے۔

"ویسے بڑے اچھے لگ رہے ہیں ان کپڑوں

میں۔" میں شوخ ہوئی۔

"ہاں بڑا اچھا لگ رہا ہوں۔ ابو سے کہا بھی تھا کہ قصائی کو بلا لیتے ہیں۔ لیکن نہیں۔ قربانی کرنی ہے تو خود ہی کرنی ہے۔ ویسے آج بیگم صاحبہ بھی کسی مغلیہ سلطنت کی شہزادی لگ رہی ہیں۔" عدنان نے میرے آف وائٹ اور شاکنگ پنک کنٹراسٹ والی فراک اور چھم چھم کرتی ہوئی پنک اور سلور چوڑیوں کے آگے پڑے بیلے کے گجروں کو غور سے دیکھتے ہوئے میری تعریف کی۔

"اگر اس شہزادی کو پتا ہوتا کہ لڑکا قصائی ہے تو اس قصائی سے شادی کبھی نہ کرتی۔" شرارت سے کہہ کر میں صحن میں آ گئی جہاں بے تحاشا رونق تھی۔ ثمن بھابھی اور عفت بھابھی نے قربانی عید کے دوسرے دن کرنے کا سوچا تھا۔ سو عفت بھابھی اپنے میکے والوں سمیت اور ثمن بھابھی اپنے بچوں سمیت وہیں موجود تھیں۔ ہما، حنا اور ارم رنگین تتلیوں کی طرح ادھر اُدھر اُڑتی پھر رہی تھیں۔ سب کے بیٹھنے کے لیے صحن میں کرسیاں ڈلوا لی گئی تھیں اور صحن کے سامنے والے حصے میں میرے سسر اور عدنان، نوید بھائی اور حامد بھائی کے ساتھ مل کر قربانی کی تیاری کر رہے تھے۔

"ابو جی! آپ چھری پھیریں، اس کو میں قابو کرتا ہوں۔" عدنان نے ہاتھ میں پکڑی چھری ابو کی طرف بڑھائی۔

"نہیں بیٹا! قربانی کا جانور تمہارے پیسوں سے آیا ہے۔ قربانی بھی تم ہی کرو گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا! میرے پیسے آپ کے ہی تو ہیں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی وجہ سے ہی ہوں۔ بس میں نے کہہ دیا بکرے کے گلے پر چھری آپ پھیریں گے۔" عدنان نے ابو کو زبردستی چھری تھمائی۔ نوید بھائی اور حامد بھائی کے چہروں پر کھسیانی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"آج ہمارے گھر کی خوش حالی کی سب سے بڑی وجہ فاطمہ ہے۔ مجھے آج یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر فاطمہ میری بہو نہ ہوتی تو میرا عدنان ہمارے معاملے میں اتنا ذمہ دار اتنا حساس نہ ہوتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بیٹا والدین کے لیے دودھ کی طرح ہوتا ہے۔ اگر بہو کھٹاس ہو تو بیٹا پھٹے ہوئے دودھ کی طرح کسی کام کا نہیں رہتا اور اگر بہو جاگ (دہی جمانے کے لیے استعمال ہونے والی میٹھے دہی کی تھوڑی سی مقدار) ہو تو بیٹا دہی کی مانند دودھ سے زیادہ فائدہ دیتا ہے اور میری فاطمہ وہی جاگ ہے۔"

میرے ماتھے کو چومتے ہوئے میری ساس کی آنکھوں میں میرے لیے ڈھیروں پیار تھا۔

اتنی عزت اتنا مان اتنا پیار..... میری ساس نے میری تشنگی کو ایسے مٹایا تھا کہ میں دنگ رہ گئی تھی۔ امی مجھے سب کے سامنے ایسے عزت دیں گی' یہ تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

سب کی ستائشی نگاہیں چمک چمک کر میری طرف اٹھ رہی تھیں۔ دادی اور پاپا کی نظروں میں فخر مجھے سرشار کر رہا تھا۔ البتہ میری ماما نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ ان کی پیشن گوئی غلط ثابت ہوئی تھی۔ مجھے لگا آج شاید ماما اپنی غلطی مان لیں گی۔ وہ پاپا سے معافی ضرور مانگیں گی۔

"یہ لو بیٹا..... بسم اللہ کرو۔" میرے سسر نے چھری میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

چھری کے دستے کو ہاتھ لگاتے ہوئے میں گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

ہر قربانی اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی انعام لے کر آتی ہے اور میری قربانیوں کا انعام مجھے مل گیا تھا۔

آج میرے دیرینہ خواب نے تعبیر پالی تھی۔ اجنبیت اور نفرت کی وہ مضبوط دیوار جو پے در پے پڑنے والی ضربوں سے شکستہ ہو چکی تھی' آج دھڑام سے گر گئی۔

مسلسل کوشش اور خلوص نیت سے میں نے زندگی سے سچی خوشی کشید کر لی تھی۔



تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

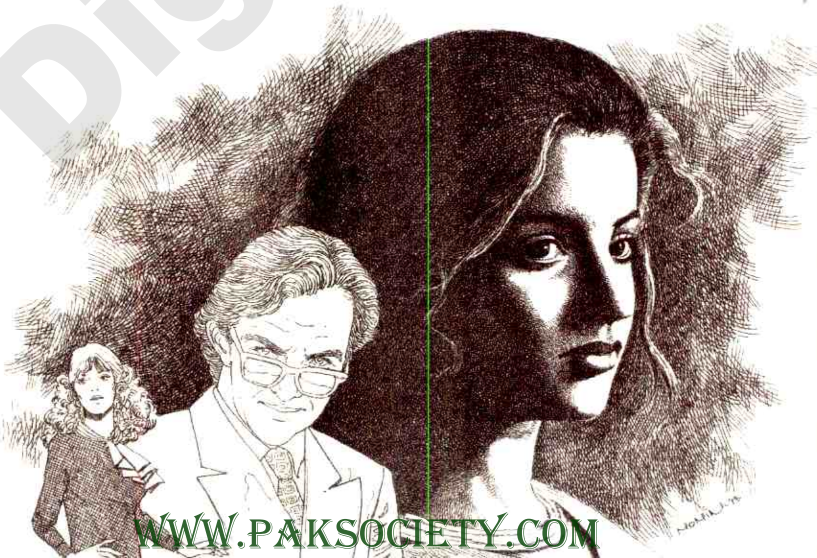
نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا، شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے، لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت پر یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول





WWW.PAKSOCIETY.COM

اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ میتارا و اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پا کو بتایا۔ وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امامہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں، وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ اسے سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امامہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امامہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امامہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امامہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امامہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امامہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امامہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے، لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈپا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹرایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی کے انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوالیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتادیتا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا ہے دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری 'گھر جا کر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹرایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹرایرک سے شادی کرلی۔

نور محمد 'احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار 'عمدہ خوشبو' نفیس گفتگو' اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ اللہ کا دین توکیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے 'اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات میتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب ٹیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگادیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرپرسن حمید کا دوانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کردیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے 'جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مرجاتا۔ نور محمد 'احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتادیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ٹیا کو بے حد چاہتا ہے، لیکن وہ انتہائی خود غرض، مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔
بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ٹیا کو ملواتا ہے۔ ٹیا، عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ٹیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ٹیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی، ٹیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ٹیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہوجاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ٹیا جیسی بناوٹی، خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔
بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں، زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کرلیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز، زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

— ۸ —

آٹھویں قسط

رات سیاہ تھی مگر خوب صورت تھی۔ آسمان کے وسیع گھیر دار سیاہ لبادے پہ ننھے موتیوں جیسے چمکیلے تارے ٹنکے تھے۔ ننھے معصوم بچوں جیسے تارے نجانے کون سے کھیل کھیل رہے تھے کہ جب پکڑے جاتے تھے تو ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے تھے اور اسی لیے ٹمٹمانے لگتے تھے۔
زارا کب سے آسمان کو تکنے میں مگن تھی اور شاید آسمان اسے۔ یہ ان کے بچپن کے کھیل تھے۔ وہ جب چھوٹی تھی تب بھی آسمان پر بکھرے تاروں کو دیکھتی اور اس میں وہ چہرے کھوجتی رہتی، جن کی یاد اسے ستایا کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے محبوب لوگوں کو یاد کرنے میں بڑا وقت بتایا تھا۔ بچپن میں ممی کی نائٹ شفٹ ہوتی تو ممی کا انتظار کرتے کرتے آسمان پہ بکھرے تاروں کو کھوجتے اسے کب نیند آجاتی، پتا ہی نہ چلتا۔ ممی گھر پہ ہوتیں تو پاپا کی شفٹ ہوتی اور وہ انہیں یاد کرتی رہتی۔ پھر شہروز ان یادوں میں نہ جانے کیسے حصے دار بن گیا۔ شہروز اس کی پچیس سالہ زندگی میں پورے بیس سالوں پر قابض تھا۔ وہ پانچ سال کی تھی جب پاپا، ممی اسپیشلائزیشن مکمل کرکے آسٹریلیا سے لاہور شفٹ ہوئے اور تب ہی سے ماموں کا گھر جیسے اس کا اپنا گھر ہو گیا اور ماموں کے بچے اپنے بہن بھائی ہو گئے۔ شہروز کے ساتھ اس کی شروع سے بنتی تھی۔ وہ باقی کزنز کی طرح اس کا مذاق نہیں اڑاتا تھا، اسے چڑاتا نہیں تھا اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی دلجوئی کرتا تھا۔ اس کی بہتی ناک اور بہتے آنسوؤں کو پونچھ دیا کرتا تھا۔ اس کے ہوم ورک میں مدد کرنا، اس کی پسندیدہ کھانے کی چیز میں حصہ رکھنا، اس کے ساتھ سائیکل چلانا، اس کے گلے شکوے سننا، اس کے مسئلے حل کرنا۔
شہروز نے کیا کیا نہ کیا تھا اس کے لیے تو پھر وہ کیسے اس کی محبت میں مبتلا نہ ہوتی۔ وہ کیسے اس کے سحر سے نکلتی۔ وہ کیسے یہ سمجھاتی خود کو، کہ اس کے علاوہ بھی شہروز کے لیے کچھ اہم ہو سکتا تھا اور اب ٹیپو نے اس پر کیا منتر پڑھ کر پھونک ڈالا تھا کہ اسے خود بخود سب سمجھ میں آگیا تھا۔ اسے محبت کو محبت سے کرنا آگیا تھا۔ وہ "محبت" کو پہچان گئی تھی۔
ٹیپو کی باتیں اس کے ذہن میں جیسے نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسے ایک ایک لفظ جیسے ازبر تھا۔

"صرف شہروز نہیں ہے، جو تم سے محبت کرتا ہے۔ کوئی اور بھی ہے۔" ٹیپو نے کہا تھا پگڈنڈی پہ کھڑے نیلے آسمان کے نیچے وہ اسے دنیا کی حقیقت بتا رہا تھا۔

"اور کون؟" زارا نے پوچھا تھا۔

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔"

ٹیپو کے جواب نے اس پر حقیقی معنوں میں ٹھنڈا پانی انڈیل دیا تھا۔ اسے بڑی شرمندگی ہوئی اور یہ وہ شرمندگی نہیں تھی جو انسان دوسرے انسان کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ شرمندگی تھی، جو انسان اپنے آپ سے محسوس کرتا ہے۔ یہ شرمندگی ــــ شہ رگ سے اوپر اٹھتی ہے اور پھر دماغ سے ہوتی ہوئی سب حواسوں پر چھا جاتی ہے۔ سلو پوائزن کی طرح دھیرے دھیرے خون میں منتقل ہوتی ہے اور پھر لاچار کر دیتی ہے۔ اس لمحے زارا کو احساس ہوا کہ جب انسان کا ضمیر اسے شرمندہ کرنے پر آتا ہے تو پھر ادھ موا کر کے چھوڑتا ہے۔

"آپ مجھے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں نا!" وہ سر جھکا کر دھیمی سی آواز میں بولی تھی۔

"ارے یہ کب کیا میں نے!" وہ حیران ہوا۔ زارا کو اس کی مصنوعی حیرانی ذرا بھی نہیں بھائی تھی۔

"آپ یہی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں جبکہ میں ــــ" وہ چپ ہوئی تھی پھر لاچار ہوتے ہوئے بولی۔

"میں آپ جیسی نہیں ہوں ــــ میں بہت عام انسان ہوں۔"

ٹیپو نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

"میں بھی بہت عام انسان ہوں ڈاکٹر زارا ــــ بلکہ میں تو عام سے بھی زیادہ گیا گزرا ہوں ــــ لیکن کیا عام لوگوں کو "خاص محبت" کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ محبت کرنا ہر انسان کا حق ہے۔ میں نے بھی پورے استحقاق کے ساتھ محبت کی ہے لیکن میں نے زندگی میں ایک سبق سیکھ لیا ہے۔ میں کسی جذبے کے ہاتھوں استحصال کا شکار نہیں ہو سکتا اور جذبہ بھی وہ جو میرے دین کا کل خلاصہ ہے۔" وہ چپ ہوا تھا پھر اس کی جانب سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"محبت کیا ہے؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا پھر خود ہی بولا۔

"محبت دنیا کا سب سے خوب صورت جذبہ ہے۔ لوہا جس طرح تپ کر کندن بن جاتا ہے، اسی طرح محبت جب اپنی خالص ترین شکل میں ڈھلتی ہے تو "ممتا" بن جاتی ہے اور ممتا وہ جذبہ ہے، جو کائنات کو متحد رکھنے میں، جوڑنے میں اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ کام آتی ہے۔ ممتا ہی ہے جو انسانوں کو انسانوں سے جوڑتی ہے کیونکہ یہ خود غرض نہیں ہوتی۔ ماں کیا کرتی ہے۔ وہ اولاد میں فنا ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اولاد پہلے اور وہ خود بعد میں ہو جاتی ہے۔ یعنی ممتا اپنی ہستی کو بالائے طاق رکھ کر کسی دوسرے کی خاطر جائز طریقے سے کچھ کرنا اور ایسے کرنا کہ اس میں کوئی ذاتی طلب اور غرض نہ ہو کا نام ہے۔ ماں کے لیے اولاد ہی مقدس اور اولاد ہی مقدم ہو جاتی ہے ــــ یہ ہے محبت کی تعریف اور اس کی تفصیل ہے میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ــــ میں جب دنیا بھر کے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہوں تو کسی ذات کو اتنا خالص نہیں پاتا۔ بے شمار برگزیدہ بندے ہیں۔ انبیا علیہ السلام ہیں۔ صوفیا ہیں۔ اولیا ہیں، جو انسانوں سے محبت کرنے آئے اور کر کے چلے گئے، لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی محبت انسانیت سے کسی اور نے نہیں کی۔ اور میں اپنے اردگرد دیکھتا ہوں نا تو اپنی ماں کا جذبہ اپنے لیے سب سے خالص پاتا ہوں، لیکن روز قیامت میری شفاعت میری ماں بھی نہ کروا سکیں گی۔ میری شفاعت میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کروائیں گے۔ تم ان کے بارے میں سوچو تو سہی کہ اللہ ایک انسان کو مکمل بناتا ہے۔ کامل اور بہترین بناتا ہے۔ سب سے افضل بناتا ہے اور وہ انسان اپنی ساری امت کو خود سے مقدم رکھتے ہوئے دم آخر تک امت

کی رہبری کرتے رہتے ہیں۔ جب ہاتھ اٹھاتے ہیں، امت کے لیے اٹھاتے ہیں۔ جب کچھ مانگتے ہیں، امت کے لیے مانگتے ہیں اور جب التجا کرتے ہیں، امت کے لیے کرتے ہیں۔ دنیا میں اتنا بے غرض انسان کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اتنی خالص، اتنی بے غرض محبت کسی نے کسی سے نہیں کی ہوگی، جتنی میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت سے کی ہے۔" ٹیپو نے اس کی جانب سے لمحہ بھر کے لیے بھی نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

"میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری تعلیمات کا کل خلاصہ انسانیت سے محبت ہے۔ ان کا علم محبت ہے۔ ان کا عمل محبت ہے تو انسان اگر اس دنیا میں محبت کرنے کے لیے ہی بھیجا گیا ہے تو پھر ان سے محبت کیوں نہ کرے، جو دنیا میں سب سے زیادہ باظرف تھے۔ سب سے زیادہ بہترین تھے۔ سب سے کامل تھے۔ سب سے افضل تھے۔ ان سے محبت کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ان سے محبت کرنے سے آپ کو اللہ کی قربت ملتی ہے، اللہ کی قربت ملے گی تو ہی انسان "عہد الست" کا حق ادا کر پائے گا، ورنہ اللہ سے کیا گیا وعدہ پورا نہیں ہوگا اور وعدہ پورا نہیں ہوگا تو جنت کیسے ملے گی۔" وہ پھر رک گیا۔

"مجھے ایسے مت دیکھو... میں بے حد عام انسان ہوں۔ میں صرف محبت نہیں کرتا۔ تجارت بھی کرتا ہوں۔ ان سے محبت کرنے میں میرا فائدہ بہت ہے اور انسان بنیادی طور پر مفاد پرست ہے۔ اسی لیے میں ان سے بہت محبت کرتا ہوں، لیکن چونکہ وہ سب انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ تمام جہانوں کے لیے رحمت العالمین ہیں تو ان تک پہنچنے کے لیے میں انسان سے محبت کا پابند ہوں۔ یہ پابندی میرا مذہب نہیں ہے، یہ عین میری فطرت ہے۔ میں جتنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں اتنا ہی تمام انسانیت سے محبت کرنے کے لیے خود کو مجبور پاتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم میری بات سے اتفاق کرو لیکن میری عقل

یہی کہتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بحیثیت مسلمان ہمارے خون میں ہے۔ ہم اس محبت سے روگردانی کرتے ہیں تو اپنی فطرت سے بغاوت کرتے ہیں۔ فطرت سے بغاوت ہمیں جنونی کر دیتی ہے اور جنون انسان کو تھکا دیتا ہے۔"

زارا نے تھکی تھکی سانس بھری تھی۔

"ڈاکٹر زارا... محبت تھکن کا نام نہیں ہے۔ محبت صرف آسانی ہے۔ اللہ کی عطا ہے۔ انسان اگر کائنات کی عمارت میں اینٹوں کی طرح ہے تو محبت ان اینٹوں کو جوڑنے کے لیے سیمنٹ کا کام کرتی ہے، لیکن ہم لوگوں نے محبت کو بدعت بنا لیا ہے۔ محبت اس لیے نہیں ہے کہ آپ کو لاچار کر دے۔ زچ کر دے۔ آپ کو وہ رہنے دے جو آپ ہیں۔ محبت بوجھ نہیں ہے تو اسے کندھوں پر لاد کر کیوں پھریں۔ یہ طوق نہیں ہے تو گردن میں کیوں لٹکایا جائے۔ محبت باعث آزار نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر زارا... اسے محدود کر کے اپنے لیے آزار مت بناؤ۔ یہ تمہیں تھکا دے گی اور تھکا ہوا انسان کائنات کے لیے بے کار ہوتا ہے۔ محبت کرنی ہے تو خالص محبت کرو وہ محبت جو تمہیں طاقت دے اور اسے بھی طاقت دے جس سے تم محبت کرتی ہو۔" ٹیپو کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ ابھری تھی کہ زارا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی باتوں میں روشنی اتنی تھی کہ اس کا پورا وجود چکا چوند ہوا جاتا تھا اور ابھی بھی وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی سیاہ آسمان کو تکتے ہوئے ان باتوں کے اثر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"انسانیت سے محبت کرو آنسہ زارا... بے غرض، بے لوث محبت... انسانیت سے محبت نہ کرو تو میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں ملتی کیونکہ جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں ملتی اسے پھر کسی کی محبت نہیں ملتی" ٹیپو نے کہا تھا۔

زارا نے دیکھا، آسمان پہ تارے بھی جیسے معطر ہوئے جاتے تھے۔ چاند بھی مسرور تھا اور آسمان بھی سیاہ ہونے کے باوجود سنہرا لگتا تھا۔ جب ہر چیز خالص محبت کو پہچانتی تھی تو وہ کیسے بے خبر تھی... اس کی آنکھ

سے آنسو ٹپکا تھا۔ ایک "تنہا" اکیلا آنسو۔۔۔ پُرسکون' مسرور خوشی کا آنسو۔



نور محمد کی دوبارہ آنکھ کھلی تو بھی وجود جیسے بیدار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ سارا بدن تھکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سر بھاری ہو رہا تھا۔ کمرے کی چھت بھی دھندلی ہوئی جاتی تھی۔ وہ ابھی تک اس خواب کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کرتا تھا جو اس نے رات دیکھا تھا۔ وہ اس عورت کے ہاتھ ابھی بھی اپنے گریبان پر محسوس کر سکتا تھا اور اس جیسے ملتے جلتے خواب اس کی بے چین راتوں کو ایک عرصہ سے مزید بے چین کر رہے تھے۔ وہ بے خوابی کے مرض میں تو مبتلا تھا ہی لیکن کچھ عرصے سے ایسے خواب اس کی بے آرام راتوں میں اضافے کا باعث بنے ہوئے تھے۔

وہ بہت ہمت سے بستر سے اُترا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہی کاغذات کا پلندہ اس کی توجّہ کا مرکز تھا جسے اس نے رات کو بستر کے ایک جانب رکھ دیا تھا۔

"عہد الست" اس نے ایک ہی نگاہ ڈالی تھی اور پھر دوبارہ دیکھنے کا اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا۔ وہ لفظوں سے خائف تھا۔ اسے لگتا تھا اس کاغذات کے پلندے سے لفظ نکلیں گے اور اسے ایک سانس میں نگل لیں گے۔ اس نے دوبارہ اس سمت نگاہ ڈالے بغیر اپنے سلیپرز پہنے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ باتھ روم کے دروازے کے باہر والی دیوار کے ساتھ کلینڈر آویزاں تھا۔ اس نے اس کلینڈر پر تاریخ کو درست کیا تھا۔ ایک ٹھنڈی آہ اس کے سینے سے خارج ہوئی۔



2012ء اپنی نصف سے زیادہ زندگی پوری کر چکا تھا۔ کتنا وقت گزر گیا تھا۔ وہ ابھی بھی اس ایک حادثے کے زیر اثر تھا۔ وقت اگر واقعی مرہم تھا اور زخموں کو بھر سکتا تھا تو اس کے معاملے میں یہ مرہم نجانے کیوں اثر نہیں کر رہا تھا۔ اس نے باتھ روم میں جاتے ہوئے خود

کو پہلے سے زیادہ عمر رسیدہ اور لاچار محسوس کیا تھا۔

پانی تو زندگی ہے... زندگی سے ڈرتے ہوئے واش بیسن کے نل سے بہتا پانی بھی آج اسے کسی کی یاد دلا رہا تھا۔ اس کے دل میں کیا کیا نہیں دفن تھا' اپنا دل اسے اب دل نہیں قبرستان لگتا تھا۔ اس نے منہ پر چند چھینٹے ہی ڈالے اور باہر آ گیا۔ اس کی میز پر اس کا لیپ ٹاپ اسی طرح کھلا پڑا انتظار اس سے کوئی کام نہیں کیا گیا تھا۔ اسے جیسے پھر سے ایک عجب سی بے چینی لاحق ہونے لگی تھی۔ اس نے میز پر پڑی عینک اٹھا کر آنکھوں پر رکھی اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ کی اسکرین دیکھنے لگا۔ پہلی ای میل بہت دن پہلے جا چکی تھی' پہلا سندیسہ بہت پہلے اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے سینے سے دبی دبی سانس خارج ہوئی۔ دوسرا سندیسہ بھیجنے کے لیے پہلے سے زیادہ ہمت درکار تھی۔ پہلے دین تھا اور دنیا بھی تھی' جبکہ دوسرے حصے میں یہ دونوں باہم ضم ہونے جا رہے تھے۔ اس نے لیپ ٹاپ کی جانب دیکھا۔

"عہد الست" اس کی زندگی بھر کا خلاصہ تھا۔

"عہد الست" ہر انسان کی زندگی کا خلاصہ ہے" اس نے آخری جملہ لکھ دیا تھا۔

"میں بلس گرانٹ... میری زندگی کا چالیسواں سال۔"

"آپ بے مثال ہیں' باکمال ہیں۔ آپ کی انگلیاں جادو کرنا جانتی ہیں۔"

یہ مسٹر آرتھر تھے جنہوں نے میرا پہلا ناول شائع کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہی مسٹر آرتھر ڈرنک کا گلاس لیے میرے سامنے کھڑے کہہ رہے تھے۔ میں پیشہ ورانہ انداز میں سر جھکا کر مسکرایا۔ اس مسکراہٹ کی مجھے اب بخوبی عادت ہو گئی تھی۔ ناپسندیدہ لوگوں سے کس طرح ملنا ہے۔ یہ مجھے اچھی طرح آ گیا تھا۔ میں انہیں وہاں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ میرے مداحین کا ایک مجمع تھا۔ کچھ یونیورسٹی طلبا میری سمت چلے آئے۔ میں نے ان میں سے ایک کو اپنا گلاس تھما دیا۔ مجھے آٹو گرافس دینے کا پرانا تجربہ تھا۔ میرا قلم تیزی سے نیک تمناؤں کے پیغامات لکھنے لگا۔

ایک احساس تفاخر تھا جو میری گردن کے زاویے کو نوے سے نیچے نہیں آنے دیتا تھا اور آنے دیتا بھی کیوں۔ میں ناکامی کے بوجھ تلے دبا اب پہلے والا بلی نہیں تھا۔ میں اب ایک مشہور نامور ناول نگار تھا۔ محقق تھا۔ نقاد تھا۔ میری ہر کتاب بیسٹ سیلر تھی۔ مجھے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ میرے مقالے اخباروں میں چھپتے تھے۔ میں اعزازی لیکچر دیتا تھا۔ ٹی وی شوز میں شرکت کرتا تھا اور فلموں کے اسکرپٹ لکھتا تھا۔ وہ بلی جو بیس سال کی عمر میں اپنی ناکامیوں کی گٹھڑی اپنی پشت پر لادے خوار ہوا پھرتا تھا' میرے اندر ہی کہیں پگھل پگھل کر ختم ہو گیا تھا۔ اب میں بلس گرانٹ تھا' جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ منتظر رہتے تھے۔ جس کے قلم سے لفظ نکلتے تھے تو تہلکہ مچ جاتا تھا۔ میں نے یہاں تک کا سفر بہت تیزی سے طے کیا تھا۔

میرے پہلے ناول نے ایسی دھوم مچائی تھی کہ سب تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ بیسٹ سیلر ثابت ہوا تھا۔ تمام اخبارات کے ادبی صفحے پر اس ناول کے تذکرے ہوئے تھے۔ نقادوں نے اسے ایک اچھوتی اور انوکھی کاوش قرار دیا تھا۔ میرا ناول سال کا بہترین ناول قرار پایا تھا۔ اس سال مجھے بیسٹ ٹیلنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس ناول کی اشاعت نے میرے حوصلے میں بیش بہا اضافہ کیا۔

اگلے دو سالوں میں میرا ایک اور ناول مارکیٹ میں آ گیا تھا اور اس ناول نے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ اس کی اشاعت سے مجھے بین الاقوامی سطح پر شہرت ملی' کیونکہ اس ناول کا پرتگالی اور جرمن زبان میں ترجمہ بھی ہوا۔ چند سال بعد اس ناول کی کہانی پر فلم بھی بنائی گئی جو کافی مقبول ہوئی۔ اس کے بعد میں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ کوئی بھی نہیں دیکھا کرتا۔ جب آگے اتنا روشن راستہ ہو تو پیچھے کون دیکھتا ہے اور پیچھے تھا بھی کون' جسے مڑ مڑ کر دیکھنے کی چاہ ہوتی۔

مسٹر ایرک کا انتقال ہو چکا تھا اور کوہو کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ عرف والے واقعہ کے بعد اس عورت سے میری نفرت مزید بڑھ گئی تھی۔ میں اس سے مکمل طور پر لاتعلق ہو گیا تھا۔ میں کئی سالوں سے اپنے آبائی گھر نہیں گیا تھا۔ میں مستقل بنیادوں پر لندن رہائش اختیار کر چکا تھا۔ میں ایک مطمئن خوش باش شخص تھا۔ ایک مکمل، کامیاب شخص... ایک ایسا شخص جیسا ہونے کے میں نے ہمیشہ خواب دیکھے تھے۔

"بلس گرانٹ" میرا نام پکارا گیا تھا۔ میرے نام کی پکار پر زوردار تالیاں بجی تھیں۔ یہ میری پسندیدہ موسیقی تھی۔ یہ مجھے احساس دلاتی تھی کہ میں کون ہوں۔

"بلس گرانٹ... کائنات کے تسلسل کی اہم کڑی۔"



یہ سال 2000ء کی بات تھی۔ ان دنوں میں ایک فلم کے اسکرپٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس کے موضوع کو میں نے ابھی تک پبلک نہیں کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی بھی میرے ناولز کی کہانیوں کی طرح بہت سنسنی خیز تھی۔ یہ ایک روسی خاندان کی کہانی تھی جس کا سربراہ روسی خفیہ ایجنسی کے جی بی کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔

اس شخص نے روسی حکومت کی کرپشن سے تنگ آ کر تمام تر کرپشن افیئرز پبلک کر دیے تھے جس کی بنا پر اسے خدشہ تھا کہ اسے سیاسی قتل کر دیا جائے گا۔ اس لیے یہ شخص اب اپنے خاندان کے ہمراہ برمنگھم میں رہتا تھا اور سیاسی پناہ حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن اس شخص کو چائے میں پلوٹونیم ڈال کر پلا دیا گیا تھا جس سے وہ سسک سسک کر مر گیا تھا۔ اس کی اہلیہ اور بچہ بھی متاثر ہونے کے خدشے کے بنا پر سخت نگرانی میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ یہ ایک ظالمانہ اقدام تھا، جس کی ہر سطح پر مذمت کی گئی تھی۔ سیاسی ایوانوں میں بھی اس واقعے کے چرچے رہے تھے۔ میں اس سچی کہانی پر کام کر رہا تھا۔ اس شخص کی بیوہ مسز لیتھووسکی برمنگھم میں رہتی تھیں۔ سو میرے سیکریٹری نے ان کے ساتھ میری خصوصی ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ مجھے روسی زبان کی ذرا سمجھ بوجھ نہیں تھی، لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ مسز لیتھووسکی کے پاس مترجم کی سہولت موجود تھی۔ میں وقت مقررہ پر ان کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔

"خوش آمدید سر... ہمیں آپ کا ہی انتظار تھا۔ مسز لیتھووسکی بے چینی سے آپ کی منتظر ہیں... تشریف لائیے۔"

آواز تھی یا شدید جھٹکا۔ میں نے چونک کر سامنے والے کا چہرہ دیکھا۔ سادہ سے لباس میں اس سے بھی زیادہ سادہ چہرہ لیے وہ بھوری عورت جس کی آواز جس قدر مانوس تھی، چہرہ اتنا ہی اجنبی۔ میں نے ایک کے بعد ایک دوسری اور تیسری گہری نظر ڈالی۔ اس چہرے میں، اس وجود میں کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا جو مانوس لگتا لیکن دل یکدم ایسے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی برسوں پرانا شناسا دیکھ لیا ہو۔

"ٹیا!" میرے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔



"روسی حکومت اقتدار کے نشے میں انسانیت کے سب اسباق بھول چکی ہے۔ بربریت کے ایسے ایسے قصے دفن ہیں میرے سینے میں کہ سنانے لگوں تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ روسی حکومت نے میرے شوہر کو قتل کروایا ہے تاکہ وہ ان کی کرپشن کی داستان دنیا کو نہ سنا سکیں، لیکن میں ابھی زندہ ہوں اور میں چپ نہیں رہوں گی۔ میں دنیا کو بتا کر رہوں گی کہ روسی حکومت کیسے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے اور مجھے اپنے اس عزم کو پورا کرنے کے لیے آپ جیسے معتبر، مدبر لوگوں کی ضرورت ہے۔ آپ بہت قیمتی، بہت بڑے لکھاری ہیں۔ میں نے آپ کی بہت تعریفیں سنی ہیں۔ آپ انگریزی زبان کا سرمایہ ہیں۔"

ٹیا، مسز لیتھووسکی کے روسی زبان میں بولے گئے

جملوں کو وقفے وقفے سے انگلش میں ترجمہ کر کے مجھے بتا رہی تھی۔ انہوں نے میری تعریف میں جو جملے بولے تھے انہیں ترجمہ کرتے ہوئے ٹیا کے چہرے کے تاثرات مزید سپاٹ اور مصنوعی ہو گئے۔

"تم اتنے برے منہ کیوں بنا رہی ہو۔ یہ میری تعریف میں جو بھی کہہ رہی ہیں' تم کہہ رہی ہیں۔ میں اتنے مختصر لفظوں کا مستحق نہیں ہوں.... میں اس سے بھی بہت آگے کی چیز ہوں۔"

میں نے جتایا تھا۔ میری گردن مزید اکڑ گئی تھی۔ اس کی بیچاری سی حالت دیکھ کر دل کو جو کمینی سی تسکین حاصل ہو رہی تھی' وہ بیان سے باہر ہے۔ اس نے میری بات سن کر مزید برا سا منہ بنایا۔ مسز لیتھووسکی خاموش ہو کر سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"تم اگر کم بولو اور اپنی تعریف سے زیادہ کام پر دھیان دو تو مزید آگے جا سکتے ہو۔"

اس نے منہ بھینچ کر مجھ سے کہا' پھر مسز لیتھووسکی کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے روسی زبان میں کچھ کہنے لگی۔ مسز لیتھووسکی گردن ہلاتے ہوئے اس کی بات سنتی رہیں پھر چند لمحوں بعد میں نے ان کی ملازمہ کو آئس کیوبز لاتے دیکھا۔ ٹیا نے میرے ڈرنک والے گلاس میں کیوبز ڈال دی تھیں۔ مسز لیتھووسکی پھر سے اپنی زبان میں کچھ بولنے لگیں۔

"اپنی مادام کو کم بولنے کا مشورہ کبھی نہیں دیا تم نے .... دینا چاہیے تھا۔"

مسز لیتھووسکی کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے انگلش میں ٹیا سے کہا اور دیکھتا سامنے کی جانب ہی رہا۔ مسز لیتھووسکی خاموش ہو کر منتظر نگاہوں سے ٹیا کو دیکھنے لگیں۔ ٹیا جز بز ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے گدگدی ہوئی۔

"وہ پہلے ہی کافی کم گو ہیں۔ انہیں اس لیے زیادہ بولنا پڑ رہا ہے کیونکہ تم ان کی باتوں کو توجہ سے نہیں سن رہے۔ تمہارا درمیان میں بار بار بولنا ان کی گفتگو میں خلل کا باعث بن رہا ہے۔ تم جب بھی مجھے ٹوکتے ہو' وہ سمجھتی ہیں کہ تم ان سے کچھ پوچھ رہے ہو۔"

اس نے دبے ہوئے لہجے میں چبا چبا کر کہا تھا مگر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کو غائب نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھے مزید گدگدی محسوس ہوئی۔ دل چاہا اسے مزید چڑاؤں۔ میں نے اپنے تجربے سے سیکھا تھا کہ ادھیڑ عمر ہو کر انسان مزید نو عمر ہو جاتا ہے۔

"یہ سب ابھی ابھی کہا ہے انہوں نے تم سے؟" میں نے سوال برائے سوال کیا تھا۔

"نہیں۔ ابھی انہوں نے یہ کہا ہے کہ تم بخوشی وائن انجوائے کرو۔ وہ اپنی بات مکمل کرنے کے لیے چند لمحے انتظار کر سکتی ہیں۔" وہ مسز لیتھووسکی کی جانب دیکھتے ہوئے عاجزانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"میں نے وائن کی بات نہیں کی.... مجھے یہ نہیں چاہیے۔" میں نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ اسے چڑانے میں مزا آ رہا تھا۔

"وائن کے لیے میں نے کہا تھا۔ تم جس طرح مجھے ٹوک رہے ہو۔ وہ بار بار میرا چہرہ دیکھنے لگتی ہیں۔ میں ان سے کیا کہوں کہ تم بار بار مجھ سے کیا کہتے ہو۔ اس لیے میں نے کہا کہ تم ان کی بات سن کر رنجیدہ ہو اور اپنا گلا تر کرنا چاہتے ہو سمجھے!" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"میں ایسا کچھ نہیں چاہتا.... تمہیں غلط بیانی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" میں نے قطعیت سے کہا اور گلاس دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

مسز لیتھووسکی نے استفہامیہ انداز میں ٹیا کا چہرہ دیکھا۔ وہ مکمل طور پر میری جانب متوجہ ہو چکی تھی اور اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر محنت کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ اکتاہٹ کا شکار تھی اور یہ اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا۔ جبکہ مسز لیتھووسکی لاچاری سے ہمیں دیکھتے ہوئے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"میں نے غلطی کر دی ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں۔ تم اب کیا چاہتے ہو' میں سامنے والی دیوار سے اپنا سر دے ماروں۔" وہ واقعی بے حد زچ ہو چکی تھی۔

"یہ غضب نہ کرنا.... میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اتنا مضبوط دل نہیں ہے میرا۔" میں

نے سہمنے کی اداکاری کی۔

"کہیں میں تمہاری بات کا یقین کر ہی نہ لوں۔" وہ کھا جانے والے انداز میں غرائی تھی۔

"یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا تھا۔" میں نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی تھی۔ گفتگو کو اس رخ پر میں نے ارادتاً" نہیں موڑا تھا۔ مسز لیتھووسکی نے ٹیا کا انداز دیکھ کر مداخلت کی تھی۔ وہ پریشان نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے انہیں اپنی زبان میں ٹیا سے کچھ پوچھتے دیکھا اور سنا بھی۔

"اب ان کو کیا جواب دوں میں؟" وہ سابقہ انداز میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں نے زعم بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے گہری سانس بھری۔

"تم ان سے کہو کہ یہاں نزدیک میں ایک اچھی کافی شاپ ہے اور میں تمہیں وہاں لے جانا چاہتا ہوں..... اجازت ہے؟"



"جنون کسی بھی شکل میں ہو 'اگر وہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے تو پھر وہ پہلے بہکاتا ہے اور پھر بھٹکا دیتا ہے۔"

ٹیا نے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ یہ ہماری چوتھی ملاقات تھی اور میرے بے حد اصرار پر وہ اپنے حالات زندگی بتانے پر رضامند ہوئی تھی۔

"میں نے زندگی میں یہی سیکھا ہے کہ کبھی اپنے جنون کے حصول میں اس مقام تک نہ آؤ کہ اپنا مقام ملنا مشکل ہو جائے۔ میرا ہنر میرا رقص تھا اور ہنر کسی بھی شکل میں ہو 'اگر اسے ستائش کی لت لگ جائے تو پھر اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی لت لگ گئی تھی کہ جب میں اپنا ہنر آزماؤں تو دنیا سر جھکا کر واہ واہ کرے اور مجھے دیوی سمجھے۔ ہمارے دھرم میں اچھی رقاصہ دیوی ہی ہوتی ہے اور ایسا سمجھا جاتا ہے کہ رقص میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ رقص کی دیوی انسان کے بدن میں حلول کر جاتی ہے اور وہ مقام رقص کرنے والے کو مکمل کر دیتا ہے۔ اس مقام پر انسان کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ اتنا سرور کہ انسان ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ وہ زمین سے اونچا ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی اوقات بھولنے لگتی ہے اور انسان جب اپنی اوقات بھول جاتا ہے تو پھر بھگوان سے کم کے مقام پر راضی نہیں ہوتا۔ ایسا رقص کرتی تھی میں۔ میں جب رقص کرتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ دنیا میری ٹھوکر کی زد پر آگئی ہے اور زمین سورج کے گرد نہیں 'میرے گرد چکر لگاتی ہے۔ مجھے نظر آتا تھا کہ جب میں رقص کرتی ہوں تو میرے سامنے بیٹھے لوگ مسحور ہونے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے جو رنگ اتر آتے تھے 'میں ان کا نشہ بیان نہیں کر سکتی۔ میں سمجھتی ہوں رقص صرف ہنر نہیں ہے یہ ایک علم ہے... اپنے سامنے موجود دوسرے انسانوں کے حواسوں کو ٹیلی پیتھی یا ہپناٹزم کی طرح اپنے قابو میں کر لینے کا علم ہے۔ میں اپنے آپ کو جادوگرنی سمجھتی تھی۔ میں رقص کرتی تھی تو میرے سامنے بیٹھے انسان مدہوش ہونے لگتے تھے۔ ان کے حواس قائم نہیں رہتے تھے۔ وہ بے قابو ہونے لگتے تھے 'میں نے انسانوں کو اپنے قدموں میں جھکتے' جانوروں کی طرح لوٹتے دیکھا ہے۔ مجھے انسان کا جھکا ہوا سر اچھا لگتا تھا۔ بد بخت ہوتا ہے وہ انسان 'جسے دوسرے انسانوں کا جھکا ہوا سر دیکھ کر لذت حاصل ہونے لگے۔ میں "بدبخت" ہو رہی تھی اور مجھے خبر نہیں تھی۔ شاید اسی طرح زندگی گزرتی چلی جاتی۔ اگر مجھے رمیش نہ مل جاتا۔"

وہ اور میری سانس ایک ساتھ لحہ بھر کے لیے رکی۔ اس کی زندگی میں کوئی تھا' یہ خیال نجانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگا..... میں نے کرسی پر اپنی نشست درست کر کے بائیں ٹانگ دائیں ٹانگ پر جمالی تھی۔ ساتھ والی میز پر ایک ماں اپنے روتے ہوئے بچے کو چپ کروانے میں مگن تھی۔ وہ مسلسل کسی بات کے لیے ضد کر کے اودھم مچا رہا تھا لیکن ٹیا کو اس کے شور و غل نے بھی ماضی سے حال میں نہیں کھینچا تھا۔

"رمیش کے بعد کیا ہوا؟" میں نے اسے بولنے کے لیے اکسایا۔ میں رمیش سے آگے کے واقعات

سننا چاہتا تھا۔

"رمیش بہت بڑا فنکار تھا۔" وہ ابھی بھی سابقہ انداز میں بولی تھی۔ میں نے برداشت کرنے کے لیے گہری سانس بھری۔ مجھے رمیش میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"اس کی میری ملاقات یہیں لندن میں ہوئی تھی۔ وہ میرا ہم وطن تھا' ہم زبان' ہم مذہب تھا۔ اسے میرے رقص سے عشق تھا۔ میں جب بھی کہیں رقص کرتی' کسی پروگرام میں حصہ لیتی' وہ میرے ساتھ ہوتا' میری معاونت کرتا' وہ مجھے سراہتا نہیں تھا' بلکہ وہ میری پرستش کرتا تھا اور یہ بات مجھ پر نشہ طاری کردیتی۔ یہ رمیش تھا جس نے میری تعریفوں میں ایسے ایسے قلابے ملائے کہ میں مزید بہکنے لگی۔ میں واقعی خود کو کسی دیوی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے اپنے آگے دنیا ہیچ نظر آتی تھی۔ مجھے اپنے ماں باپ اپنے اس ہنر کے آگے غیر اہم لگتے تھے۔ مجھے یاد ہے' میری ماں میرے آگے ہاتھ جوڑتی تھی کہ گھر پلٹ آؤ اور میں کہتی تھی "ماں! بھگوان چار دیواری میں نہیں رہ سکتا' دنیا کو میرا فیض حاصل کرنے دو۔" میں اپنے آپ کو بھگوان سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ تمہیں پتا ہے ہمارے دھرم میں ہم جسے خدا سمجھتے ہیں' اسے مٹی سے خود تخلیق کرتے ہیں اور میں اتنی خود پرست تھی کہ میں نے کبھی دل سے اس پتھر کو خدا نہیں سمجھا تھا' بلکہ میں اپنے آپ کی پرستش میں مبتلا تھی۔ میرا جنون مجھے کھانے لگا تھا اور مجھے اس کی خبر نہیں تھی۔

1990ء میں رمیش مجھے روس لے گیا۔ وہ کہتا تھا وہاں اس کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ وہ ان چند ہندوستانیوں میں سے تھا جو روس میں کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔ وہاں واقعی اس کا بہت بڑا کاروبار تھا' اتنا بڑا کہ میرا جنون چھوٹا پڑنے لگا۔ وہ لڑکیوں کو برہنہ کرکے اپنے ہوٹل میں نچواتا تھا اور کماتا تھا۔ یہ بات جب مجھے پتا چلی تب تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ میں پوری طرح اس کے قابو میں آچکی تھی۔ روس میں دو چیزوں کی بہتات ہے۔ ایک عورت دوسرا عورت کا حسن۔

خوب صورتی اتنی کہ پریشان کردے اور سستی اتنی کہ پشیمان کردے۔ روس میں جتنی ارزاں میں نے عورت دیکھی' اتنا ارزاں تو ٹشو پیپر بھی نہیں ہوتا' جسے استعمال کرکے انسان سوچے سمجھے بنا پھینک دیتا ہے۔ روس میں عورت اس سے بھی گئی گزری تھی اور پھر میں تو ایک بھوری قیدی عورت تھی جو اپنے بھگت کی قید میں تھی۔ اس نے مجھے اپنے ہوٹل میں برہنہ رقص پر مجبور کرنا شروع کردیا۔ عورت کی اس سے بڑی تذلیل کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس کے بدن کو اس کی مرضی کے بغیر استعمال کرنے کے لیے مجبور کیا جانے لگے۔ میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تو وہ مجھ پر تشدد کرنے لگا اور تب بھی بات نہ بنی تو مجھے برہنہ باتھ روم میں بند کردیا جانے لگا۔ روس میں اتنی سردی پڑتی ہے کہ لباس کے ساتھ بھی انسان ٹھٹھرتا رہتا ہے اور وہ میرے جسم پہ لباس بھی نہ رہنے دیتے تھے اور پھر مجھے ان کی رضا کے آگے سر جھکانا پڑا۔ میں رقص کو اپنا جنون سمجھتی تھی' پھر میرے رقص نے مجھے اپنا جنون بنالیا اور جنون انسان کو تھکا دیتا ہے۔ میں تھکنے لگی اور پھر میں نے دعائیں مانگنا شروع کیں کہ اے دنیا کے بنانے والے! تو پتھر کا نہیں ہوسکتا کیونکہ تو اگر پتھر کا ہوتا تو میرے گھر کے کونے کونے میں تو تھا اور میری ماں ایک عرصے سے میری خاطر تجھے پکار رہی ہے' تو اگر پتھر کا ہوتا تو میری ماں کی دعا سن کر مجھے بھٹکنے سے بچا چکا ہوتا اس لیے تو پتھر کا نہیں ہے اور اگر پتھر کا نہیں ہے تو میری عرض سن لے! ایک عورت کو اس تذلیل سے بچالے اور تب ایک روز میری پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں اب رقص نہیں کرسکتی تھی۔ رمیش نے مجھے کچرے کی طرح اپنی زندگی سے باہر پھینک دیا اور پہلی بار مجھے پتا چلا کہ انسان کچرا بن کر بھی خوش ہوسکتا ہے۔ میں اب کچرا ہی ہوں اور مجھے انسان کی حقیقت سمجھ میں آگئی ہے۔"

وہ رکی تھی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا اور اس کے ہونٹوں پر آسودگی والی مسکراہٹ تھی۔

"انسان کی فطرت میں سربسجودگی ہے۔ وہ

کائنات کی قوتوں کے آگے جھک کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ سکون اسے آگ کی طرح بھڑکا کر جھاگ کی طرح بٹھاتا ہے اور خاک بنا دیتا ہے اور خاک آپ کو آپ کی اوقات بھولنے نہیں دیتی۔ وہ آپ کو مٹی پر کھڑے رہنے کا حوصلہ دیتی ہے لیکن وہ آگ جو آپ کو خاک نہ بنا سکے' وہ آپ کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے اور پھر وہ مقام آجاتا ہے' جب انسان اپنے جنون کا غلام بن جاتا ہے اور جو اپنے جنون کے آگے جھکتا ہے تو پھر وہ بہک جاتا ہے۔ بھٹک جاتا ہے اور بھٹکا ہوا انسان کائنات کے تسلسل کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔" اس نے بات ختم کی تھی اور میں جیسے ہل کر رہ گیا تھا۔

"کائنات کا تسلسل؟" میں نے دوہرایا تھا۔ کیا میں پہلے بھی اس کے بارے میں کچھ سن چکا تھا' میں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یاد نہیں آیا تھا۔



"مجھ سے شادی کرو گی؟" ہماری تیسری مڈبھیڑ کے تقریباً" ڈیڑھ سال بعد کی بات ہے کہ میں نے بالآخر ٹیا کو پروپوز کر دیا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا تھا لیکن یہ فیصلہ میں نے کیوں کیا تھا۔ یہ میں خود بھی سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں نے تیسری بار اس سے راہ و رسم اس لیے بڑھائی تھی کہ میں اسے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ میں اس پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے دھتکار کر اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کی تھی۔ میں اس کو جتانا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی مجھے چھوڑ دینے کی وجہ سے اتنی قابل ترس ہوئی تھی۔ وہ واقعی کسی حد تک قابل ترس ہو چکی تھی۔ اس کا حلیہ' چال ڈھال سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس کی چال ایک پرانے فریکچر کی وجہ سے غیر متوازن تھی۔ میرے پاس ایک سے بڑھ کر ایک بہانہ تھا' جو اس پر میری شخصیت اور میری کامیابیوں کا رعب ڈال کر اسے میرے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں جتنا اس سے راہ و رسم بڑھاتا چلا گیا' اتنا ہی اس سے مرعوب ہوتا چلا گیا۔ وہ ظاہری طور پر بے شک قابل رشک نہیں رہی تھی لیکن اتنا مالا مال باطن بھی اپنے اردگرد رہنے والی کسی اور عورت میں نہیں نظر آیا تھا مجھے۔ اس نے میرے پراجیکٹ میں میری مدد کی تھی اور اس دوران میں ہفتے میں دو تین بار اس سے ملتا تھا۔ وہ ایک لاپروا لاابالی لڑکی سے ایک ذمہ دار احساس کرنے والی عورت کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا شادی کا فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا۔ یہ قدرت کا فیصلہ تھا۔ ہم خود بخود ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگنے لگا۔ میں چالیس سال کا تو ہو چکا تھا' کامیاب تھا اور کسی مستقل ساتھی کی ہمراہی کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور مجھے ٹیا مل گئی تھی۔

"نہیں۔" اس نے میری توقع کے برخلاف لمحے بھر میں انکار کر دیا۔ میری انا پر کاری ضرب تو لگی مگر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ یہ پہلی دفعہ تو ہوا نہیں تھا۔ میرا دل توڑنے میں ٹیا ڈگری ہولڈر تھی۔ ہم دونوں ایک کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔

"اتنی جلدی انکار مت کرو..... کچھ دن بعد سوچ کر جواب دے دینا۔"

میں نے کافی کے مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے اپنی دلی کیفیت چھپا کر کہا تھا۔ اس نے مگ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تم میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ تم سے شادی کے بارے میں سوچا جائے۔" اس نے گھونٹ بھرا اور اطمینان سے اگلا سوال داغا۔ میں نے انگلی پر لگ جانے والی کافی کو زبان سے صاف کیا اور کرسی پر ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"میں محبت کرتا ہوں تم سے۔" میں نے زور دے کر کہا تھا۔ اس نے گردن ہلائی تھی۔

"کیا شادی کے لیے یہ ایک وجہ کافی ہوتی ہے؟" اس نے پھر کپ تھام لیا تھا۔

"میں اگر کالج میں پڑھنے والا بیس سال کا نوجوان ہوتا تو اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیتا مگر میں بیس سال سے چند سال آگے نکل گیا ہوں۔" میں نے

اطمینان سے کہا تھا۔ اگر یہ معاملہ بحث کے ذریعے ہی حل ہونا تھا تو پھر میری کامیابی یقینی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی اور غائب ہوگئی۔

"مجھے محبت سے نفرت ہے بل! یہ انسانیت کا استحصال کرنے کا مہذب طریقہ ہے۔ مجھے محبت کی رنگین تتلی کے پروں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے یہ خرافہ لگتی ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"ٹیا! میں محبت کا دعویٰ نہیں کرتا' لیکن تمہیں بحیثیت عورت مجھ سے جو بھی چاہیے ہوگا' میں تمہیں وہ ضرور فراہم کروں گا۔ پھر وہ محبت ہو' دولت یا عزت۔" میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے عورت کو کیا چاہیے ہوتا ہے مرد سے؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"محبت.... میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ ہر عورت محبت ہی کا مطالبہ کرتی ہے۔" میں نے ہونٹ بھینچے تھے۔

"محبت نہیں' اکملیت.... عورت اکملیت چاہتی ہے اور محبت اکملیت نہ دے سکے تو پھر وہ محبت نہیں ہوتی۔" وہ سابقہ انداز میں بولی تھی۔

"اکملیت کیا ہے۔" میں اس کی بات پر حیران ہو گیا تھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا.... میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔" وہ بے بس نظر آئی۔

"آؤ پھر اس کو مل کر تلاش کرلیتے ہیں۔" میں نے کہا تھا۔ ٹیا پرسوچ انداز میں میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

2002ء میں ٹیا اور میں نے باقاعدہ شادی کرلی۔ اس شادی کے لیے ہم دو سال سے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ دو سال میں ہم ایک دوسرے کو مزید اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور اپنے آپ کو اس رشتے کو ذمہ داری سے نبھانے کے لیے متفقہ طور پر تیار تھے۔ ٹیا کے ساتھ میرا تعلق دنیا کا عجیب ترین تعلق تھا۔ میں اس کے لیے اپنے دل میں کون سا جذبہ محسوس کرتا تھا' یہ بات مجھے کبھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آسکی تھی لیکن یہ بات طے تھی کہ اس سے دوبارہ مل لینے کے بعد ہمیشہ میرا دل اس کے دور جانے کے خیال سے ڈر جاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہماری شادی کی تقریب بے حد سادہ تھی جس میں بہت خاص اور قریبی لوگوں کے علاوہ کوئی مدعو نہیں تھا۔ ٹیا ہال میں سامنے کھڑی ویڈنگ اسپیچ کر رہی تھی۔ اس نے سرخ اور سفید امتزاج کا لباس پہن رکھا تھا اور میرا دل اس کو اپنی نصف بہتر کے روپ میں دیکھ کر بہت خوش اور مطمئن تھا۔

"بل گرانٹ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ لگتا تھا کہ زندگی میں اگر کبھی میں نے شادی کی تو ایسے ہی شخص سے کروں گی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اس سے محبت تھی بلکہ اس لیے کہ یہ میرے سامنے ہمیشہ چپ کر جاتا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہ اچھا شوہر بن سکتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں نے اپنا گلاس تھوڑا سا اونچا کر کے اپنے احباب کی مسکراہٹوں کا جواب دیا۔

"ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے محبت کا دعوا نہیں کیا۔ میں سوچتی ہوں کہ زندگی میں ایک ساتھ رہنے کے لیے محبت اتنی بھی اہم نہیں ہوتی۔ اگر آپ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کی خامیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرسکتے ہیں تو آپ اچھے **ہمسفر** بن سکتے ہیں۔ بل نے میرے لیے **رچمنڈ** میں ایک خوب صورت گھر خریدا ہے۔ یہ عام بات نہیں ہوتی۔ مشرق کی عورت کے لیے گھر بہت بڑی بات ہوتی ہے' اور میرے لیے بھی یہ بات بہت معنی رکھتی ہے کہ جب مرد کسی عورت کے لیے گھر بناتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو عزت دے رہا ہے۔ وہ اسے اس کی زمین فراہم کر رہا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جو مرد عورت کو زمین دے سکتا ہے' وہ آسمان پر بھی اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھے گا اور دنیا اور آخرت میں ہمیشہ اس کا ہو کر رہے گا۔ میرے لیے وفاداری

بہت اہمیت رکھتی ہے اور میں سمجھتی ہوں میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ وفا نبھانے والا شخص نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ زمین پر جتنا میرا ہے آسمان پر بھی اتنا ہی میرا ہو گا۔ میں بل گرانٹ کی ممنون ہوں کہ اس نے مجھے اپنی نصف بہتر کے طور پر چنا۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہال میں بیٹھے لوگوں نے تالیاں بجائی تھیں۔ میں نے اپنی انگلیاں چوم کر اس کی جانب اچھالی تھیں۔ مجھے وہ پہلے سے زیادہ اچھی لگی۔ میرا سینہ فخر کے احساس سے بھر گیا تھا۔ مجھے لگا آج ثابت ہو گیا ہے کہ میں غدار نہیں تھا۔



"تم شہروز منور ہو؟" رضوان اکرم نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔ شہروز نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آؤ آؤ.... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ بہت کام کے نوجوان ہو تم!" انہوں نے اسے خوش گوار انداز میں اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ شہروز گویا ہوا کے رتھ پر سوار ہو کر ان کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ ایک مسرور کر دینے والی کیفیت نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ یہ اس کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ ان کو اس کا نام یاد تھا اور وہ اسے سراہ بھی رہے تھے۔ اسے چینل جوائن کیے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے اور اس کے کریڈٹ پہ چند ایک چھوٹے موٹے آرٹیکل اور ایک پروگرام کی معاونت کے علاوہ اور تھا ہی کیا۔ وہ تو ابھی چلنا سیکھ رہا تھا اور برق رفتاری سے اڑنے والوں نے نہ صرف اسے دیکھا تھا بلکہ پیار سے دیکھا تھا۔

"کافی لو گے؟" انہوں نے اسے درمیانی میز کی طرف آتے دیکھ کر پوچھا۔ ان کا اپنا دھیان سامنے پڑی فائلوں میں گم تھا۔ ان کی آنکھوں کا اشارہ بھانپ کر شہروز ان کی طرف جانے کے بجائے ایک جانب پڑے کاؤچ کی سمت آگیا۔ وہاں چھوٹی سی تپائی پر کافی کے لوازمات موجود تھے۔

"میرے لیے وو آؤٹ شوگر۔" وہ جب اپنی نشست سنبھال چکا تو وہ اس کی جانب لمحہ بھر کے لیے دیکھ کر بولے اور اپنے سامنے پڑے صفحات پلٹتے ہوئے پھر بولے۔

"تم تو دو چمچ سے کم پر راضی ہونے والے نہیں ہو۔" شہروز نے ان کی جانب حیرت سے دیکھا پھر مسکرایا۔ یہ بات تو سچ تھی۔ وہ چینی کے بغیر کافی پینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور اس کی اس عادت کا سارے آفس کو پتا تھا۔ رضوان صاحب کسی قدر عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں دو چمچ شوگر لیتا ہوں" اس نے مگ میں کافی انڈیلتے ہوئے پوچھا۔ رضوان اکرم مسکرائے۔ شہروز نے بھی ہونٹوں کے زاویے کو مستقل مسکراہٹ پہ سیٹ کر لیا تھا۔ باس کا مزاج خوشگوار تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ شہروز نے اتنا ہلکا پھلکا خود کو پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے مستقل گدگدی ہو رہی تھی۔

"اتنی کڑوی کافی کوئی شوگر کے بغیر پی کیسے سکتا ہے .... کوئی احمق ہی ہو گا" انہوں نے بالآخر فائلز بند کر دیں اور اس کے ساتھ کاؤچ پر آبیٹھے۔

"مجھے ایسے مت دیکھو میں احمق نہیں ہوں صحافی ہوں۔ صحافت میں آنے سے پہلے میں بھی کڑوی کافی نہیں پی سکتا تھا۔ یہ تو اس ظالم جادوگرنی جیسی نوکری نے مجھے مٹھاس سے دور کر دیا ہے۔" انہوں نے ایک بازو کاؤچ کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔ شہروز مسکرایا۔ اسے لگتا تھا بس آج وہ یہی کرنے اس کمرے میں آیا ہے۔ اس نے ان کے آگے مگ رکھا۔ کافی کے مگ سے بھاپ ان کے چہرے کی جانب اڑنے لگی۔

"اسموکنگ کرتے ہو؟" اب وہ سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکال رہے تھے۔ شہروز نے نفی میں سر ہلایا۔

"نو سر!" وہ اپنے مگ میں کافی انڈیل رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے چینی دان اٹھانا چاہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی میز پر چینی موجود نہیں تھی۔ رضوان اکرم نے سر ہلایا اور سگریٹ سلگالی پھر دھواں سامنے کی جانب

اچھال کر مزید بولے۔

"شادی کب کرو گے؟" اب کی بار اسے خفیف سا جھٹکا لگا۔ یہ وہ موضوع تھا' جس سے وہ چھپتا پھرتا تھا۔ امی' بھابھی' پھپھو اور زارا کے بعد اب ڈیڈی نے بھی اسے کہہ دیا تھا کہ اس سال کے آخر میں وہ اپنی اس "ذمہ داری" سے فراغت چاہتے ہیں۔ زارا کے پاپا کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ نے سب کو اس موضوع پر متحد کر دیا تھا اور اب باس بھی یہ بات کر رہے تھے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے سر! کہ میری شادی ہو چکی ہو۔" اس نے اپنی کیفیت چھپائی تھی۔

"میں پُریقین ہوں کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی۔"

"آپ کو کیسے پتا میری شادی نہیں ہوئی؟" اس نے کافی کا مگ ہاتھ میں تھام لیا۔ چینی کے بغیر کافی پینے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔

"سادہ سی بات ہے... سگریٹ نہیں پیتے ہو۔ اس کا مطلب تمہاری زندگی میں بیوی نام کی ٹینشن نہیں ہے۔ آدمی بلاوجہ کنویں میں چھلانگ تھوڑی لگاتا ہے۔ ہر بے وقوفی کے پیچھے ایک زیادہ بڑی بے وقوفی ہوتی ہے۔" انہوں نے سگریٹ اسے دکھاتے ہوئے ایک اور کش لگایا اور دھوئیں کے مرغولے پھر شہروز کے آس پاس ناچنے لگے تھے۔

"کیا سوچا ہے زندگی کے بارے میں... کیا کرنا چاہتے ہو۔ رینگتے ہی رہنا ہے یا اُڑنا بھی چاہتے ہو؟" وہ پہلے جس قدر عجلت میں لگتے تھے اب اتنے ہی پرسکون ہو کر بیٹھ گئے تھے جیسے کوئی کام نہ ہو۔

"سر! میں کیچوا نہیں ہوں۔ اقبال کا شاہین رینگنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔" اس نے کافی کا گھونٹ بھرا تھا اور پھر بدمزا ہو کر مگ کی جانب دیکھا تھا۔ اسے کافی زیادہ پسند نہیں تھی اور چینی کے بغیر تو بالکل نہیں' اس کے باوجود وہ اسے برداشت کرنے کو تیار تھا۔ باس کی تقلید کر کے وہ نجانے کیا ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ان کے آفس میں کافی بہت استعمال ہوتی تھی۔ وہ زبردستی اپنے آپ کو اس کا عادی بنا رہا تھا۔

"اس کا مطلب اُڑنا چاہتے ہو... اچھی بات ہے' مجھے کیڑے مکوڑے پسند بھی نہیں ہیں۔ انسان اپنے عزائم سے پہچانا جاتا ہے۔ عزائم اونچے ہوں تو انسان بلندی پر پہنچ سکتا ہے اور بلندی سے دنیا بہت دلفریب' بہت خوب صورت لگتی ہے۔ اتنی خوب صورت کہ اس کے سامنے محبوبہ کا چہرہ بھی پھیکا لگنے لگتا ہے۔"

انہوں نے سگریٹ اس کی جانب بڑھایا تھا۔ اس نے تذبذب کے عالم میں اسے تھام لیا۔

"کش لگاؤ۔ سوچ کیا رہے ہو۔ صحافی کو جھکنا چاہیے نہ جھجکنا چاہیے۔ اپنے عزائم بلند رکھو اور ان عزائم کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرو۔ ہر رکاوٹ عبور کرو اور ہر شخص کو پیچھے چھوڑ دو۔ وقت گزر جانے کے بعد پیٹنے کے لیے صرف لکیر رہ جاتی ہے اور لکیر پیٹنے والے کے ہاتھ کچھ نہیں آیا کرتا۔" انہوں نے کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا تھا اور با آسانی اسے اپنے اندر منتقل کر لیا تھا۔

شہروز نے چھوٹا سا کش لگایا اور اپنے منہ سے نکلنے والے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔ یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں تھا کہ اس نے کش لگایا تھا۔ دوستوں میں ہنسی مذاق میں ایک آدھا کش لگا ہی لیا کرتا تھا۔ اسے مشکل نہیں ہوئی تھی دھوئیں کو حلق میں اتارتے ہوئے۔ مشکل اسے ان کی بات سمجھنے میں ہوئی تھی۔ کیا وہ اسے پر عزم نہیں سمجھتے تھے' کیا انہیں اس کی محنت میں کوئی کمی دکھائی دیتی تھی۔

"میں نے تمہارا آرٹیکل پڑھا اچھا ہے۔" وہ بغور اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شہروز نے خود کو بہت ممنون محسوس کیا۔ اس کے آرٹیکلز کو پہلے دن سے سراہا جا رہا تھا اور رضوان اکرم کے منہ سے تعریف سننا عام سی بات نہیں تھی۔ ان کا تاثر ہی ایسا تھا۔ وہ سارے عالم میں مغرور اور خود سر لیکن بے باک اور نڈر مشہور تھے۔ انہیں ان کے موقف سے ہٹانا ناممکن تھا۔ وہ شہروز کو سراہ رہے تھے تو یہ چھوٹی بات نہیں تھی۔ وہ چھوٹے موٹے ورکرز سے تو رک کر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ مسکرا کر بات کرنا ان کے لیے ممنوع

تھا۔ شہروز اگر آج ان کے آفس میں نہ آیا ہوتا تو شاید اس کے لیے رضوان اکرم ایک مغرور باس ہی رہتے۔ اس کی گردن اکڑنے لگی تھی۔ اسے ستائش تو مل ہی رہی تھی' بہت سے لوگ سراہ رہے تھے مگر باس کا سراہنا کسی انرجی ڈرنک سے کم نہیں تھا۔ اس کے حواس معطر اور بشاش ہو رہے تھے۔

"تم میں بہت اسپارک ہے۔ تم بہت آگے جاؤ گے' تم میں اچھے صحافیوں والی ساری خصوصیات ہیں۔"

وہ مزید کہہ رہے تھے۔ شہروز نے سر ہلایا۔ اس کی مسکراہٹ کوشش کے باوجود نہیں چھپ رہی تھی۔ یہ اس کی استطاعت سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اتنی تعریف سنبھالنے کی گنجائش نہیں تھی اس میں۔

"اچھا صحافی پتا ہے کیسا ہوتا ہے؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"اچھا صحافی خوبانی کی طرح ہوتا ہے۔ باہر سے دیکھو تو نرم لگتا ہے اندر سے سخت گٹھلی کی طرح اور حقیقت میں گٹھلی کے اندر چھپے میٹھے بادام جیسا لذیذ۔ اچھا صحافی سچ کا علمبردار ہوتا ہے اور سچائی تلخ ہوتی ہے۔ یہ اچھے صحافی کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ تلخی کو پی کر اس انداز سے پیش کرے کہ وہ اس کے پڑھنے والوں کے لیے قابل برداشت بن جائے۔ تلخی کو نرمی سے پیش کرنا ہی اصل گُر ہے لیکن اس کے لیے نرمی برقرار رکھنی پڑتی ہے اور صرف ایک سچا صحافی ہی اس قدر بہادر ہو سکتا ہے کہ تلخ سچائی کو پی کر بھی اندر سے میٹھے بادام کی طرح اپنی لذت کو برقرار رکھ سکے۔"

انہوں نے اپنے مگ سے آخری گھونٹ بھی تیزی سے اپنے اندر انڈیل لیا اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ شہروز نے ان کی بات سنتے ہوئے پھر سر ہلایا تھا۔

"مجھے بادام پسند ہیں اور تمہارے اندر کا میٹھا بادام مجھے نظر آ رہا ہے۔" انہوں نے اپنے ہاتھ کی انگلی میں موجود قیمتی پتھر کی انگوٹھی کو ہلایا تھا۔ شہروز نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ وہ واقعی اس تعریف پر خود کو ممنون محسوس کر رہا تھا۔

"میرے ساتھ دبئی چلو گے؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

شہروز نے اپنے اندر فخر کی ایک نئی لہر محسوس کی۔ اس نے اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ دبئی میں افغانستان کے حالات کو ڈسکس کرنے کے لیے جو کانفرنس اگلے مہینے متوقع تھی' اس میں شرکت کے لیے اس کا نام لیا جا رہا ہے۔

"جی سر۔۔۔ کیوں نہیں۔ یہ تو میرے لیے باعث اعزاز ہو گا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔



"کیسی ہو؟" اس نے فون ریسیو کیا تو شہروز کی چہکتی ہوئی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"حیران پریشان ہوں ابھی تو۔۔۔ سورج اور مشرق والا محاورہ یاد آ رہا ہے۔" زارا نے گاڑی کا دروازہ لاک کر کے اندر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ ایک ہاتھ سے فون کان سے لگائے دوسرے سے بیگ پل اوور اور اسٹیتھسکوپ پکڑے وہ واقعی حیران حیران اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ یہ ایک پوش علاقے میں بنا ایک مہنگا ترین اسپتال تھا۔ چار بج رہے تھے۔ اس لیے رش بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ ریسپشنسٹ کو ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنی آمد کی اطلاع دیتی کاریڈور کی جانب بڑھ گئی۔

"محاوروں کو یاد کرنے سے اچھا ہے تم مجھے یاد کیا کرو۔" وہ کافی خوش لگ رہا تھا۔ زارا کو اس کی آواز سے اندازہ ہوا۔ یہ شاید مہینوں بعد ہوا تھا کہ شہروز نے اسے خود کال کی تھی۔ وہ یا تو کال ریسیو کرتا تھا یا کال بیک کرتا تھا۔

"تمہیں کبھی نہیں بھولتی میں۔۔۔ تم سے میری انگیجمنٹ ہوئی ہے۔۔۔ براوقت کون بھولتا ہے۔" اس نے اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا۔

"زارا کی بچی! کتنی باتیں کرنی آ گئی ہیں تمہیں۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تم باتیں لکھ لکھ کر صفحے کالے کرتے رہو اور ہم بات بھی نہ کریں۔" اس نے اپنی سب چیزیں

میز پر رکھ دیں۔ معطر سا ماحول اور میٹھی سی آواز نے مزاج پر بڑا اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ خود کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔

"تم نے میرا نیا کالم پڑھا..... کبھی کبھی پڑھ لیا کرو یار، میں جانتا ہوں، تمہیں ان چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے لیکن میری خاطر کبھی کبھی نظر ڈال لیا کرو..... بڑے بڑے لوگ سراہ رہے ہیں مجھے۔" وہ پُرجوش ہوا تھا۔ باس کے ساتھ کانفرنس اٹینڈ کرنے کا خیال ہی بہت خوش کن تھا۔ زارا نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"میں پڑھوں گی ان شاءاللہ..... آج کل ذرا فرصت ہی نہیں ملتی اور مجھے پڑھے بغیر بھی اندازہ ہے کہ تم دنیا کے بیسٹ کالمسٹ ہو۔" وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ایسے اندازے پڑھے بغیر ہی لگائے جاتے ہیں۔ ویسے اسے اردو میں اقربا پروری کہتے ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"اسے محبت کہتے ہیں شہروز!" زارا نے طمانیت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا آ آ آ، یعنی اب تمہیں محبت کی بھی سمجھ آنے لگی ہے۔" وہ چڑا رہا تھا۔

"ابھی ہی تو آنے لگی ہے" وہ بشاشت سے مسکرائی۔ شہروز کو اس کے لہجے کی کھنک میں کچھ عجیب سے رنگ جھلکتے محسوس ہوئے۔

"واقعی..... مجھے بھی سمجھاؤ نا پھر۔" وہ بولا۔

"شہروز! محبت باعث آزار نہیں ہوتی۔ یہ خوشی ہوتی ہے، دل کا سکون ہوتی ہے۔ یہ "تم" ہوتے ہو یہ "میں" ہوتی ہے۔ یہ "ہم" ہوتی ہے۔ تم خوش ہو، مجھے کال کر رہے ہو، تمہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہو گئی ہوں اور آج میں "خوشی" تقسیم کروں گی۔ یہ محبت کی سادہ سی تعریف ہے کہ آپ جب اسے محسوس کریں تو آپ کا وجود روشنی بن جائے اور آپ کے اردگرد سب انسان اس روشنی سے روشن ہو جائیں، پھر یہ روشنی رکے نہیں بلکہ پھیلتی چلی جائے۔" وہ نرم سے لہجے میں بولی تھی۔ شہروز نے بے

حد حیرانی سے اس کی بات سنی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اسے لفظ نہیں ملے تھے۔ یہ زارا تھی۔ یہ اسی کی زارا تھی؟ وہ واقعی حیران تھا۔

"آئی لو یو۔" وہ خود کو کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔ یہ شاید دوسری دفعہ تھا کہ اس نے زارا کو یہ الفاظ کہے تھے، لیکن حقیقت میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ اس نے اتنے جذب سے یہ لفظ کہے تھے۔ اسے سب بھول گیا تھا کہ اس نے زارا کو کیا بتانے کے لیے فون کیا تھا۔

زارا کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کے ایک ایک روئیں نے کلمہ شکر ادا کیا تھا۔ اس نے شہروز کے لہجے کی صداقت کو پہلی بار نہیں پرکھا تھا۔ اسے پرکھے بغیر یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ وہ مطمئن تھی۔ اس نے ابھی خالص محبت کا پہلا سبق ہی ازبر کیا تھا اور اس کے مثبت رنگ نظر آنے لگے تھے۔



"تمہیں کھانا کس نے بنانا سکھایا تھا" عمر نے چیڈر چیز کش کرنے کے لیے ریک سے پلیٹ اٹھائی تھی۔ امائمہ کا رخ برنر کی طرف تھا۔ وہ سبزیوں کو فرائنگ پین میں ڈالے چمچ سے ادھر ادھر ہلا رہی تھی۔ اس کے ہر عضو پر سستی چھائی ہوئی تھی۔ امی کی آواز سن کر وہ اتنی افسردہ ہو گئی تھی کہ اس سے کوئی کام ہی نہیں کیا گیا تھا۔ روتے رہنے کے باعث آنکھیں بھی سوجی ہوئی لگتی تھیں۔ عمر کے واپس آنے سے کچھ دیر قبل ہی اس نے شاور لے کر فریش ہونے کی کوشش کی تھی۔ اور اب وہ کچن میں کھڑی آملیٹ بنا رہی تھی۔ عمر بھی اس کے ساتھ کچن میں ہی آ گیا تھا اور اب اس کی مدد کروا رہا تھا۔

"امی نے ہی سکھایا تھا..... مائیں ہی سکھاتی ہیں ایسے کام۔" اس نے سبز پیاز کے رنگ کو سنہرے رنگ میں تبدیل ہوتے دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔ چمچ جس مقام پر تھا وہاں سے ہل کر نہ دیا۔

"ارے نہیں..... میرے تو ڈیڈ نے سکھایا تھا مجھے، وہ بہت اچھا کھانا بنا لیتے ہیں۔ جب میں ہائی اسکول میں

تھا تو ممی ایک بوتیک پہ جاب کیا کرتی تھیں اور اکثر لیٹ ہو جایا کرتی تھیں تو ابو ہمارے لیے ڈنر تیار کیا کرتے تھے۔"

عمر اپنے کام میں منہمک بول رہا تھا۔

"میں چونکہ سب میں بڑا تھا' اس لیے ابو کی مدد کیا کرتا تھا۔ ان کو دیکھ دیکھ کر کافی کچھ خود ہی بنانا آ گیا تھا۔ ابو سینڈوچز کی فلنگ بناتے۔ میں تب تک بریڈ پر مایونیز اور کیچپ لگا لیتا۔ وہ کیک مکسر سے کیک بناتے تو میں دودھ انڈے پھینٹ کر پڈنگ بنا چکا ہوتا۔" عمر فخریہ لہجے میں بتا رہا تھا۔ وہ واقعی ایسی چیزیں بنانے میں ماہر تھا۔ امائمہ نے بے دلی سے سر ہلایا۔

"یہ تو آسان آسان کھانے ہیں عمر!" اس نے بات برائے بات کی تھی تاکہ عمر اس کی عدم توجہی پر ٹوک نہ دے۔

"ارے تو تم کیا سننا چاہتی ہو۔ میرے ابو بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد گھر آ کر بریانیاں دم دیا کرتے تھے' حلیم گھوٹا کرتے تھے۔ میں تو ان سے کہا کرتا تھا کہ کچھ مت کریں ہم کارن فلیکس کھالیں گے یا بریڈ جیم چیز وغیرہ مگر ابو پھر بھی کچھ نہ کچھ بنا دیتے تھے۔ تم سوچو ذرا! کتنی سخت ڈیوٹی ہوتی تھی۔ پھر آ کر کچن میں کھڑے ہونا آسان نہیں ہوتا۔" وہ جتا کر بولا تھا۔ امائمہ نے فرائنگ پین سے نظر ہٹائی پھر گہری ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"تم بہت محبت کرتے ہو نا اپنے ابو سے" اس نے اتنی یاسیت خود بھی شاید اپنے لہجے میں پہلی دفعہ محسوس کی تھی۔ امی کا گلوگیر لہجہ پھر یاد آ گیا تھا۔ فرائنگ پین میں موجود سبز پیاز' سبز مٹر اور سبز دھنیا سب ہلکے سنہرے سے گہرے سنہرے رنگ میں ڈھل رہے تھے۔

"یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے.... تم نہیں کرتیں اپنے ابو سے محبت؟" اس کی جانب دیکھے بنا اس نے سوال کیا تھا پھر باقی ماندہ چیز کو باکس میں رکھ کر فریج میں رکھنے کے لیے مڑا تھا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ فریج کے ساتھ ہی الیکٹرک کیٹل رکھی تھی جس کا سوئچ ساکٹ میں لگا تھا۔ اس نے سلیب کی طرف مڑنے سے پہلے اسے آن کر دیا تھا۔ سارے میں سبزیوں کے فرائی ہونے کی خوشبو پھیلنے لگی تھی۔

"کرتی ہوں.... لیکن میں تو بیٹی ہوں' بیٹیاں تو باپ سے محبت کیا ہی کرتی ہیں۔" اس کی رو بہکی ہوئی تھی۔ سبزیاں تیزی سے بھوری ہو رہی تھیں۔

"بیٹے بھی محبت کرتے ہیں یار.... تمہیں نہ جانے یہ غلط فہمی کیوں رہتی ہے کہ میں اپنے ابو سے محبت نہیں کرتا۔ تم اکثر ایسے سوالات کرتی رہتی ہو۔" وہ اس کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے چمچ پکڑ لیا تھا پھر سبزیوں کا رنگ دیکھ کر عجلت میں باؤل اٹھایا' جس میں اسی نے کچھ دیر پہلے انڈے پھینٹے تھے۔ امائمہ ایک طرف ہو گئی تھی پھر اس کی جانب سے پشت کر کے سامنے دیکھنے لگی۔

"سب بیٹے اپنے ابو سے محبت کرتے ہیں عمر؟" آنسوؤں کو گھرک کر اپنی حدود میں رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ عمر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ عمر سے اس کا بجھا ہوا انداز مخفی رہ پاتا۔

"امی.... یا اوکے.... کچھ گڑبڑ ہے کیا۔ طبیعت زیادہ خراب ہے۔" امائمہ سنبھلی تھی پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بہ عجلت بولی۔

"نہیں نہیں' ٹھیک ہوں میں۔ یونہی پوچھ لیا تھا۔" وہ کیبن سے مگ نکالنے لگی تھی۔ عمر نے فرائنگ پین سے براہ راست تھوڑا سا آملیٹ اٹھا کر منہ میں رکھا تھا پھر مطمئن ہو کر چولہا بند کرتے ہوئے بولا۔

"آف کورس یار! بیٹے بھی بہت محبت کرتے ہیں اپنے ڈیڈز سے.... دراصل تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے نا' اس لیے تم پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو۔" وہ آملیٹ کو اس پلیٹ میں ڈالنے لگا تھا جس میں چیز موجود تھا۔ امائمہ کا وجود جیسے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس سے اگلا جملہ بولا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ وہ عمر کو

نہیں کہہ سکتی تھی کہ "تمہیں نہیں پتا' میرا ایک بھائی بھی ہے اور دراصل میں نے تم سے شادی اسی بھائی کی وجہ سے کی تھی۔"

وہ یہ بات کیسے منہ سے نکال لیتی۔ وہ نہیں نکال سکتی تھی۔ عمر اور اس کی فیملی کو یہی پتا تھا کہ امامہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ عمر میں بہت سی خصوصیات تھیں لیکن یہ بھی ایک مصدقہ امر تھا کہ وہ ایک جذباتی انسان بھی تھا۔ وہ اگر اس بات کو سر پر سوار کر لیتا کہ امامہ نے اس سے یہ بات کیوں چھپا کر رکھی تھی تو وہ غصہ بھی کر سکتا تھا۔ امامہ نے اپنے آپ کو بہت مشکل صورت حال میں گھرا محسوس کیا۔ اسے پہلی بار اس سارے معاملے میں اپنے کردار سے الجھن ہوئی۔ امی نے اسے اس مشکل میں پھنسا دیا تھا۔ یہ امی ہی تھیں' جنہوں نے اسے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔



"تم کسی عمر احسان کو جانتی ہو؟" سرسوں کے تیل سے بھری ہتھیلی اس کے بالوں میں انڈیلتے ہوئے امی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔ ان کے سوال میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ وہ اکثر کلاس فیلوز کا ذکر امی سے کرتی رہتی تھی۔ وہ جن لوگوں سے ملتی جلتی تھی امی کو ان کے بارے میں پتا ہی ہوتا تھا۔ وہ نیا پن ان کے انداز میں تھا جس نے ان کے سوال کو امامہ کے لیے مشکوک بنا دیا تھا۔

"کون؟" اس نے پلٹ کر پوچھا مگر وہ امی کے چہرے کی جانب نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ اس کے مڑنے پر انہوں نے اس کی گردن کا رخ دوبارہ سامنے کی جانب کر دیا تھا۔ وہ بظاہر بہت دل جمعی سے اس کے بالوں میں تیل لگا رہی تھیں۔

"عمر' عمر احسان۔" انہوں نے دہرایا۔ امامہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ اس نام کے کسی شخص کو وہ نہیں جانتی تھی۔

"اوں ہوں۔" اس نے فقط ہنکارا بھرا۔

"تمہاری ملاقات ہو چکی ہے اس سے... شہروز کا کزن ہے... تمہارے کلاس فیلو شہروز کا کزن..."

وہ شہروز اور اس کی فیملی کے بارے میں جانتی تھیں۔ اس لیے اسی کا حوالہ دیا۔

"ملاقات...؟" اس لفظ نے امامہ کو چونکایا' لیکن اسے یاد آگیا تھا کہ امی کس کا پوچھ رہی ہیں۔

"ہاں ہاں یاد آیا۔ شہروز کا ایک کزن آج کل یونیورسٹی آتا جاتا ہے... اس کا نام عمر ہے؟" اس نے تصدیق کرنی چاہی کیونکہ وہ واقعی بھول چکی تھی کہ شہروز کے اس بدتمیز کزن کا نام کیا ہے۔

"کیسا لڑکا ہے؟" امی نے ایک اور سوال کیا تھا۔

امامہ کا منہ بن گیا۔

"پہلے کبھی آپ کو لوگوں کے بارے میں میری رائے اچھی لگی ہے۔" اس نے تنک کر پوچھا تھا۔

"تم نے کبھی کسی کو اچھا کہا بھی ہے... دنیا کے ستر فیصد لوگ تمہاری نظر سے دیکھے جائیں تو برے ہی نکلیں گے۔"

امی کا انداز بھی اس کے ہی جیسا تھا۔

"اور آپ...؟" وہ ان کی طرف پلٹنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"آپ کو تو ہر دوسرا شخص اچھا لگ جاتا ہے۔ قصور آپ کا نہیں ہے۔ آپ کی اور میری کیمسٹری کا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ امی نے دوبارہ اس کا رخ موڑا۔ اس کے لمبے بالوں میں تیل لگانے میں وہ کافی محنت صرف کرتی تھیں۔

"قصور کیمسٹری کا ہو یا فزکس کا' ایک بات تم ذہن میں بٹھا لو بی بی! اب تمہیں سیریسلی کسی نہ کسی کے بارے میں میری رائے سے متفق ہونا پڑے گا۔ تمہارے بابا اب زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔" انہوں نے اس کے بالوں میں تیزی سے انگلیاں گھماتے ہوئے بالآخر جتا دیا تھا کہ وہ یہ ساری انکوائری کیوں کر رہی ہیں۔ امامہ کچھ مشکوک سی تو تھی مگر ان کے واضح طور پر کہنے سے چونک سی گئی۔ شہروز کے کزن کا پروپوزل اس کے لیے واقعی ایک چونکا دینے والی بات تھی۔

"اس لیے آپ مجھ سے شہروز کے اس پھٹیچر کزن کا پوچھ رہی تھیں.... مطلب.... واقعی؟" وہ اچنبھے سے بولی تھی۔ اسے اس لڑکے کے تمام انداز یک دم ہی یاد آنے لگے تھے۔ وہ جب بھی اس سے ملی تھی اس کا امپریشن برا ہی پڑا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

"شکر ہے مجھے اپنے منہ سے نہیں بتانا پڑا.... کچھ سمجھ داری تو باقی ہے میری بیٹی میں۔" وہ مسکرا رہی تھیں۔ امائمہ کو ان کا لہجہ کھنکھناتا محسوس ہوا۔

اس کے بھائی کے چلے جانے کے بعد اس کے اور ان کے درمیان تعلقات بہت دوستانہ ہو گئے تھے اور اس میں تمام تر محنت خود امائمہ کی ہی تھی۔ امائمہ نے انہیں زندگی کی طرف لانے میں بڑی محنت کی تھی۔ وہ واقعی ایک پل بن گئی تھی، جو ابو اور امی کے تعلقات کو مضبوطی سے قائم رکھنے میں سب سے اہم رکن تھی۔ نور محمد کے بعد ابو امی کے تعلقات کبھی نارمل شادی شدہ جوڑے جیسے نہ رہ سکے تھے۔ امی نے بیٹے کے بعد جیسے ابو سے سارے تعلقات ختم کر لیے تھے۔ وہ ضرورت کے علاوہ کبھی ابو کو مخاطب نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے کبھی ابو کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ ان کو جیسے اپنی زندگی سے نکال چکی تھیں۔ اس صورت حال میں امائمہ ہی تھی، جس کی ضروریات، خوشیاں کامیابیاں اور کارنامے انہیں جوڑنے کا باعث تھے۔ اس لیے امائمہ کا ہر پروپوزل گھر کے سناٹے میں ہلچل تو مچاتا تھا لیکن آج امی ضرورت سے زیادہ خوش تھیں۔ حالانکہ یہ اس کا پہلا پروپوزل نہیں تھا۔ بہت زیادہ تو نہیں مگر چار، چھ مہینے بعد کوئی نہ کوئی کہلوا دیا کرتا تھا۔ اس لیے امائمہ کو ان کے رویے پر کچھ حیرت ہوئی تھی۔

"مسز منور کافی تعریف کر رہی تھیں اس بچے کی۔ بی بی اے کیا ہوا ہے۔ بارہ سو پونڈز یا شاید اٹھارہ سو پونڈز والی جاب کر رہا ہے۔ پان سگریٹ جیسی کوئی بری عادت نہیں۔ انگلینڈ کی پیدائش ہے۔ وہیں پلا بڑھا ہے مگر بہت سلجھا ہوا سمجھ دار بچہ ہے۔ مسز منور تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ گورا چٹا اونچا لمبا ہے۔ اسمارٹ ہے ہینڈسم بھی....."

وہ اس ان دیکھے شخص کا حلیہ اس طرح بیان کر رہی تھیں جیسے اسے دیکھ رکھا ہو۔ امائمہ کے چہرے کے تاثرات ان کے ہر لفظ پر بدل رہے تھے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئیں تو امائمہ کو بولنے کا موقع مل گیا۔

"آپ جو مرضی کہتی رہیں.... میں اس للو سے شادی نہیں کرنے والی۔" وہ سابقہ انداز میں تنگ کر بولی۔

"وجہ؟" امی ناگواری سے بولی تھیں۔ ساتھ ہی اس کے بالوں میں گھومتے پھرتے ہاتھوں میں سختی آئی۔

"اس کے بعد آپ وجہ کا نام اس کا بائیوڈیٹا اور اس کی فیملی کے بارے میں پوچھیں گی پھر پوچھیں گی "وجہ" سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟" امائمہ خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

"جی نہیں.... مجھے پتا ہے ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔" امی بظاہر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ان کو بیٹی سے زیادہ اپنی تربیت پہ بھروسا تھا۔ امائمہ جواباً کچھ نہیں بولی۔ امی کافی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں پھر جیسے ہار مان کر بولیں۔

"امائمہ! اس میں خفا ہونے والی کون سی بات ہے؟"

امائمہ ابھی بھی خاموش رہی۔ امی نے اس کا سر مساج مکمل کر کے اس کے بالوں کو جوڑے کی شکل دے کر چھوڑ دیا تھا۔

"میں نے یہ پروپوزل فائنل تو نہیں کر دیا جو تم نے اتنا منہ پھلا لیا ہے.... اچھا بابا! جو مرضی کرو.... میں اب تمہارے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔"

اس کے انداز دیکھ کر وہ چڑ کر بولی تھیں۔ امائمہ نے اپنا رخ ان کی جانب موڑا۔

"مجھے وہ لڑکا اچھا نہیں لگا۔" اس نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ "وہ بہت امیچور ہے لاپروا اور غیر ذمہ دار۔ اسے اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ کسی لڑکی سے کس طرح بات کرتے ہیں۔ مجھے ایسے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔ مجھے میچور لڑکے اچھے لگتے ہیں امی!"

اپنی امی کے ساتھ گزشتہ کچھ سالوں میں اس کی بہت بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ان کے سامنے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتی تھی۔ امی نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی پہ رکھا تھا پھر دوسرے ہاتھ سے اسے سہلاتے ہوئے بولیں۔

"میں تم پر اپنی مرضی مسلط کروں گی نہ ہی تمہیں مجبور کروں گی۔۔۔ بس کچھ باتیں ہیں' میں چاہتی ہوں کہ تم انہیں غور سے سن لو۔"

ان کا ناصحانہ انداز بھی ہمیشہ دوستوں والا ہوتا تھا۔ امائمہ نے ان کا چہرہ دیکھا۔ ان کے خدوخال میں یاسیت اور مایوسی کہیں چھپ کر بیٹھی رہتی تھی۔

"مسز منور بتا رہی تھیں اس لڑکے کی عمر اٹھائیس سال ہے۔ اس عمر میں اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے لڑکوں میں۔ تمہاری عمر بائیس سال ہے۔ تمہارے لیے ستائیس اٹھائیس سال کا شخص ہی بہتر رہے گا۔ جیسی میچوریٹی تم چاہتی ہو نا یہ تیس پینتیس سال سے پہلے نہیں آتی اور پینتیس سال کا شخص لڑکا نہیں مرد ہوتا ہے۔ کیا کرو گی ایک میچورڈ مرد سے شادی کرکے' اسے تمہاری چھوٹی چھوٹی باتیں حماقتیں لگیں گی۔ تمہاری پسند ناپسند کو وہ بے وقوفی قرار دے گا۔ وہ تمہارے زندگی گزارنے کے طریقے کو آلتو فالتو سا کہے گا۔ تمہیں اس کے ساتھ چلنا نہیں دوڑنا پڑے گا۔ تم تھک جاؤ گی اور بہت جلدی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ ابھی وہ تمہیں پھٹیچر اور للو لگ رہا ہے۔ کل کو تم ایک میچورڈ مرد سے شادی کر کے پھٹیچر اور للو لگنے لگو گی۔"

وہ بہت پیار سے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ امائمہ بغور ان کو سن رہی تھی' لیکن اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ وہ ان کی بات سے اتفاق نہیں کرتی مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے سب سے زیادہ بھروسا اپنی ماں کی پسند پر تھا۔

"ایک بات میں تمہیں سچ سچ بتا دینا چاہتی ہوں۔" انہوں نے بلاوجہ لمحہ بھر کا توقف کیا۔ "مسز منور کو میں کافی عرصہ سے جانتی ہوں۔ مسز تنویر (زارا کی امی) سے میرے کافی اچھے مراسم ہیں۔ تمہاری وجہ سے زارا اور شہروز سے بھی علیک سلیک رہی ہے۔ بہروز اور مہوز کو تمہارے ابو کافی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس ساری فیملی سے ہماری واقفیت ہے۔ میں اس فیملی کو کافی پسند کرتی ہوں۔ بظاہر ان میں کوئی خامی خرابی نہیں ہیں۔ اپنے فیملی اسٹیٹس کو بھی تم اچھی طرح جانتی ہو۔ خالہ تمہاری کوئی ہے نہیں' ماموں کے بیٹوں کو تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے' چاچو کے بیٹے تمہارے جوڑ کے نہیں۔ ایسی صورت حال میں تمہاری شادی خاندان سے باہر ہی ہو گی۔ اپنے ابو کو تم جانتی ہو۔ ان کا سرکل بہت وسیع ہے۔ لیکن جس سرکل میں آپ کا احترام زیادہ ہو وہاں آپ اپنے بچوں کی شادی کی بات نہیں چلا سکتے۔ جھوٹی انا آڑے آتی ہے۔ اب تم خود بتاؤ! ایسا پروپوزل جو خود گھر چل کر آئے اور بصد احترام' بہت اصرار' بہت محبت سے میری بیٹی کا ہاتھ مانگے تو میں کس منہ سے انکار کروں۔۔۔۔ ان سارے پلس پوائنٹس کے باوجود اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو میں مسز تنویر کو صبح ہی فون کر کے منع کر دوں گی۔ ان کو انکار کرنے میں مجھے زیادہ سہولت رہے گی۔ تم اچھی طرح سوچ لو' پھر مجھے بتا دینا۔ میں تمہارے ابو تک بات پہنچانے سے پہلے ہی ختم کر دوں گی۔"

امائمہ کو پتا تھا کہ وہ جیسا کہہ رہی ہیں ویسا ہی کریں گی۔ ان کی باتیں اس کے لیے کسی قدر نئی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان کافی بے تکلفی تھی۔ وہ ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتی تھیں' لیکن اتنے واضح انداز میں انہوں نے اسے کبھی نہیں سمجھایا تھا۔ وہ کچھ حیران بھی ہو گئی تھی۔ حالت اتنی خراب بھی نہیں تھی' جتنی انہوں نے بیان کی تھی۔ اس سے پہلے بھی اس نے کچھ اچھے رشتوں کو اسی طرح چوں چراں کر کے امی کے سامنے مسترد کر دیا تھا لیکن تب امی نے اصرار نہیں کیا تھا اور اب بلاواسطہ ہی سہی لیکن ان کی یک طرفہ پسندیدگی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ امائمہ سے صبر نہیں ہوا تھا۔

"امی! آپ کو یہ پروپوزل کچھ زیادہ ہی پسند نہیں آ

گیا۔" اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا تھا کیونکہ ابھی امی اس لڑکے سے ملی بھی نہیں تھیں۔ وہ شہوز اور اس کے بھائیوں کو جانتی تھیں لیکن یہ جاننا بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ ان کے کزن کے لیے اس طرح پُرجوش ہو جاتیں۔ امائمہ کو کھوج سی لگ گئی تھی۔

"مجھے زیادہ پسند نہیں آیا۔۔۔ یہ پروپوزل ہے، ہی بہت اچھا۔۔۔" انہوں نے گہری سانس بھری۔

"جس کا پروپوزل ہے اس سے آپ کبھی نہیں ملیں اسے کبھی دیکھا بھی نہیں حتیٰ کہ کبھی فون پر بھی بات نہیں کی اور بات ایسے کر رہی ہیں جیسے بچپن سے اسے جانتی ہیں۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ امی بلاوجہ اسے ٹال رہی ہیں۔ امی کا رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔

"تمہیں میری پسند پہ بھروسا نہیں ہے؟" وہ امائمہ کے انداز کا برا مان گئی تھیں۔

"بھروسا ہے امی۔۔۔ مگر میں چاہتی ہوں۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے سچ بولیں۔"

رک رک کر اس نے بات مکمل کر لی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ امی جھوٹا قرار دیے جانے پہ خفا نہ ہو جائیں گی۔ امی اس کی بات پر چپ کی چپ رہ گئی تھیں، پھر انہوں نے گہری سانس بھری تھی۔ ان کے چہرے پر عجیب سی پُراسرار چمک تھی۔

"وہ تمہیں شادی کے بعد لندن لے جائے گا امائمہ!"

اور امائمہ ان کی بات سن کر ششدر رہ گئی تھی۔



رات کسی بھوکی بلی کی طرح چوکنی ہو کر دیواریں پھلانگتی ہوئی گزر رہی تھی۔ امائمہ کی آنکھیں رونے کے باعث اور اب نیند نہ آنے کے باعث درد کرنے لگی تھیں۔ اس کے کندھے بھی جیسے اکڑ گئے تھے۔ اگرچہ وہ چھپ چھپ کر روتی رہی تھی، لیکن عمر کو اندازہ تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ اس سے اس کی بے دلی کی وجہ پوچھتا رہا تھا اور اس کو بہلاتا بھی رہا تھا لیکن تھکا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ سو چکا تھا۔ امائمہ کو دکھ اور پریشانی دونوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ مسئلہ سلجھانا اتنا آسان نہیں تھا، جتنا امی نے سمجھ لیا تھا۔

یہ رشتہ نظریہ ضرورت کے تحت ہی ہوا تھا اور یہ بات امائمہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اگرچہ ابو نے مخالفت کی تھی۔ وہ امائمہ کی شادی ملک سے باہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کو پاکستان میں کوئی بہت اچھا لڑکا مل جائے گا، جو عمر سے کہیں زیادہ اچھا ہوگا مگر امی ڈٹ گئی تھیں۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ امائمہ کی مرضی اس رشتے میں شامل ہے اور ابو خاموش ہو گئے تھے۔ نور محمد کے بعد اس نے کبھی اپنے ابو کو کسی چیز کے لیے امی کو مجبور کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ طاقت ور، توانا مگر دیمک زدہ درخت تھے اور یہ بات صرف امائمہ کو نظر آتی تھی۔ امی کو پروا نہیں تھی۔ وہ ابو کے کردار، ان کی شخصیت کو ہمیشہ اپنے بیٹے کی کسوٹی پر پرکھتی تھیں اور افسوس والی بات یہ تھی کہ ابو اس کسوٹی پر ہمیشہ فیل ہو جاتے تھے۔ وہ اس ذکر سے اتنا بچتے تھے کہ انہوں نے اپنے سرکل میں یہی کہہ رکھا تھا کہ ان کی ایک ہی بیٹی ہے۔ ان کو جاننے والے تھوڑے نہیں تھے اور ان کے بیٹے کے قصے بھی کئی لوگوں کو ازبر تھے لیکن کوئی تذکرہ نہیں کرتا تھا۔

"اس کا کسی لڑکی کے ساتھ افیئر تھا۔ اکیڈمی میں جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اس لڑکی کے بھائیوں نے اس کی درگت بنا ڈالی تھی پروفیسر صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے اس پر کافی تشدد کیا، جس پر ان کا بیٹا گھر سے بھاگ گیا۔ پولیس کے ذریعہ اسے بازیاب کروایا گیا اور پھر پروفیسر صاحب نے اسے گھر میں قید کر دیا جس کی بنا پر اس کا ذہنی توازن کھو گیا تھا۔ آج کل کسی پاگل خانے میں ہے۔"

یہ وہ بات تھی۔ جو نور محمد کے لیے پہلے محلے میں پھر ان کے پورے سرکل میں مشہور ہو گئی تھی۔ عمر کے گھر والوں سے یہ بات دانستہ چھپائی نہیں گئی تھی بس وہی حال تھا کہ کسی نے پوچھا نہیں ہم نے بتایا نہیں۔ امی ابو نے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ چونکہ یہ پرانے

جاننے والے لوگ ہیں تو ان کو سب خبر ہوگی۔ اس لیے کھلم کھلا اس موضوع پر بات نہیں ہوئی تھی۔

امائمہ کا عمر کے ساتھ رشتہ ہو جانے کے بعد بھی حالات سازگار نہ ہو سکے تھے۔ عمر کا بچکانہ رویہ دیکھتے ہوئے امائمہ کو یقین تھا کہ یہ رشتہ ختم ہو جائے گا لیکن امی نجانے کون سے وظیفے کرتی رہتی تھیں کہ حالات جب بھی بگڑے، ان کا انجام سنگین نہیں نکلا۔ ان کا نکاح بھی "آناً فاناً" ہوا تھا اور نکاح کے بعد امی نے امائمہ کو خود ہی سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ عمر کے سامنے نور محمد کی کوئی بات نہیں کرے گی۔

"نئی نئی رشتے داری میں بڑی پردہ داری ہوتی ہے۔" وہ اسے سمجھاتی تھیں۔ "پہلے تم عمر کے دل میں جگہ بنالو پھر یہ معاملہ حل کرلیں گے۔"

اب جگہ تو بن گئی تھی لیکن یہ بات کرتے ہوئے امائمہ کو ڈر لگتا تھا۔ عمر کو اگر یہ غلط فہمی ہو جاتی کہ امائمہ نے اس رشتے کی ابتدا میں ہی صرف اپنی ضرورت کو مد نظر رکھا تھا تو وہ خفا ہو سکتا تھا اور امائمہ کو اس شخص سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ وہ اس کو ناراض نہیں کر سکتی تھی، پھر سسرال کا معاملہ بھی تھا۔ اس کے ساس سسر اس کی ہی نہیں اس کے والدین کی بھی بے حد عزت کرتے تھے۔ اس کے سسر اس کے ابو کا ذکر اتنے اچھے لفظوں میں کرتے تھے۔ اس کی ساس امائمہ کی تعریف کرتی تھیں تو اس کے ابو کی تربیت پر فخر کرتی تھیں۔ وہ کیسے اپنے اس بھائی کا ذکر کر دیتی، جو کچھ نہ کر کے بھی معتوب ٹھہرایا گیا تھا اور دوسری جانب امی کو کیسے سمجھاتی کہ ایسے حالات میں اور پھر اتنے بڑے انگلینڈ میں بھائی کو ڈھونڈنا آسان نہیں رہا تھا۔ وہ بھائی جو ماموں کے گھر سے بھاگ گیا تھا اور اس بات کو وجہ بنا کر ماموں کی فیملی ان سے تعلقات ختم کر چکی تھی۔

ایک مسئلہ تو نہیں تھا کہ وہ حل کر لیتی۔ اس ذکر سے بے شمار سوالات تھے، جو خود بخود اٹھ کھڑے ہو سکتے تھے۔ وہ بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ بلی کے ڈر سے کبوتر بنے رہنے کا وقت گزر چکا تھا لیکن شیرنی بننے کی ہمت بھی نہیں تھی اس میں اور امی چاہتی تھیں وہ شیرنی بن کر دکھائے۔



"یار! کتنی بوریت پھیلا رہی ہو تم!" عمر نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تھی۔ امائمہ چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ کافی دیر سے اسے نظرانداز کیے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنے میں مگن تھی۔ عمر کی آنکھوں میں مصنوعی ناراضی، لیکن آنکھوں میں بہت نرم سا تاثر تھا جس کی بنا پر اسے سنبھلنے میں کافی آسانی ہوئی۔

"مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے تم!" بدقت مسکراتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔ عمر کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

"ہائیں! اس کا مطلب تم نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں۔" اس نے منہ پھلایا تھا۔ امائمہ نے مسکراہٹ کا نقاب مزید پھیلایا تھا۔

"تم باتیں بھی تو کتنی بورنگ کر رہے تھے۔" وہ جتا کر بولی تھی حالانکہ اس نے واقعی نہیں سنا تھا عمر کس کے متعلق بات کر رہا تھا۔ وہ ابھی بھی بات اس سے کر رہی تھی لیکن دیکھ کن اکھیوں سے سامنے کی جانب رہی تھی۔

"میری باتیں اس بورنگ شکل سے تو زیادہ اچھی ہیں جسے تم اتنی دیر سے گھور رہی ہو۔" عمر کے منہ سے نکلے لفظوں نے امائمہ کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ عمر اتنے دھیان سے اس کا جائزہ لیتا رہا ہے کہ اس کی نگاہوں سے اس کا سامنے بیٹھے شخص کو محویت سے تکنا مخفی نہیں رہا تھا۔ اسے دل میں بے پناہ شرمندگی محسوس ہوئی۔

"کیا وہ بہت ہینڈسم ہے ۔۔۔ ذرا مجھے دوبارہ دیکھنے دو۔" وہ اب رخ موڑ کر پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شرارت کا عنصر اس کے ہر عضو سے چھلک رہا تھا۔

"نہیں یار! اتنا خاص نہیں ہے بیڈ چوائس۔" وہ ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا تھا۔ امائمہ اب کی بار بھی بمشکل مسکرائی لیکن وہ

مطمئن ضرور ہوئی تھی کیونکہ عمر کا انداز کھوجتا ہوا نہیں تھا بلکہ وہ اسے چڑا رہا تھا۔

"میں معافی چاہتی ہوں اگر تمہیں میری پسند اچھی نہیں لگی ۔۔۔ لیکن میں تمہیں اپ ڈیٹ ضرور کرنا چاہوں گی کہ میں اسے اس کی وجاہت کی بنا پر نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ مجھے پاکستانی لگ رہا تھا۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ تم نے مان لیا کہ تم اسے دیکھ رہی تھیں اور میں بھی تمہیں اپ ڈیٹ کردوں کہ پاکستانی نہیں ہے وہ۔" عمر نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اس شخص کی جانب دیکھا۔ وہ تیس بتیس سال کا عام سا شخص تھا۔ جس کی ساری توجہ اپنے سامنے رکھے ڈونٹس اور کافی پر مرکوز تھی۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی کہ اس کے ساتھ والی میز پر بیٹھا جوڑا نہ صرف اسے تکنے میں مگن ہے بلکہ اس کے متعلق گفتگو بھی کر رہا ہے۔ ان کے اردگرد کافی رش تھا۔ ویک اینڈ تھا اور وہ دونوں بھی کافی پینے آئے تھے۔

"اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو تم" امائمہ نے اس کے انداز پر حیرانی کا اظہار کیا۔

"اس کی پی کیپ اور ٹی شرٹ دیکھو۔ دونوں پر وینزویلا کا جھنڈا بنا ہے۔ اس کا رنگ دیکھو۔ ایسا رنگ روپ لاطینی امریکیوں کا ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس کا ایٹی ٹیوڈ دیکھو۔ اتنی دیر سے ایک خوب صورت لڑکی اسے دیکھ رہی ہے لیکن اسے ذرا پرواہ نہیں ہے' کب سے کھانے میں مگن ہے۔ کوئی پاکستانی اتنا بدذوق نہیں ہو سکتا۔" عمر گاہے بگاہے اس شخص کی جانب دیکھتے ہوئے گویا اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ امائمہ نے برا سا منہ بنایا۔

"بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہو تم۔۔۔ غلطی ہو گئی مجھ سے جو اس کی جانب دیکھ لیا۔ ایویں شک ہوا تھا کہ شاید میرا ہم وطن ہے۔" اس نے وضاحت دیتے ہوئے ناگواری کا اظہار کیا۔

"میں بھی تو تمہارا ہم وطن ہوں' ہم وطن ہی نہیں ہم سفر بھی ہوں۔ میری طرف تو اتنے پیار سے کبھی نہیں دیکھا تم نے۔" وہ ابھی بھی چڑانے سے باز نہیں آیا تھا۔

"اوہو عمر۔۔۔ میں اسے پیار سے نہیں دیکھ رہی تھی۔ تم بھی نا۔" وہ زچ ہوئی تھی۔ الفاظ بھی منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ عمر نے اس کے انداز پر قہقہہ لگایا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔۔۔ منہ کے ایسے اینگلز بناتی ہوئی۔ تمہیں دیکھ کر مجھے زارا یاد آگئی۔ وہ بھی میری باتوں پر ایسے ہی چڑ جایا کرتی تھی۔" وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ امائمہ نے اطمینان بھرا سانس لیا' موضوع گفتگو تبدیل ہونے جا رہا تھا۔

"ہاں! وہ اکثر ذکر کرتی رہتی ہے تمہاری اور شہروز کی بدتمیزیوں کا۔" امائمہ نے کرسی کی پشت سے کمر ٹکائی تھی۔

اس کا دل بے حد اکتایا ہوا تھا۔ اسے ہر وقت عجیب بے زاری اور بے سکونی محسوس ہوتی رہتی تھی اور اسے چھپانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی تھی۔ وہ ایک مصروف شاہراہ پر واقع ایک کافی شاپ کے اوپن ایر حصے میں بیٹھے تھے اور کافی بھی پی چکے تھے لیکن کیفے ٹیریا سے اٹھنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شام کا رنگ دمکتا ہوا نیلا تھا۔ امائمہ یہاں پہلے بھی آچکی تھی۔ لیکن آج اس کی نظریں ہر چیز کو کھوجنے میں لگی تھیں۔ گزشتہ کچھ دنوں سے وہ شامیں باہر گزار رہے تھے۔ عمر آفس سے تھکا ہوا واپس آتا تھا لیکن اس کی فرمائش پر اسے باہر لے جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔

"بدتمیزی۔۔۔ خیر بدتمیزی تو کبھی نہیں کی میں نے شہروز کرتا ہوگا۔ میں تو شرارت کرتا تھا کیونکہ مجھے اسے چڑانے میں مزا آتا تھا اور وہ ہے بھی تو اتنی ڈفر کہ ہر بار میری شرارت کا نشانہ بن جاتی تھی لیکن میں اسے مس بہت کرتا ہوں۔ اسے بھی اور شہروز کو بھی۔ اب پاکستان جائیں گے تو بہت مزا آئے گا کیونکہ تم بھی ساتھ ہو گی۔" وہ اس کے چہرے کی جانب بغور دیکھ رہا تھا۔ امائمہ مبہم سا مسکرائی۔ اس کا دھیان عمر کی جانب ابھی بھی کم ہی تھا اور یہ باتیں تو عمر اکثر کرتا رہتا تھا۔ امائمہ کو نکاح کے بعد فوراً" ہی عمر کی زندگی میں شہروز

اور زارا کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ تینوں اچھے دوست تھے اور امائمہ کو بھی ان کی دوستی اچھی لگتی تھی۔ وہ دونوں یاد آئے تو امی کی یاد بھی آ گئی اور ذہن کے نقشے پر انہی کا چہرہ جم کر رہ گیا۔

"میں بچت کر رہا ہوں۔ سنا ہے ان کی شادی جلد ہونے والی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ تحفتاً" ان کو یہاں کا وزٹ کروائیں گے۔ اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ چلیں گے۔ ان کو ویزہ ایشوز نہ ہوئے تو اٹلی فرانس بھی جایا جا سکتا ہے۔ بہت مزا آنے والا ہے امی!" وہ بلاوجہ ہی ابھی سے خوش ہو رہا تھا۔

"تم کافی پسند کرتے ہو شہروز کو۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے تھکی ہوئی مصروف ماں بچے سے اس کے اسکول کے پُرجوش قصے سنتی ہے۔

"پسند چھوٹا لفظ ہے۔ مجھے محبت ہے اس بندے سے۔ اس کے میرے درمیان ایسا تعلق ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ میں نے اس سے اور اس نے مجھ سے آج تک کوئی بات نہیں چھپائی۔ ہم جتنا مرضی لڑیں' ایک دوسرے سے خفا رہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔" امائمہ پھر مسکرائی تھی۔ وہ جانتی تھی عمر اور شہروز کے روابط بہت ٹھوس تھے۔

"ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ چار پانچ سال پہلے کا ذکر ہے کہ میرے ابو چاہتے تھے کہ وہ کسی برٹش دیسی کو داماد کے طور پر چنیں تو انہوں نے شہروز کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ میں نے تو گھر میں واویلا مچا دیا جبکہ ابو حیران تھے کہ میں اپنے بیسٹ فرینڈ کی اتنی مخالفت کیوں کر رہا ہوں حالانکہ میں اس کی حمایت کر رہا تھا' کیوں کہ میں جانتا تھا وہ زارا کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گا۔ وہ بچپن سے اس اسٹوپڈ کو پسند کرتا تھا۔ اگرچہ دونوں کے جھگڑے بھی ہوتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔ دراصل زارا بڑی معصوم سی' بھولی سی واقع ہوئی تھی۔ ہر گیم میں ہار جایا کرتی تھی تو سب کزنز خوب تنگ کیا کرتے تھے۔ تب یہی شہروز صاحب رومال لے کر اس کے آنسو صاف کرتے نظر آتے۔ کبھی آنسو پونچھتے کبھی اس کے بال ٹھیک کرتے۔ اس کا دل بہلاتے رہتے۔ میں تب سے جانتا تھا کہ یہ معاملہ ٹلنے والا نہیں ہے اور وہی ہوا۔ ابو نے گھر میں صبا اور شہروز کے رشتے کی بات کی' میں نے فوراً" پاکستان فون کر کے شہروز کو خبردار کر دیا کہ یہاں یہ کھچڑی پک رہی ہے۔ اس نے اتنا واویلا مچایا کہ پھپھو اور تایا ابو کو ان کی باقاعدہ نسبت طے کرنی پڑی' کیونکہ بچپن سے ہی سب کو یہ آئیڈیا تو تھا۔ یہ دونوں پسندیدگی رکھتے ہیں' سو اس سے پہلے کہ ابو تایا ابو یا پھپھو سے کوئی مشورہ کرتے' انہوں نے خود ہمیں فون کر کے اس رشتے کی خبر دی۔ ابو کیا کر سکتے تھے۔ ان کے لیے صبا اور زارا ایک برابر تھیں۔ اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ خوشی صبا کو ہوئی کیونکہ وہ خاور (خالہ زاد) کو پسند کرتی تھی۔ مجھے اپنی بہن کے دل کی بھی خبر تھی' سو سارا معاملہ عمر دی گریٹ کی وجہ سے حل ہو گیا۔"

وہ خود کو سراہ رہا تھا۔ اس معاملے میں وہ بہت فراخ دل تھا۔ امائمہ نے بھی مسکراتے ہوئے سر ہلایا مگر اس کا دھیان ابھی بھی اپنے بابل کے آنگن میں کہیں کسی دکھی داستان کے اوراق میں دبی سسکیاں سن بھی رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا۔

"یہ کون سا ایریا ہے عمر!" اس نے اتنی دلچسپ باتوں کے دوران اتنا غیر دلچسپ اور غیر متعلقہ سوال پوچھ لیا تھا کہ عمر حیران ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"گرین اسٹریٹ..... کیوں' خیریت؟" اس نے اپنی ناگواری اور حیرت چھپا کر جواب دیا تھا۔ اسے برا لگ رہا تھا کہ امائمہ اس کی باتوں سے زیادہ اردگرد کے لوگوں اور چیزوں میں دلچسپی لے رہی تھی اور یہ بات وہ گزشتہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ذات میں مبہم سی تبدیلیاں آ رہی تھیں اور وہ چڑچڑی ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ مشکوک بھی ہوتی جاتی تھی۔

"یہاں سب شاپس پاکستانیوں کی ہیں؟" اس نے اونٹ کی طرح گردن اٹھا کر دیکھا تھا۔

"نہیں' انڈینز اور بنگالیوں کی بھی ہیں۔ سری لنکنز بھی کافی ہیں۔" عمر کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"پاکستانی شاپس کون سی ہیں۔" امامہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تمہیں کچھ خریدنا ہے امامہ؟" عمر نے اکتا کر کہا تھا۔

"نہیں... مجھے تو میرا مطلب ہے۔" وہ جس طرح اچانک اٹھی تھی اسی طرح بات ادھوری چھوڑ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی بالکل جھاگ کی طرح۔

"کیا پرابلم ہے یار! تم کچھ دنوں سے عجیب سی نہیں ہوتی جارہیں۔" اب کی بار وہ اپنی ناگواری چھپا نہیں پایا تھا۔ امامہ نے منہ اٹھا کر اس کی شکل دیکھی پھر پلکیں جھپکی تھیں۔ آنسوؤں کو چھپانے کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی تھی۔ بہت سا پانی یکدم ابل کر آنکھوں سے باہر آیا تھا۔

"مجھے اپنے امی ابو کی بہت یاد آرہی ہے عمر!" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"مائی گاڈ!" عمر اتنا ہی کہہ سکا پھر تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا۔ اس کا غصہ آنسو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔



"یار! اس قدر خبیث انسان ہو تم۔ ایک کال نہیں کرسکتے تھے۔" موبائل فون کان سے لگاتے ہی عمر کی چیختی چلاتی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ تکیے کے سہارے تھوڑا سا اٹھ کر بیٹھ گیا اور وال کلاک کی جانب دیکھا' بارہ بج رہے تھے۔ اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس وقت لندن میں کیا ٹائم ہو گا۔

"ایک کال تو کرسکتا تھا۔ یقیناً" کرسکتا تھا۔" اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا تھا۔ عمر کی آواز سن کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ وہ جس طرح اپنے کیریر کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور ترقی کی منزلیں جس تیزی سے طے کر رہا تھا' اس کے پاس عمر کو بتانے کے لیے بہت کچھ تھا۔

"جانے دو یار... تم ایک کال کرنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ تمہیں محبت نبھانے کا سلیقہ آتا ہے نہ تم میں یہ صلاحیت ہے... یہ میں ہی ہوں جو تمہارے پیچھے خوار ہوتا رہتا ہوں۔" عمر کا انداز نیم مزاحیہ سا تھا۔ شہروز کو ہنسی آگئی۔ اتوار کا دن تھا۔ اس لیے وہ کافی فراغت سے بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ شہروز کو اندازہ تھا کہ آج اس کی اچھی کلاس ہونے والی ہے۔

"اتنا اداس مت ہو انار کلی... سلیم آج بھی تمہارا ہی ہے۔" شہروز نے اس کے انداز میں اسے چڑانا چاہا تھا۔

"سلیم کے بچے... کہاں رہتے ہو تم آج کل... مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ دبئی جارہے ہو۔ میں تمہاری راہ تکتے تکتے انار کلی سے تربوز کلی ہوگیا مگر تمہاری کوئی خیر خبر ہی نہیں۔ خود تم کبھی کال نہیں کرتے۔ ایسی بھی کیا بے مروتی عالم پناہ... بہت بدل گئے ہیں آپ۔"

عمر کی آواز میں شکوے کا گہرا تاثر تھا۔ شہروز خجل سے انداز میں مسکرایا۔

"بدلا نہیں ہوں دوست! بخدا نہیں بدلا ہوں' ہاں مصروف بہت ہوگیا ہوں۔ ریئلی! سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ میں کیا کروں۔ میری جاب کی نوعیت ہی ایسی ہے' دن اور رات کا فرق ختم ہوگیا ہے اخبار اور نیوز چینل کے ساتھ کام کرنے کا یہی نقصان ہے۔"

اس نے مصروفیت کا جواز پیش کیا تھا۔

"تمہیں کس نے مشورہ دیا تھا دونوں چیزوں میں ایک ساتھ سر کھپانے کا' چینل جوائن کرکے کون سا معرکہ مار لیا جناب نے۔ جھوٹوں کے گینگ میں ایک اور جھوٹے کا اضافہ ہوگیا۔" عمر اب اسے چڑا رہا تھا۔ شہروز ہنسا تھا۔

"یہ میرا شوق ہے یار! بلکہ میرا جنون ہے۔ اخبار اور چینل اب لازم و ملزوم ہیں۔ یہ دونوں صحافت کا لازمی جزو ہیں اور تم مجھے جھوٹا کہو یا جھوٹوں کا سردار... میں یہ سب چھوڑ نہیں سکتا۔ میں نے یہ جاب حاصل

کرنے کے لیے ڈیڈی کو ناراض کیا' بھائیوں کو مایوس کیا۔ زارا کا دل توڑا... میں اسے کیسے چھوڑ دوں... یہ میری پہلی محبت ہے۔"

شہروز نجانے کیوں اسے وضاحت دینے لگا۔

"اس دوسری محبت کی سناؤ۔ وہیں کھڑی ہے یا پاؤں پاؤں چلنا شروع ہو گئی ہے۔"

عمر کی بات پر شہروز نے قہقہہ لگایا۔ وہ زارا کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اس نے کھل کر ہنسنے کے بعد مصنوعی گہری سانس بھری۔

"کیا یاد کروا دیا دوست... تمہیں شاعری سے ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو اس وقت تمہیں فیض صاحب کا ایک زبردست قطعہ سناتا مگر شاعری کی طرف سے تم ذرا فارغ ہو' اس لیے رہنے دو... دوسری محبت کھڑی ہے نہ پاؤں پاؤں چل رہی ہے... دوڑ رہی ہے میری رگوں میں۔"

"دوڑ رہی ہوتی تو اب تک تم بال بچوں والے ہوتے... میرے سامنے فلسفہ نہ بگھار رہے ہوتے۔"

عمر جل کر بولا تھا۔ عمر اور شہروز کی ایسی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے خود بال بچوں والے ہو گئے ہو حالانکہ تمہاری محبت اڑ رہی تھی۔" شہروز نے اسے طعنہ دینا ضروری سمجھا تھا۔

"کسی کے زخموں پر نمک چھڑکتے شرم نہیں آتی تمہیں... اللہ پوچھے گا تم سے۔" عمر نے گہری مصنوعی سانس بھری۔ "میں نے سادہ سے الفاظ میں زارا کا حال پوچھا تھا... جواب میں کتنے طعنے دے ڈالے تم نے مجھے۔"

"آئی سوری یار! بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی' آتے ہوئے بھی اسے بس دو منٹ کی کال کر سکا وہ بھی ایئرپورٹ سے... بتا تو رہا ہوں، بہت مصروفیت ہے۔"

"دو منٹ بھی بہت ہیں اس کے لیے... اس سے زیادہ دیر بات کر کے یا ملاقات کر کے کیا ہو جانا تھا... وہی روتی بسورتی' سڑی ہوئی شکل۔" عمر اسے چڑا رہا تھا۔

"میں بتاؤں گا اسے کہ تم ایسے کہہ رہے تھے... اچھی خبر لے گی تمہاری۔" شہروز نے ہنستے ہوئے درپردہ اسے ڈرانا چاہا تھا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم بدل گئے ہو ورنہ ایسی لگائی بجھائی پہلے کب کرتے تھے تم۔" عمر نے ترنت جواب دیا تھا۔

"پہلے میں صحافی تو نہیں تھا نا یار!" شہروز نے تسلیم کیا تھا۔

"ایک صحافی' دوسرا ڈاکٹر... کیا بنے گا تم لوگوں کا۔" عمر نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

شہروز جواباً ہنستا رہا۔ عمر کی شوخیاں عروج پر تھیں۔

"ویسے مجھے یقین نہیں آتا شہروز کہ اپنی زارا خیر سے واقعی مکمل ڈاکٹر بن چکی ہے... علاج ولاج کر لیتی ہے وہ... انجکشن وغیرہ لگاتے ہوئے ہاتھ تو نہیں کانپتے اس کے۔"

"میری ہونے والی اہلیہ کو جتنا ڈفر سمجھتے ہیں نا آپ... اتنی ڈفر ہے نہیں وہ' اور آپ کی معلومات میں اضافہ کر دوں کہ انجکشن وغیرہ لگانا ڈاکٹر کا کام نہیں ہوتا۔ اس کام کے لیے نرس موجود ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صرف معائنہ کرتے ہیں' مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور نسخہ لکھ دیتے ہیں... دیٹس آل..."

شہروز نے بات کرتے ہوئے سر بھی کھجایا تھا۔ عمر کی کال طویل ہو رہی تھی۔

"تمہارے لیے کوئی نسخہ نہیں لکھا اس نے؟" عمر اسے زچ کرنے پر تلا تھا۔

"مجھے کیا ہوا اسٹوپڈ... اور پھر وہ مردوں کی ڈاکٹر نہیں ہے۔" شہروز نے برا سا منہ بنایا تھا۔

"وہ جانوروں کی ڈاکٹر ہے۔ اسی لیے تم سے یہ سوال پوچھا ہے۔" بات مکمل کر کے اس نے خود ہی قہقہہ لگایا تھا۔ شہروز کو اس برسوں پرانے لطیفے پر ہنسی نہیں آئی تھی۔

"یہی بوریت پھیلانی ہے یا کام کی کوئی بات بھی کرنی ہے۔" اس نے چڑ کر پوچھا۔

"شادی کب کر رہے ہو تم دونوں؟" عمر کے اگلے

سوال نے شہروز کو مزید بور کیا تھا۔ اسے پہلے ہی خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ عمر نے اس موضوع کو ہی زیر بحث لانا ہو گا۔ اسے پتا تھا کہ آج کل گھر میں سب ہی اس بات پر بضد ہیں کہ اب شہروز اور زارا کی شادی ہو جانی چاہیے' جبکہ وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر اگلے سال تک ٹال رہا تھا۔

"جب تم پاکستان آؤ گے تب ہی شادی کریں گے ہم..... جب تم پاکستان سے گئے تھے۔ یہی فیصلہ ہوا تھا' میں تمہاری طرح بے وفا نہیں ہوں عمر احسان! اسی لیے اپنی بات پر قائم ہوں۔" شہروز نے جتایا۔

"میں نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ ہم پاکستان آنے کی پلاننگ کر رہے ہیں..... تم لوگ کوئی ڈیٹ وغیرہ فائنل کرلو۔"

وہ کافی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ شہروز کو یقین ہو گیا تھا کہ زارا نے عمر سے کوئی بات کی تھی۔ اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"میری شادی کوئی ڈور بیل نہیں ہے کہ انگلی رکھی اور بجادی..... اپنے خاندان کا آخری چشم و چراغ ہوں۔ میرے اماں ابا بہت دھوم دھام سے مجھے بیاہنے کا ارادہ رکھتے ہیں..... تمہارے طرح نہیں کہ چھ گھروں سے دو' دو لوگ بلا کر ولیمہ کر لیا اور فارغ ہو گئے۔"

وہ تنک کر بولا۔ اسے عمر کا آئیڈیا ذرا بھی نہیں بھایا تھا۔

"ہم برٹش ہیں بھئی..... سوفسٹی کیٹڈ اور امن پسند..... ہم نے چکن بھی حلال کرنی ہو تو سلاٹر ہاؤس میں کرتے ہیں بجلی کا جھٹکا دے کر خاموشی سے اور پھر شادی تو پورے ایک فرد کی قربانی ہوتی ہے۔" عمر کا انداز استہزائیہ تھا۔

"ارے ہٹاؤ! ایسی قربانی ہمیں دل و جان سے منظور ہے..... یہ قربانی ہے تو میں بخوشی چار بار قربان ہونے کو تیار ہوں۔"

دونوں نے اس بات پر قہقہہ لگایا تھا۔

"زیادہ اوور ہونے کی ضرورت نہیں..... میں بتاؤں گا زارا کو کہ یہ ارادے ہیں جناب کے۔" عمر نے اسے ڈرانا چاہا۔

"میں زارا سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

"یہ بات تو اب آمنے سامنے بیٹھ کر ہو گی۔" عمر نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

"تم واقعی پاکستان آنے کی پلاننگ کر رہے ہو؟" شہروز کو اس کے لہجے میں سنجیدگی کا عنصر بڑھتا ہوا محسوس ہوا۔

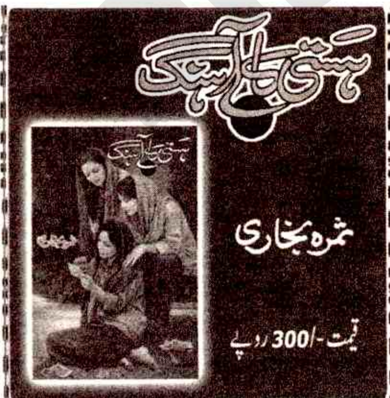
"یہی تو بتا رہا تھا میں تمہیں کہ کرسمس کی چھٹیوں میں فائنل کرلو..... ہم آرہے ہیں۔"

"خیریت..... پہلے یہ بات نہیں بتائی تھی تم نے۔" شہروز کو مزید الجھن ہوئی۔ دل میں زارا کے خلاف غصہ شدید تر ہوا تھا۔ اسے اب مکمل یقین ہو چکا تھا کہ اسی نے عمر کو مجبور کیا ہے کہ وہ شہروز کو راضی کرے۔ اسے زارا اور عمر پر غصہ آرہا تھا۔

"اب بتا رہا ہوں نا..... تم پاکستان پہنچ کر کچھ فائنلائز کر کے ہمیں بتاؤ۔" عمر ایک ہی بات کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

"اس سال تو ممکن نہیں۔ اگلے سال دسمبر میں ڈن کرتے ہیں" اس نے منہ پھلا کر کہا تھا۔ عمر کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن اسے اتنا غصہ آگیا تھا کہ اس نے نہ صرف کال کاٹ دی بلکہ فون بھی بند کر دیا تھا۔ اسے زارا پہ اتنا غصہ آرہا تھا کہ شاید زندگی میں کبھی نہ آیا ہو گا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



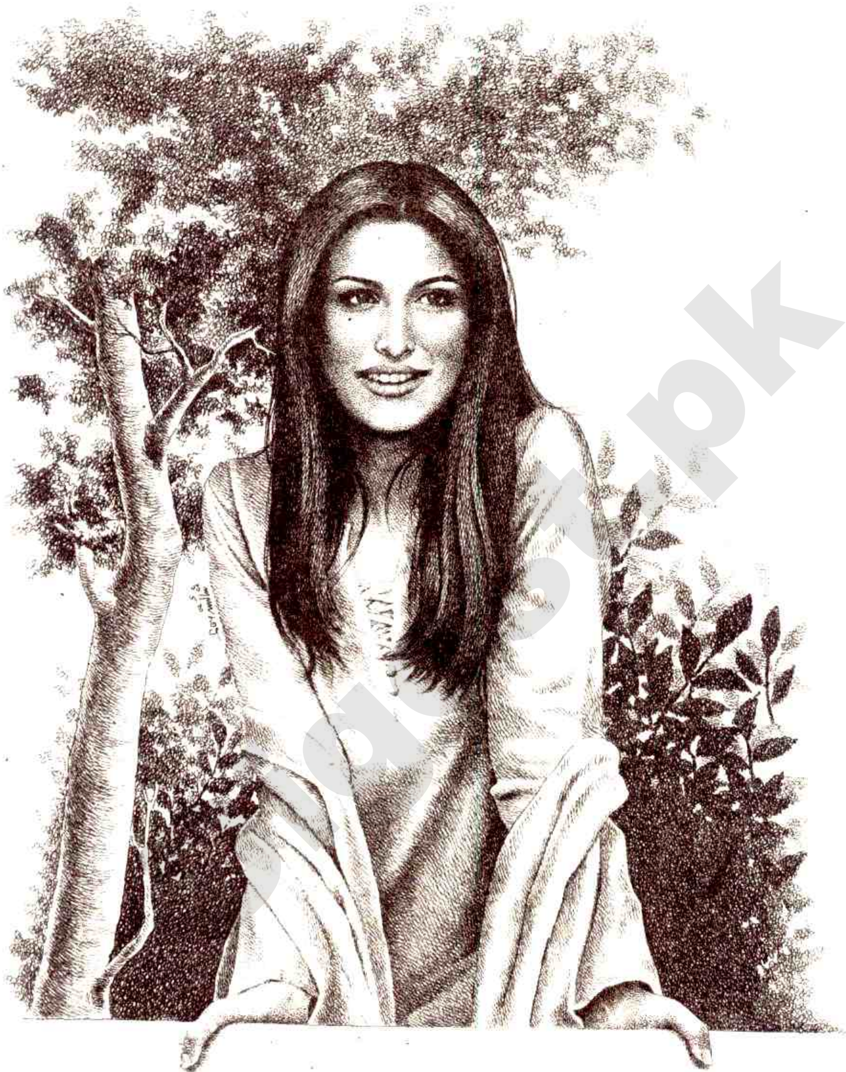
عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الھڑ سی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آ جاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی





دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے، مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے' ان سے پیسے بٹور کر بلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب' معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔

ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کردیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گرجاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہوکر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں' زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہوجاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار مقرر کرجاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز' ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے' مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون' معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کردیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی' ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم' ابیہا کو سیفی کے حوالے کردیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے' جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کرلیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہوکر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہوجاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد' ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے' مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب۔ پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کردیتی ہے' مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہوپاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا' ثانیہ کو فون

کردیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم 'حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے' مگر ثانیہ 'ابیہا کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں' مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے' مگر اس کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کرکے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہوکر کچھ اشیائے خورد و نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

۔ ۱۳ ۔
تیرہویں قسط

وہ کڑھ کڑھ کر سوچتی اور سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی۔ اسے عون کے ساتھ اسلام آباد آنے پر ہزار مرتبہ افسوس ہو رہا تھا۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ممانی جان کی ذہنیت کیا ہے... اور ارم ہو بہو ان ہی پر پڑی تھی۔

کینہ پرور' خود پسند اور خود غرض۔

اسے اگر علم ہوتا کہ اسے یہاں آکر کمرہ بھی ارم کے ساتھ شیئر کرنا پڑے گا تو وہ وہاں عون کی منتیں کرنے کے' بجائے خود سب کے سامنے بدتمیزی سے ہی سہی مگر ڈٹ جاتی اور اسلام آباد آنے سے انکار کردیتی۔

اسے رہ رہ کر وقت کے ہاتھ سے نکلنے کا احساس ہوتا۔ دو گھنٹوں کی نیند کے بعد وہ فریش تھی۔ جب نیلم اسے چائے کے لیے بلانے آئی۔

سفید رنگت لیے خوش شکل سی نیلم اور شاید خوش گفتار بھی۔ پہلے جب یہ لوگ کراچی میں تھے' تب نیلم چھوٹی سی تھی۔ ثانیہ کا واسطہ نازیہ اور ارم سے زیادہ پڑا تھا۔ نازیہ چونکہ بڑی تھی اس لیے اس نے کبھی ثانیہ نامی کزن کو کوئی خاص لفٹ نہیں کرائی' ہاں مگر ممانی جان اور ارم کو ثانیہ سے خاص طور پر کینہ تھا۔ عون عباس نامی کینہ۔

نیلم کے ہونٹوں پر خیر سگالی کی مسکراہٹ تھی' مگر ثانیہ ان لوگوں سے دور... بچ کے ہی رہنا چاہتی تھی۔ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔

"آپ بہت چینج ہیں۔ آئی مین' لگتا نہیں کہ کسی گاؤں میں رہتی ہیں۔"

نیلم شاید اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ثانیہ نے سمجھنے کی کوشش کی۔

"کیوں... گاؤں میں انسان نہیں رہتے کیا؟" غصے میں تو وہ بقول عون "کڑوی دوائی" بن جایا کرتی تھی۔

"آپ نے مائنڈ کیا... سوری۔ میں تو آپ کی تعریف کر رہی تھی۔" اس کے بہت روکھے سے انداز پر نیلم کچھ کنفیوز ہوئی تو ثانیہ ٹھٹکی۔

ایک ثانیے کو اس کا سوال ذہن میں دہرایا تو خود ہی شرمندہ ہوگئی۔

وہ شاید سب ہی کو ایک لائن میں کھڑا کرکے اڑا دینے کے چکر میں تھی۔ گناہگار اور بے گناہ کا خیال کیے بغیر۔

"سوری۔ میں غلط سمجھی۔" ثانیہ نے فوراً" ہی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو نیلم سر ہلا کر اسے لیے ساتھ لان میں چلی آئی۔

وسیع لان میں اس وقت ایک بھرپور محفل جمی ہوئی تھی۔ تایا جان اور فاران آفس سے آچکے تھے۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ ارم کی دو خالہ زاد بھی موجود تھیں اور ایک ماموں زاد بھی۔ وہ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

اسے نیلم کے ساتھ آتے دیکھ کر فطری طور پر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے تو وہ اندر ہی اندر نروس نیس کا شکار ہونے لگی۔

"السلام علیکم ماموں جان!" اس نے پاس جا کر شائستگی سے تایا جان کو سلام کیا تو وہ کھڑے ہو کر ملے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہلکا سا شانے سے لگایا اور بس۔

اسے اپنی ماں کے بھائی سے اپنائیت کی کوئی مہک نہ آئی تھی۔

"یہ فاران بھائی ہیں۔ انہیں تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔" نیلم نے تعارف کرایا تھا۔

ثانیہ نے فاران کو بھی سلام کیا جو اپنی کرسی پر ریلیکس سا نیم دراز کیفیت میں بیٹھا سینے پہ بازو لپیٹے دلچسپی سے اسی کا جائزہ لے رہا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟" گندمی رنگت والا خوش شکل سا فاران، مگر ثانیہ کو اس کی اس قدر گہری، جائزہ لیتی نگاہ پسند نہیں آئی تھی۔

"جی۔ اللہ کا شکر ہے۔" وہ مختصراً کہہ کر قدرے کونے پر رکھی کرسی پر ٹک گئی۔

"کوثر نے بھی ساری عمر گاؤں ہی میں رول دی۔ زندگی بنانی نہیں آئی اسے تمام عمر۔"

یہ تائی جان کا بظاہر متاسفانہ مگر براہ راست حملہ تھا۔ ثانیہ کی امی یعنی اپنی نند پر۔

"جہاں والدین بیاہ دیں وہاں عمر گزارنا، زندگی بنانا ہی ہوتا ہے ممانی جان! اور امی نے تو دادی اور دادا جان کے ساتھ بہت بہترین وقت گزارا ہے۔ ان کی خدمت کر کے دعائیں لی ہیں۔" ثانیہ نے سنجیدگی سے ان کی بات کا جواب دیا۔

"چائے آگئی ہے مگر یہ عون ابھی تک نہیں آیا۔ میں دیکھ کے آتی ہوں۔ ابھی تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ سست۔" نیلم کو چائے لاتے دیکھ کر ارم ناک چڑھا کر کہتی مسکرائی۔ کوئی کچھ نہیں بولا تھا۔ مطلب کسی کو اس کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ثانیہ کے دل کی کیفیت عجیب سی ہوئی۔

یعنی۔۔۔ اب یہ عون کے کمرے میں جائے گی؟

"ثانیہ آپی! چائے۔" نیلم کے دوبارہ ٹوکنے پر وہ گڑبڑا کر متوجہ ہوئی۔

"تم لوگوں کا آنا بھی سر آنکھوں پر، مگر تم لوگوں کے ماں باپ کا رویہ بھی دیکھ رہا ہوں میں۔ رشتہ داری نبھانے والا کوئی انداز نہیں ہے ان کا۔"

تایا جان نے اخبار جھٹک کر سیدھا کرتے ہوئے کھردرے انداز میں کہا تو اپنی پلیٹ میں چکن رول رکھتی ثانیہ سیدھی ہو کر بیٹھی، پھر بڑے سکون سے اپنے بڑے ماموں جان کی طرف متوجہ ہوئی۔

اس ہٹیلی کو عون ہی اشارے سے چپ رہنے کا کہہ سکتا تھا۔ اب وہ نہیں تھا تو کون اس کی زبان بند کراتا؟



فریش ہو کر چینج کرنے کے بعد وہ جلدی جلدی بالوں میں برش چلا رہا تھا۔ جب کھٹاک کی آواز سے ناب گھومی اور دروازہ کھلا۔

ارم کا مسکراتا ہوا چہرہ اندر آیا۔ آئینے میں دیکھتا عون گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

"چائے ریڈی ہے مسٹر۔ تمہاری عادت نہیں گئی ابھی تک۔ کب تک یونہی انتظار کراتے رہو گے؟" ارم کے

انداز دوسروں کے سامنے کچھ اور تھے۔ تنہائی پاتے ہی وہ کھل کے سامنے آئی تھی گویا۔
وہ برش ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے پلٹا۔
"ذرا واپس دروازے میں جاؤ۔" وہ سنجیدہ تھا۔
"کیوں.....؟"
"جاؤتو۔ کچھ بتانے والا ہوں تمہیں۔" وہ اسی انداز میں بولا تو ارم ناسمجھی کے عالم میں دروازے تک گئی۔
"اب ذرا اسے ناک کرو۔" عون نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
ارم نے ہلکا سا دروازہ بجایا۔
"ہوں۔ یہ وہ طریقہ ہے جو کسی کے بھی روم میں آنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مس ارم فراست علی!" وہ طنز کر رہا تھا۔
ارم کھسیانی۔
"اب مجھ سے اتنی اجنبیت تو مت برتو عون! ہم بچپن کے فرینڈز ہیں۔"
"فرینڈز تو ہیں 'مگر اب بچپن نہیں ہے ارم!" وہ برجستہ بولا تھا۔
"اُفوہ! تم بھی نا۔ وہاں چائے پہ سب ویٹ کر رہے ہیں۔ مجھے بھی روک لیا یہیں۔" وہ بڑے ناز سے ٹھنک کر بولی۔
"ایکسکیوزمی ارم! میں آ ہی رہا تھا۔ نیلم مجھے چائے کا کہہ گئی تھی۔ تم نے ناحق زحمت کی۔"
عون نے اسے جتایا۔ جو اندھا ہو اُس کا علاج تو کوئی کروا دیتا ہے 'مگر جو جان بوجھ کے اندھا بنے اس کا دوا دارو کچھ نہیں ہوا کرتا۔
ارم کا بھی یہی حساب تھا۔ وہ اسے ساتھ لینے آئی تھی 'لے کر ہی ٹلی۔



"یہ رشتہ داری نبھانے کا ہی انداز ہے ماموں جان! کہ ہم دونوں آپ کو اس شادی میں نظر آ رہے ہیں۔ ورنہ ماضی کی تلخیوں کے بعد آپ کون سا اپنے بھائی اور بہنوں کو بذات خود بیٹی کی شادی میں انوائیٹ کرنے آ گئے تھے۔ انہوں نے تو کارڈ کا بھی مان رکھ لیا۔"
لمحہ بھر کو تو سب ہی اس کی شکل دیکھتے رہ گئے۔ پھر گویا تائی جان کو ہوش آیا۔
"اللہ..... یہ حال ہے آج کل کی پود کا۔ یعنی اب بڑے جائیں گے چھوٹوں کے تلوے چاٹنے۔"
وہ ناگواری سے بولیں تو لفظوں کے چناؤ میں اس قدر بے احتیاطی کر دی کہ شوہر نامدار کو انسانیت کے عہدے ہی سے ہٹا دیا۔ ثانیہ کا دل خراب ہوا۔
"ممانی جان! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا 'لیکن ناراضیوں کے بعد منانے کا انداز جتنا دل موہ لینے والا ہو 'اتنا ہی دوسرے کا دل صاف ہوتا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔
"واہ بھئی واہ۔ ثانی کی سوچ بڑی اعلا ہے۔" پیچھے سے آ کر اس کی کرسی کی پشت تھامتے عون نے گویا جھوم کر اس کی تائید کی تھی۔
"السلام علیکم تایا جان....." وہ بہت گرم جوشی سے تایا جان سے ملا۔ فاران سے ملا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ ملنسار 'گھل مل جانے والا۔

ثانیہ کی نگاہ پڑی۔ ارم بڑے پیار سے عون کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے چھلکتے چاہت کے جام اور لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ۔ ثانیہ کا دل اکتانے لگا۔ اس کا اس ماحول سے بھاگ جانے کو جی چاہ رہا تھا۔

"یہ لو عون۔ ذرا شامی کباب چکھو۔ میں نے خاص اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔" ارم نے پلیٹ اٹھا کے عون کی طرف بڑھائی۔

"اس میں کیا خاص بات ہے۔ ہر کوئی اپنے ہاتھوں ہی سے بناتا ہے۔" عون نے اس کا مذاق اڑایا۔ نیلم زور سے ہنسی تو ارم نے اسے ہلکا سا گھور کے دیکھا۔

"تم سناؤ عون! آج کل کیا کر رہے ہو؟" نازیہ آپی نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

جانے وہ ان چھ سالوں میں واقعی بدل گئی تھیں یا پھر ہونے والی شادی نے ان کے اندر فی الحال نرم سا تاثر اجاگر کر دیا تھا۔

"کرنا کیا ہے۔ آپ کے چچا جان کا ریسٹورنٹ سنبھالتا ہوں۔" وہ بہت پر سکون سا بیٹھا تھا۔

مگر ثانیہ کڑی ٹینشن کا شکار تھی۔ اسے یہاں ہر چہرہ ہر تاثر اجنبی لگ رہا تھا۔ تائی جان متاثر ہوتے ہوئے اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

"اچھا۔ تو تمہارے حوالے کر دیا عباس نے ریسٹورنٹ۔ کیسا چل رہا ہے؟"

"بہت اچھا تائی جان الحمدللہ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ فاران نے گہری نگاہ سے ثانیہ کا مضطرب چہرہ دیکھا پھر بہت اپنائیت سے بولا۔

"ارے ثانی! تم کیوں یونہی بیٹھی ہو۔ کچھ لو نا۔ یہ ڈونٹس چیک کرو۔ بہت ڈفرنٹ فلیور ہے۔"

ثانیہ نے عون کو متوجہ ہوتے دیکھا تو وہ سنبھل کر ہلکا سا کھنکھاری پھر مسکرا کر فاران سے کہا۔

"تھینک یو فاران بھائی۔۔۔!" وہ ڈونٹس اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھنے لگی۔

"ثانی۔۔۔!" عون نے دل ہی دل میں دانت کچکچائے تھے۔

"آج ڈھولک رکھ رہے ہیں ہم۔ اب سے لے کر سات دن تک فنکشن ہو گا۔" نیلم پرجوش تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا اپنی دوستوں کو آخری تین دن کا بلاوا دینا۔ شروع کے دنوں میں صرف فیملی ہی ہو گی۔" ارم نے اسے ٹوک دیا۔ نیلم نے منہ بنایا۔

"کہہ دیا ہے سب کو۔"

"اور ہاں فاران بھائی! عون اتنے سالوں کے بعد آیا ہے۔ دن کے ٹائم پکنک ہونی چاہیے روز۔" ارم نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی۔ ثانیہ نے طنزیہ نظروں سے عون کو دیکھا جو خجل سا ہو گیا تھا۔

"بھئی۔ گاڑی حوالے کر دوں گا جہاں جی چاہے لے جانا، مگر میں اتنے دنوں تک آفس سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ ان دنوں مال کی ڈیلیوری ہونی ہے۔ میرا فیکٹری میں ہونا بہت ضروری ہے۔"

فاران نے خوش دلی سے اجازت دیتے ہوئے معذرت کی۔

"تھینک یو فاران، مگر یار! ہم تو ہر سال گرمیوں میں مری، ایوبیہ آنے والے لوگ ہیں۔ چپہ چپہ جانتے ہیں یہاں کا۔ ارم کی غلط فہمی ہے کہ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔"

عون نے بات ہی ختم کر دی تھی۔

"اوفوہ! تم بھی نا عون۔ بہت بورنگ ہو۔ اب سارا دن کیا یونہی گھر میں پڑے رہو گے؟" ارم نے ٹھنک کر کہا تو وہ اطمینان سے بولا۔

"نہیں۔ ثانی کو یہاں کی سیر کراؤں گا۔ کیوں کہ یہ واقعی اسلام آباد پہلی بار آئی ہے۔"
"اف...!" ثانی کے تپتے سلگتے دل پہ ٹھنڈی سی پھوار پڑی مگر وہاں موجود کتنوں ہی کے دل جل کے راکھ ہوئے۔
ثانیہ چپکے سے مسکرادی۔



اسے کوئی بھی نہ بتاتا تو وہ بوجھ لیتی کہ دروازے پہ بڑے کروفر سے کھڑی عورت کوئی اور نہیں بلکہ سفینہ امتیاز احمد تھیں۔
اس گھر میں آتے ہی ایبہا نے سفینہ کو دیکھا تھا۔ بے قابو ہوتی ' اسے لعن طعن کرتیں سفینہ اور یہ... نفیس سالباس 'خوشبو میں اڑاتا وجود۔ نازک سی جیولری پہنے۔ وہ بیگم صاحبہ بن کے آئی تھیں۔
"اب پیچھے ہٹو گی یا بے وقوفوں کی طرح کھڑی منہ ہی دیکھتی رہو گی؟"
یہ تنفر بھرا لہجہ ان کے حلیے سے میل نہیں کھاتا تھا' مگر اکثر چیزوں کی صرف پیکنگ ہی اچھی ہوتی ہے۔
ایبہا دروازہ کھول کے دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی ملکہ کے سے انداز میں اندر داخل ہوئی تھیں۔
ایبہا کا دل مارے پریشانی کے لرز رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے سارے ماحول کا جائزہ لیتی اب صوفے پر بڑے پرتکلف انداز میں ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھ چکی تھیں۔

ایبہا ہونق سی دوسرے صوفے کی پشت پر ہاتھ جمائے کھڑی تھی۔
"آپ... چ... چائے پئیں گی۔" سفینہ نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور حقارت سے بولیں۔
"میں یہاں تمہارے ساتھ بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرنے نہیں آئی ہوں۔ یہ میرا گھر ہے۔ تم سے دوٹوک بات کرنے آئی ہوں۔" ایبہا سہمنے لگی۔ مردوں کے بدسے بدتر روپ وہ دیکھ چکی تھی۔ میڈم کے بعد آج ایک اور دبنگ عورت سے اس کا پالا پڑا تھا۔
"میں صرف تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ امتیاز احمد... نکاح کے بعد تمہیں یہاں لایا تھا۔ اب وہ نہیں رہا تو تم کس رشتے سے یہاں رہ رہی ہو؟" وہ نخوت سے پوچھ رہی تھیں۔
"مجھے... معیز یہاں لائے ہیں۔" ہمت کرکے کہتے ہوئے ایبہا کی پلکیں بوجھل ہو گئیں۔
"وہ تو بے وقوف ہے۔ اسے کیا پتا ان باتوں کا' مگر تم..." وہ تیز لہجے میں کہتے ہوئے رکیں۔ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا اور دوبارہ اسی انداز میں بولیں۔
"تمہاری ماں تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھی۔ تمہاری تربیت میں بھی چار چاند ضرور ٹانکے ہوں گے اس نے..." مارے ضبط کے اس کی رنگت لال پڑنے لگی۔
"خود تو یاری لگا کے مرضی کی شادی کرلی اس نے۔ تب اسے امتیاز احمد کی اچھائیاں نظر نہیں آئیں۔ پھر کیوں تمہاری دفعہ اسے امتیاز احمد ہی نظر آیا؟" وہ برداشت کر کرکے تھک چکی تھیں۔ ارادہ تو کچھ اور ہی لے کر آئی تھیں' مگر اس کی حسین صورت دیکھتے ہی پھٹ پڑنے کو بے تاب ہو رہیں۔ ماں کے بارے میں کہے جانے والے لفظوں نے ایبہا کی سماعتوں میں گویا پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا تھا۔ اس کے بے اختیار آنسو بھر آئے۔
"ہم بہت برے حالات میں تھے... امی مرنے والی تھیں۔"
"تو مر ہی کیوں نہ گئی وہ۔ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ہی مر جاتی۔ میرے گھر پہ کیوں قیامت توڑی اس نے۔"

سفینہ نہیں 'کوئی ناگن پھنکاری تھیں۔

"روپیہ 'پیسہ' جائیداد۔ کچھ بھی مانگ لیتی۔۔۔ مگر یہ بے غیرتی تو نہ دکھاتی۔ جوان بیٹی کو آگے کر دیا۔" وہ اب ہچکیوں سے رونے لگی تھی مگر اسے کوئی بھی سمجھانے والا نہیں تھا کہ ایبھا مراد۔۔۔ مت رو۔ یہ دنیا روتے ہوؤں پر ترس کھانے والی نہیں ہے۔

"ابو۔۔۔ ابو۔۔۔ مجھے جوئے میں۔۔۔ اس لیے امی نے مدد مانگی۔" وہ ایک دفعہ پھر اپنا سیاہ ماضی دہراتے ہوئے اسی اذیت کا شکار ہو رہی تھی۔ بھلا کبھی باپ کا ایسا بھی رشتہ ہوا کرتا ہے بیٹی کے ساتھ؟

"میرا شوہر ہی کیوں؟ اسے تو عادت تھی منہ مارنے کی۔ کسی اور کے پلے باندھتی تمہیں۔" وہ گرجیں۔ ان کی آنکھوں میں مرچیں سی جل رہی تھیں۔

"کتنی بے غیرتی سے اس نے امتیاز احمد کو نکاح کا پیغام دے دیا۔"

"وہ مجبور تھیں۔۔۔" ایبھا کٹ کے رہ گئی۔ صالحہ نے تو اس وقت بس کسی بھی طریقے سے ایبھا کو بچانے کی کوشش کی تھی' مگر خبر نہ تھی کہ یہ بات بار بار اس کی بیٹی کے منہ پہ ماری جائے گی۔

"وہ مجبور تھی اور پرانے محبوب کو بھی مجبور کر دیا اس نے۔" وہ پھنکار کر بولیں۔

"مگر کان کھول کے سن لو لڑکی! جس دولت اور جائیداد کے چکر میں تم یہاں آئی ہو' وہ صرف میرے بچوں کا حق ہے اور امتیاز احمد کی بیوہ صرف میں ہوں۔" ایبھا خاموش کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

"اس لیے جلد از جلد کہیں اور اپنے ٹھکانے کا بندوبست کرو۔ میں تمہیں ایک منٹ بھی یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ تنفر سے کہتی جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایبھا کا حلق خشک تھا۔

"مجھے یہاں۔۔۔ معیز لائے ہیں۔۔۔ ان کی اجازت کے بغیر۔۔۔" اس نے کہنے کی کوشش کی۔

"بس۔۔۔" وہ گرج کر اسے ٹوک گئیں۔ پھر انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا۔

"خبردار۔۔۔ خبردار! جو اتنے دھڑلے سے میرے بیٹے کا نام لیا۔ بے غیرت۔ میرے شوہر کو تو نگل گئیں۔ اب بیٹے پہ ڈورے ڈالنے کا پروگرام ہے۔"

"آنٹی پلیز۔۔۔!" وہ بے اختیار روتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ سفینہ نے کرنٹ کھا کر اسے دیکھا۔

"بے ہودہ۔۔۔ خبیث۔۔۔ میں کس حیثیت سے تمہاری آنٹی ہوئی ہوں۔" انہوں نے دانت کچکچائے۔

"بیوہ ہو تم امتیاز احمد کی اور میری سوکن۔" ایبھا کے آس پاس کوئی بم پھٹا تھا۔ اس نے بے اختیار چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے۔

مارے صدمے کے اس کے آنسو تھم گئے تھے۔ آنسوؤں سے بھیگا سرخ و سفید چہرہ اوس میں دھلے گلاب کی مانند لگ رہا تھا۔ اتنے برے موڈ میں بھی سفینہ نے اس کے سحر طراز حسن کو بری طرح جل کر دیکھا تھا۔

"مم۔۔۔ میں۔ بیوہ نہیں ہوں آنٹی۔۔۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بے اختیار بولی۔ سفینہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت مشکوک ہو۔

"میں۔۔۔ معیز کے نکاح میں ہوں۔ انکل نے ان ہی سے نکاح کروایا تھا میرا۔" سپید پڑتی رنگت کے ساتھ ایبھا نے بعجلت ان کی غلط فہمی دور کی۔

"میرے اللہ۔۔۔!" سفینہ کا سر چکرایا تو پوری دنیا ہی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

ایبھا بے بسی و حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔



عون نے معیز کو اپنے جانے کی اطلاع محض میسیج کے ذریعے دی تھی۔ اسلام آباد جانے سے پہلے معیز سے ملنے نہیں آیا۔ شاید ایبہا والے معاملے پر اپنی ناراضی ظاہر کرنا مقصد تھا۔ ابھی بھی معیز ہی نے اسے کال کی تھی۔

"کیا حال چال ہیں؟" معیز نے ہینڈ فری کان میں ٹھونستے ہوئے خوش گوار گفتگو کا آغاز کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

"الحمدللہ.... تم سناؤ۔"

"میں تو ٹھیک ہی ہوں۔ تم کس سلسلے میں اسلام آباد پہنچے ہوئے ہو؟" عون جواباً" ہنسا۔

"وہ بھی پورے ایک ہفتے کے لیے۔ ثانی بھی میرے ساتھ ہے۔"

"آہا.... " معیز مسکرایا۔ "ہنی مون پہ تو نہیں نکل گئے بیٹا! اور ہمیں خبر بھی نہیں۔" عون نے اب کی بار قہقہہ لگایا تھا۔

"وہ دن بھی ضرور آئے گا یار! فی الحال تو کزن کی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ سب میں یہی طے پایا کہ فیملیز کی نمائندگی مجھے اور ثانی کو کرنی چاہیے۔"

"ویری گڈ.... " معیز نے سراہا۔ "اور "محترمہ" کے کیا حالات ہیں؟" وہ ثانیہ کے تاثرات پوچھ رہا تھا۔ عون نے گہری سانس بھری۔

"وہ تو آنے کو راضی ہی نہیں تھی۔ دراصل یہاں بھی اس کا دل جلانے کا کافی سامان موجود ہے۔"

"بی کیئرفل عون! جہاں تک میں اس کا پرابلم سمجھتا ہوں' وہ فقط تم سے تمہارے انکار کا بدلہ لے رہی ہے۔ معصوم سی ضد ہے اس کی۔"

"آئی نو.... تب ہی تو اس کے ہر موڈ کو سر آنکھوں پہ رکھتا ہوں اور بھابھی کی سناؤ۔ کیسی ہیں وہ؟" عون کے پوچھنے پر لحہ بھر کو معیز کے اعصاب جھنجھنا سے گئے۔

"عون پلیز! اس ٹاپک کو رہنے دو۔ میں اپنی دوستی خراب نہیں کرنا چاہتا اور یہ بھابھی والی مت کہنا اسے آئندہ سے۔"

"نہ مانو معیز احمد! وہ خدا کی آزمائش بن کے تمہارے پاس آئی ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اس آزمائش میں پورے اترتے ہو یا نہیں۔" عون نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس چیپٹر کو کلوز ہی سمجھو۔ وہ جب چاہے اپنی نئی زندگی شروع کر سکتی ہے۔"

معیز کے ارادے اٹل تھے۔

"وہ جن حالات سے گزر کے آئی ہیں' محبت سے ساتھ دو گے تو بہت قدر کریں گی۔ انسان دھکا دینے والے ہاتھوں کو تو بھول ہی جاتا ہے' مگر ہاتھ بڑھا کر سہارا دینے اور اٹھا کر کھڑا کرنے والے کو زندگی بھر نہیں بھولتا معیز!"

"اوکے.... ٹیک کیئر۔ ابھی فی الحال ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔ پھر بات ہو گی۔"

معیز کا موڈ آف ہونے لگا تھا۔ عون نے بھی خدا حافظ کہہ دیا۔ معیز نے اسٹیئرنگ پر زور سے ہاتھ مارا۔

"ایبہا مراد.... ! میری زندگی میں کیوں نامرادی بھرنے چلی آئی۔" وہ بہت برے موڈ کے ساتھ ریش ڈرائیونگ کرتا گھر پہنچا تھا۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اسے سناٹے کا احساس ہو گیا۔ ورنہ اس وقت اپنے اپنے کمروں میں ٹی وی ہونے کے

باوجود ایزد اور زارا کے درمیان ریموٹ پر چھینا جھپٹی ہو رہی ہوتی تھی۔ اور سفینہ بھی نہیں بیٹھی ملتیں۔

"زارا... ایزی...!" وہ بے اختیار ہی گھبرا کر آوازیں دینے لگا۔ ملازمہ نے کچن سے آکر اسے اطلاع دی۔

"بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے۔ صاحب اور بی بی ان کے کمرے میں ہیں۔"

وہ پوری بات سنے بغیر اپنا آفس بیگ صوفے پر اچھالتا تیزی سے سفینہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تو عجیب ٹینشن زدہ سا ماحول دیکھنے کو ملا۔

ایزد ماں کے شانے دبا رہا تھا اور زارا انہیں کوئی دوا کھلانے پر بضد تھی جبکہ آنکھوں میں آنسو بھرے سفینہ اس کی بات ماننے کو تیار نہ تھیں۔ معیز کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف اشارہ کرکے اونچی آواز میں رونے لگیں۔

"کیا ہوا ہے... ماما... کیا ہوا؟" وہ پریشان سا ان تک آیا۔

"اسے کہو ایزد! چلا جائے یہاں سے۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ چلّائیں تو معیز ہکا بکا سا ان کی شکل دیکھنے لگا۔

ایزد اٹھ کر معیز کے بالمقابل آیا۔

"کیا مسئلہ ہے۔ ہوا کیا ہے آخر...؟" معیز نے اونچی آواز میں پوچھا۔ اس کا دل طرح طرح کی پریشانیوں کا شکار ہونے لگا تھا۔

"انیکسی میں گئی تھیں ماما۔" ایزد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تو معیز احمد کا دل بھڑ بھڑ جلنے لگا۔ وہ کیوں بھول گیا کہ اب اس کی زندگی میں ہر ٹینشن کا سرا جا کر ایبہا مراد سے ملتا تھا۔

"تو...؟"

"تو یہ کہ آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ اس لڑکی کا نکاح ابو سے نہیں بلکہ آپ سے ہوا ہے؟" ایزد نے چبا چبا کر پوچھا تو معیز کے سر پر جیسے پہاڑ آن گرا۔

"واٹ دا ہیل..." وہ بھڑک کر بولا۔ اس کے وجود میں یکلخت شرارے سے دوڑ اٹھے۔

"میں نے کب کہا کہ اس کا نکاح ابو کے ساتھ ہوا ہے؟ لاحول ولا..." برہمی سے بولا۔

"آپ کو کس نے بتایا تھا ماما؟" ایزد نے مڑ کر سفینہ سے پوچھا۔

"میں نے خود اسپتال میں اس کی اور اس کے باپ کی باتیں سنی تھیں۔ امتیاز نے صاف لفظوں میں کہا کہ صالحہ نے اس کی بیٹی سے نکاح کرنے کو کہا تو وہ مجبور ہو گیا۔" وہ غصے سے بولیں۔

"ہاں۔ ہو گئے تھے مجبور، مگر اندھے نہیں ہوئے تھے ماما! کہ اپنی سابقہ منگیتر کی بیٹی سے خود نکاح پڑھوا لیتے۔ مجھ سے ریکویسٹ کی تھی انہوں نے۔ اور مجھے مجبوراً" ان کی زبان کا پاس رکھنا پڑا۔" وہ تیز لہجے میں ان کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے مجھے غلط فہمی میں مبتلا رکھا..." سفینہ صدمے کی کیفیت میں تھیں۔

"فار گاڈ سیک ماما! آپ نے آدھی ادھوری بات سن کے خود ہی مفروضے گھڑ لیے۔ کھل کے مجھ سے بات کرتیں تو میں آپ کی فوراً" تصحیح کر دیتا۔ میں آپ سے کیوں چھپاؤں گا بھلا۔"

"اللہ...!" سفینہ بے قراری سے روتے ہوئے بولیں۔

"امتیاز احمد کی طرف سے دل ٹھنڈا ہوا تو اب اس چڑیل کا تم پر قبضہ دیکھ کر جان شکنجے میں آ گئی ہے۔ کاش وہی حقیقت رہتی۔ میں مان تو چکی ہی تھی کہ وہ امتیاز احمد کی بیوہ ہے پر تم... تم کیوں اس گند میں کودے معیز!؟"

"آپ کے لیے تو اور بھی آسانی تھی بھائی! ڈائیوورس دے دیتے۔ گھر تک لانے کی کیا ضرورت تھی اسے۔"

زارا نے ناگواری سے کہا۔

"ابو کا آخری خط دوں گا تمہیں۔ پڑھنا کیا وصیت کی ہے اور کس طرح۔ پھر بتانا مجھے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں۔" وہ سب کی بدگمانی پر بددل سا ہو کر پلٹ گیا۔

"دیکھا۔۔۔ پتا نہیں کیا سوچا ہوا ہے اس نے۔ اب اس مردود صالحہ کی بیٹی کو اپنی بہو کہہ کے متعارف کرواؤ گی میں۔" سفینہ تڑپیں تو زارا زبردستی انہیں مسکن دوا کھلانے لگی۔

بعض لوگوں کو ناشکرے پن کی اتنی عادت ہوتی ہے کہ وہ بڑی مصیبت میں سے نکل کر کسی چھوٹے مسئلے کا شکار ہو جائیں تو بھی سر پر ہاتھ رکھ کے روتے ہیں۔

"ریلیکس ہو جائیں ماما! ابھی بھائی نے کچھ بھی طے نہیں کیا وہ سو فیصد رباب میں انٹرسٹڈ ہیں۔ اگر اس لڑکی کی طرف ان کا دھیان ہوتا تو وہ انیکسی میں نہ سڑ رہی ہوتی۔ ابو نے واقعی مجبور کر دیا ہو گا بھائی کو۔"

ایزد نے انہیں بانہوں کے گھیرے میں لے کر نرمی سے آہستہ آہستہ سمجھانا شروع کیا تو ان کا دل کچھ قابو میں آنے لگا۔ جبکہ زارا کا دل کچھ اور ہی اوہام کا شکار ہو رہا تھا۔



نئی جگہ کی وجہ سے اسے نیند کا بہت مسئلہ تھا۔ پھر رات گئے تک ڈھولک اور شور شرابے کی وجہ سے مارے باندھے اسے بھی بیٹھنا پڑا۔ اب اگر نیند آ ہی گئی تھی تو موبائل پہ لگا فجر کا الارم بولنے لگا۔

نیند ہی کی جھونک میں اس نے الارم بند کر کے سوچا کہ ابھی اٹھ کے نماز پڑھ لیتی ہوں مگر اس وقت شیطان نے نیند کے ایسے ہلورے دیے کہ وہ دوبارہ سو گئی۔ اس کے بعد اس کی آنکھ دوبارہ موبائل پر بجنے والی میسج ٹون سے کھلی۔

"اگر نماز نہیں پڑھی تو پڑھ لو۔ پندرہ منٹ باقی ہیں۔" عون کا میسج تھا۔ وہ شیطان پر لاحول پڑھتی جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

دوسرا میسج آیا۔

"اگر نماز پڑھ چکی ہو تو لان میں آجاؤ۔ واک کے لیے چلتے ہیں۔"

وہ واش روم کی طرف بھاگی۔ نماز کا وقت واقعی تنگ ہو رہا تھا۔ دوسرے بیڈ پر ارم بے سدھ سو رہی تھی۔

نماز پڑھنے کے بعد بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگ کر اس نے کارپٹ پر بچھی سفید چادر اٹھا کر تہہ کی اور اپنے بیڈ پر رکھ دی۔ کمرے میں ہنوز نائٹ بلب آن تھا اور وہ کوشش کے باوجود جائے نماز ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔

عون کے ساتھ واک پر جانے کے متعلق اس نے ذرا سا سوچا پھر موبائل اٹھا کر اسے میسج کیا۔

"کیا تم ابھی بھی لان میں ہو؟"

"ہاں۔ تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہوں۔" عون کا جواب فوراً" آیا تھا۔

وہ اپنا موبائل تکیے کے نیچے گھسیٹر کر شانوں پہ دوپٹا ٹھیک کرتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ پورے گھر پر خاموشی کا راج تھا۔ پتا نہیں رات کو اتنے شور ہنگامے اور دیر سے سونے کی وجہ سے کوئی نماز کے لیے اٹھا بھی تھا یا نہیں۔

وہ خاموشی سے لان میں چلی آئی۔

سفید ٹراؤزر اور اسکائی بلیو ٹی شرٹ میں وہ بہت فریش اور نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ ثانیہ کو آتے دیکھ کر ہونٹوں پہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ وہ ذرا سی کنفیوز ہوئی۔

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لیے سوچا تمہاری آفر سے فائدہ اٹھا ہی لیا جائے۔" وہ کھل کے مسکرایا۔
"تو میں نے کب کہا کہ کچے دھاگے سے بندھے سرکار چلے آئے ہیں۔" اس کا انداز ذو معنی تھا۔ ثانیہ اسے ہلکا سا گھور کر واپس پلٹنے کو ہوئی۔
"اگر صبح صبح میری طنزیہ کلاس لینے کا ارادہ ہے تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔"
"ارے۔۔۔ رے۔۔۔" عون نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا مشکل ہے یار! ذرا سا مذاق بھی برداشت نہیں کرتی ہو۔ چلو اب۔"
چوکیدار کو مطلع کر کے دونوں گیٹ سے باہر نکل آئے۔
"یہاں تو سردی ہو رہی ہے۔ ابھی اکتوبر اسٹارٹ ہوا ہے۔ کراچی میں تو ابھی کسی کو پتا بھی نہیں سردی کا۔" ثانیہ پر باہر نکلتے ہی ہلکی سی کپکپی طاری ہوئی تھی۔ تھوڑی دور دونوں خاموشی سے چلے۔ آسمان پر اندھیرے کو چیرتی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔
"میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میں یہاں نہیں آنا چاہتی۔ دیکھ لیا تم نے یہاں کا ماحول۔۔۔؟" ثانیہ ہی نے ناراضی سے اس خاموشی کو توڑا تھا۔
"کم آن ثانی! ماحول آدمی خود بناتا ہے۔ چار دنوں کے لیے آئے ہیں ہم دونوں۔ ہنسو' کھیلو مزا کرو۔ پھر تو یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔" عون نے اسے سمجھایا۔
"ہاں۔ اچھی بھی اور بری بھی۔" وہ اسی موڈ میں تھی۔
"کھلے دل کی چھلنی میں چھان کے لے کے جاؤ گی تو اچھی یادیں ہی چھن کے جائیں گی مگر تنگ دلی کی چھلنی میں چھانو گی تو دونوں ہی ساتھ جائیں گی۔ اب یہ تم پہ منحصر ہے کہ واپسی پہ کیا ساتھ لے کے جانا چاہتی ہو۔"
"ارم جیسی لڑکی کے ساتھ اتنے دن رات گزار کے میں واپسی پہ ایک سڑا ہوا دل ہی لے کر جا سکتی ہوں۔" ثانیہ نے منہ پھلایا۔

"اچھی خاصی تو ہے وہ۔۔۔ تمہیں کیا کہتی ہے؟" عون نے اسے بہلانا چاہا۔
"ہاں۔ تمہیں تو وہ پہلے سے ہی اچھی خاصی لگتی ہے۔" ثانیہ نے طنز کیا۔ عون گڑبڑایا اور رک کر اسے گھورنے لگا۔
"لاحول ولا۔۔۔"
"اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ لو تو میری باتوں پہ ایمان لے آؤ گے عون عباس!" وہ جتانے والے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ چند لمحوں کے لیے عون وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے چل رہی تھی۔ عون سائیڈ سے نکل کے ایک دم اس کے سامنے آگیا۔
وہ اس سے ٹکراتے ہوئے بچی۔
"یہ کون سا اسٹائل ہے واک کرنے کا۔" ثانیہ برا مان کر بولی۔ وہ رک گئی تھی۔
"بڑا یقین ہے تمہیں اپنے اندازے پر۔ تو ذرا میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھو! کس کا عکس ہے' کس کے خواب اور کس ساتھ کی تعبیریں ہیں؟"
عون نے اس کی خفگی کی پروا کیے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جذب سے کہا تو ثانیہ نگاہ نہیں چرا پائی۔ وہ جو قدرت نے اس کے نصف بہتر کے طور پر اس کی زندگی میں شامل کیا تھا' صبح کی اس تازگی کا حصہ بنا

بہترین لگ رہا تھا۔ چمکتی بھوری آنکھوں میں ثانیہ نے واضح طور پر اپنا عکس دیکھا تو دل اس سرپھرے پر ایمان لانے کو بے تاب ہونے لگا۔ عون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ثانیہ کا دل یوں دھڑکا کہ قیامت کردی۔

"مان جاؤ نا یار! یقین کرو۔ سگریٹ تک نہیں پیتا ہوں۔" بڑی معصومیت سے عون نے اپنی سب سے بڑی خوبی بتائی تو وہ جو ثانیہ پہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت تھی' ٹوٹ گئی۔ خجل سی ہو کر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"بدتمیز.....!" وہ واپسی کے لیے مڑ گئی۔ عون ہنستا ہوا اس کے پیچھے لپکا تھا۔

"دائیں یا بائیں.....؟" اگلے موڑ پہ وہ الجھی۔

"پتا نہیں۔ میں نے تو راستوں کا دھیان ہی نہیں کیا۔ میرا سارا دھیان تو تمہاری طرف تھا۔" عون نے اطمینان سے کہا۔ تو وہ جل کر بولی۔

"اچھا میاں رومیو! مبارک ہو۔ ہم یقیناً "راستہ بھٹک چکے ہیں۔ موبائل نکال کے فاران بھائی کو کال ملاؤ۔"

"اچھا۔ لاؤ دو موبائل....." عون نے ہاتھ بڑھایا تو وہ چلا اٹھی۔

"کیا مطلب..... تم موبائل بھی ساتھ نہیں لائے؟"

"واک پہ موبائل کا کیا کام۔ خوامخواہ کی ڈسٹربنس۔" وہ بے نیازی سے بولا تو وہ تھک کے ایک گھر کے باہر بنی کیاری کی اونچی دیوار پہ ٹک گئی۔

"اب کیا کریں گے۔ مجھے تو بھوک لگنا شروع ہو گئی ہے۔"

"یہ صدماتی بھوک ہے۔ جو گھر سے دوری کے احساس سے لگ رہی ہے۔ تم فکر مت کرو۔ ابھی کوئی ہمیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آجائے گا۔"

وہ شرارت سے کہتا ثانیہ کی جان جلا گیا۔ وہ منہ پھلا کر بیٹھ رہی۔



سفینہ کی تو جیسے جان پر بن آئی تھی۔

امتیاز احمد کے ساتھ ایبہا کے بیوگی کے رشتے کا سوچ کر وہ جلتے ہوئے توے پر جا بیٹھی تھیں اور یہاں تو ایک جیتا جاگتا رشتہ نکل آیا تھا۔

صالحہ مراد کی بیٹی اور ان کے ہیرے جیسے بیٹے کی بیوی۔ وہ کل سے سوچ سوچ کر تڑپ رہی تھیں۔

ان کا ارادہ تھا کہ وہ ایبہا کو ڈرا دھمکا کر جائیداد کا حصہ واپس بٹور کر اسے یہاں سے بھگا دیں گی۔ ان کے خیال میں اس کا کون سا کوئی والی وارث یہاں پوچھ پچھ کرنے کو بیٹھا تھا۔

اور اب.....؟

وہ لاوارث' بے نام و نشان' بیوہ.....

ایک دم سے لال جوڑا پہنے سہاگن کے روپ میں ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور اس کے پہلو میں کوئی اور نہیں' ان کا لاڈلا معیز احمد تھا۔ ان کے گھرانے کی شان۔ ان کا غرور' ان کا مان' اور اب جو بھی فیصلہ کرنا تھا وہ معیز احمد ہی کو کرنا تھا۔

تو کیا وہ اپنی ماں کی من مرضی کا فیصلہ کرے گا؟

جو لڑکا اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس کی وصیت پر ہو بہو عملدر آمد کرنے کے لیے اسے اس گھر میں اس کا حق دلانے کے لیے لے آیا تھا۔۔۔۔ وہ باپ کے کہے کے مطابق ہی چلے گا۔ سفینہ پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔
وہ اچھی طرح جانتی تھیں 'معیز باپ سے کس قدر پیار کرتا ہے۔ سوفی الحال تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے پر ہی مجبور تھیں۔ انہیں تو ایبہا کو کوسنے اور بددعائیں دینی بھی یاد نہیں رہی تھیں۔



مسلسل بجنے والے الارم نے ارم کو بدمزا ہو کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے نیند سے بھری آنکھوں سے ثانیہ کے بستر کی طرف دیکھا۔ اسی کے موبائل کا الارم بج رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر تکیہ پرے کیا اور موبائل اٹھا کر الارم بند کر دیا۔
اس کا ارادہ موبائل رکھنے کا ہی تھا مگر پھر تجسس کے مارے اس نے ایک نظر واش روم کو دیکھا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا یعنی ثانیہ یہاں نہیں تھی۔
ثانیہ کے بستر پر نیم دراز ہوتی' وہ اس کے موبائل کا ان باکس چیک کرنے لگی۔
عون کا صبح والا میسج سامنے آتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔
"اوہ تو موصوفہ واک کے لیے گئی ہیں۔" وہ مزید اطمینان سے اپنے کام میں لگ گئی مگر بے اطمینان ہی ہوئی۔
عون کے ہر میسج سے جھلکتا پیار' بے خودی اور بے اختیاری اس کے دل کو جلا کر راکھ کر رہی تھی۔
اس نے آؤٹ باکس میں ثانیہ کے میسجز بھی چیک کیے جو اس نے عون کو بھیجے تھے۔
اب اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
عون کی بے قراری اور ثانیہ کی بے نیازی۔
عون کی محبت اور ثانیہ کا پہلو بچانا۔
شیطان سب سے زیادہ خوش تب ہی ہوتا ہے جب میاں بیوی کے رشتے میں دراڑ ڈالتا ہے۔ اسی لیے میاں بیوی کو ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے کے اتنے نزدیک ہونا چاہیے کہ درمیان میں کسی تیسرے کی گنجائش نہ نکل سکے۔
خاص طور پر شیطان کی۔
مگر اس وقت شیطان نے وہ ہلکی سی دراڑ ڈھونڈ لی تھی۔
موبائل کو ویسے ہی تکیے کے نیچے رکھ کر ارم وہاں سے اٹھی تو بہت کچھ سوچ رہی تھی۔



ایبہا پر خوف کی کیفیت طاری تھی۔
پہلے سفینہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی تھیں اور اب جبکہ اس نے بے اختیار ہی انہیں حقیقت بتائی تو۔۔۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ معیز اور اس کے رشتے کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھیں۔
"یا اللہ رحم۔۔۔۔"
فجر کی نماز کے بعد تسبیحات کا ورد کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔
وہ بے وقوف تھی۔ اس نے خود کو کمزور تصور ہی نہیں 'تسلیم بھی کر لیا تھا۔ اور انسان ہارتا تب ہی ہے جب

ہار مان لیا کرتا ہے۔
وہ معیز احمد کے نکاح میں تھی اور جب تک تھی تب تک تو اسے ثابت قدمی اور مضبوطی دکھانی چاہیے تھی۔
مگر وہ خود کو کارپٹ بنا رہی تھی اسی لیے سب ہی اس کے اوپر چڑھتے چلے آرہے تھے۔
اس نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھا کر ڈھیروں دعائیں مانگ ڈالیں۔



وہ ناشتے کی ٹیبل پر پہنچی تو عون اور ثانیہ موجود تھے اور شاید وہی دونوں موضوع گفتگو بھی تھے۔
"اس نے جھوٹ بولا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔" ثانیہ خفا سی تائی جان سے بولی۔ عون ہنسا۔
"واپس بھی تو میں ہی لایا ہوں۔ بیویوں کو شوہروں پر اعتبار ہونا چاہیے۔ کیوں تائی جان.....؟"
وہ شرارت سے بولا تو ثانیہ سے نگاہ اٹھانا محال ہوا۔ تایا جان اور فاران بھائی بھی ٹیبل پر موجود تھے۔
تائی جان نے بے اختیار ارم کے بے تاثر چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ خاموشی سے گلاس میں جوس انڈیل رہی تھی۔
وہ گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔ پھر عون کو ہلکی سی سرزنش کی۔
"وہ اگر پسند نہیں کرتی تو کیوں زبردستی کرتے ہو۔ خوامخواہ موڈ خراب کیا اس کا۔" ثانیہ نے چڑانے والے انداز میں مسکرا کر عون کو دیکھا۔
"ہاہ..... زبردستی.....؟" وہ آہ بھر کے رہ گیا۔
"بھئی باقاعدہ پروگرام بناؤ تو میں لے چلتا ہوں کہیں۔ کیوں ثانیہ.....؟"
باقاعدگی سے آفس جانے والے فاران کے منہ سے یہ پیشکش بہت غیر متوقع تھی۔ ابھی پرسوں ہی تو وہ اس ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا چکا تھا..... پھر یہ مہربانی؟
بظاہر ناشتے میں مصروف عون نے ساتھ بیٹھی ثانیہ کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ کے دبایا۔
انداز یہی تھا کہ فوراً" انکار کردو۔ مگر بھاری بوٹ تلے اس کا نازک سا پاؤں چرمرا کر رہ گیا۔ تو وہ عون سے بدلہ لینے کے لیے بڑی فرماں برداری سے بولی۔
"جی ضرور فاران بھائی! نیکی اور پوچھ پوچھ۔"
"انہیں کہاں تنگ کرتی پھرو گی۔ میں ہوں نا فارغ اور پھر ہم تو یہاں آئے ہی تفریح کے لیے ہیں۔"
عون نے ہلکے پھلکے مگر تنبیہی انداز میں کہتے ہوئے ثانیہ کو دیکھا تو وہ طنزیہ بولی۔
"تمہارا کیا اعتبار۔ کل کلاں پھر راستہ بھول گئے تو؟"
سب کی مسکراہٹ پر عون اندر ہی اندر تلملا کر رہ گیا۔ مگر فی الحال تو اس سرپھری کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا' اس لیے خون کے تو نہیں جوس کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔



سفینہ ناشتے کی ٹیبل پر قدرے بہتر دکھائی دیں تو معیز نے اللہ کا شکر ادا کیا۔
ایزد اور زارا کا موڈ بھی صحیح تھا۔
"تمہارا رزلٹ کب تک آرہا ہے؟"
معیز نے ایزد سے پوچھا۔ زارا حسب عادت و معمول دونوں بھائیوں کو بریڈ پر جیم لگا کے دے رہی تھی۔
"اس ماہ کے آخر تک ان شاء اللہ....." ایزد مسکرایا۔

"تو یہ بھی بتادو پھولوں کے ہاروں کا بندوبست کیا جائے یا۔۔۔" زارا نے شرارت سے اسے دیکھا۔
"بے فکر رہو۔ پھولوں کے ہی ہار ہوں گے۔ بلکہ اپنی فرینڈز کو بھی ریڈ الرٹ دے دو۔ شاید انہی ہاروں کے درمیان پھولوں کا سہرا بھی ہو۔" وہ کون سا کم تھا' برجستہ بولا زارا نے منہ بنایا۔
ان دونوں کی ہلکی پھلکی نوک جھونک کے درمیان ناشتا ختم ہوا۔ معیز اٹھنے کی تیاری میں تھا' جب سفینہ نے اس سے پوچھا۔
"تم نے کیا سوچا ہے اپنے فیوچر کے بارے میں؟" وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔
ایزد اور زارا بھی خاموش ہو کر ماں کا چہرہ دیکھنے لگے۔ وہ جو کچھ پلان کرتی تھیں' کسی سے ڈسکس نہیں کرتی تھیں۔ بس ایک دم سے آدمی کے سامنے لا رکھتیں۔
"کیا مطلب ماما۔۔۔؟"
معیز نے تجاہل عارفانہ برتا۔ وہ فی الحال تو اس موضوع کو چھیڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ نری ٹینشن اور درد سر۔۔۔ مگر سفینہ اس طرح بھڑکیں گی یہ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔
"مطلب یہ کہ وہ گندگی کی پوٹ کب تک تمہارے ساتھ چمٹی رہے گی۔ تم اسے طلاق دے کے فارغ کب کر رہے ہو؟" وہ چیخ کر بولیں۔
چھوٹے بھائی بہن کے سامنے ماں کے اس انداز پر معیز کے چہرے کی رنگت بدلی تھی۔ وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔
"میں اسے یونہی طلاق نہیں دے سکتا۔ ابو نے وصیت میں مجھے پابند کیا ہے۔"
"تو کیا اپنی بات منوانے کے لیے مجھے بھی مرنا پڑے گا اور تمہارے لیے ایک وصیت چھوڑنی پڑے گی؟" سفینہ غصے سے اونچی آواز میں بولیں۔
ایک عرصہ تک انہوں نے امتیاز احمد جیسے مرنجان مرنج شخص پر حکمرانی کی تھی۔ یہ دبنگ انداز ان کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ گرچہ انہوں نے کبھی اپنے بچوں سے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔
مگر حالات۔۔۔ یہ حالات ہی ہوتے ہیں' جو بڑے بڑوں کے ٹھنڈے مزاج کو سوا نیزے پر پہنچا دیتے ہیں۔
"ماما پلیز کیوں اپنا موڈ خراب کر رہی ہیں اور گھر کا ماحول بھی۔" معیز نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی خاطر احساس دلایا۔
"گھر کا ماحول تو خراب ہو چکا معیز احمد! ایک جوئے میں ہاری ہوئی لڑکی میرے گھر کی بہو بن کے آچکی ہے۔ اس سے بڑھ کر ماحول کی خرابی اور کیا ہو گی۔" وہ تلخی سے بولیں تو معیز کے گویا کانوں تک سے دھواں نکلا۔
"وہ محض ایک کاغذی کارروائی کے ذریعے اس گھر میں آئی ہے ماما! جو وقت کی ضرورت تھی۔ اس سے آگے اس کا ہم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔"
"آپ غلط سمجھتے ہیں بھائی!" ایزد نے سنجیدگی سے بحث میں حصہ لیا تو وہ کرنٹ کھا کر اسے دیکھنے لگا۔
"ہر رشتہ آفاقی رشتہ ہے۔ ماں باپ بھائی بہن۔ ان رشتوں کو محض زبان سے کہہ دینا ہی ان کا ہونا ظاہر کر دیتا ہے مگر میاں بیوی کا رشتہ ہی فقط ایسا ہے' جس کو اس دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے کاغذ پر اتارا جاتا ہے۔ باقاعدہ سائن ہوتے ہیں' ایجاب و قبول اور گواہوں کے بغیر یہ رشتہ مکمل نہیں ہو پاتا۔ تو یہ تو پھر ایک کڑی حقیقت ہوا نا محض کاغذی کارروائی کیسے؟" وہ منتظر نظروں سے معیز کو دیکھ رہا تھا۔
اور لمحہ بھر کو معیز کو لگا کہ وہ کبھی کچھ نہیں کہہ پائے گا۔

"جانے والا تو چلا گیا۔ تم اپنا نفع نقصان دیکھو۔" سفینہ کے لب و لہجے میں اس کی خاموشی کو دیکھ کر ایک واضح ٹھہراؤ آیا تھا۔

"وہ خود یہاں سے چلی جائے گی ماما! میں بھی اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتا۔ یا پھر بہتر ہوگا کہ آپ ہی کوئی لڑکا دیکھ کر اس کا رشتہ طے کردیں۔ میں ابو کی وصیت کو ہر حال میں نبھانا چاہتا ہوں۔ جب اس کے رشتے کی کوئی صورت بنے گی۔ میں اسی وقت اسے آزاد کردوں گا۔"

وہ بدقت تمام اپنا لب و لہجہ نرم رکھتے ہوئے بولا اور پھر وہاں ایک پل مزید نہیں ٹھہرا اور اٹھ کر چلا گیا۔ سفینہ پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھے گئیں۔ ایزد دوستوں کی طرف نکل گیا۔

"مجھے تو یہ سوچ کر ہول اٹھتے ہیں کہ اب رباب کا کیا بنے گا۔ گھر بھر کی لاڈلی ہے وہ۔ کوئی اس کا دل دکھانے کا سوچتا تک نہیں۔ سفیر تو وہاں سے بھی مسلسل اس کی نازبرداری کی ٹپس دیتے رہتے ہیں مجھے۔" زارا نے تفکر سے کہتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

"بے فکر رہو...... کرتی ہوں اس ناگن کی اولاد کا کوئی بندوبست۔" وہ کڑوے لہجے میں بولی تھیں۔

زارا کی فکر تو ختم نہیں ہوئی مگر وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئی۔

درحقیقت اس کا دل اوہام کا شکار ہونے لگا تھا۔ رباب کو معیز اور ایبہا کے رشتے کا پتا چلنے سے پہلے اس رشتے کا ختم ہونا اشد ضروری تھا۔

سفینہ نے ملازم کو آواز دی تو وہ فوراً" حاضر ہوئی۔

"جی بیگم صاحبہ......"

"نذیراں! ذرا انیکسی والی لڑکی کو بلا کر لاؤ یہاں......" وہ تحکمانہ انداز میں بولیں تو الفاظ سلگ رہے تھے۔

نذیراں ہلکا سا سر جھکا کر تیزی سے باہر کو لپکی۔ سفینہ کرسی کھسکا کر اٹھیں اور شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے لاؤنج میں آئیں۔

ذرا سی دیر میں وہ نذیراں کے ہمراہ وہاں موجود تھی۔

ڈری' سہمی' خوفزدہ ہرنی۔

سفینہ کا حوصلہ اور بڑھا۔ اسے تو وہ چٹکی میں مسل سکتی تھیں۔

انہوں نے منتظر نظروں سے اپنی طرف دیکھتی ایبہا کو لفٹ نہیں کرائی اور بڑے اطمینان سے نذیراں سے بولیں۔

"اسے اپنے ساتھ لگاؤ۔ ڈسٹنگ وغیرہ کا طریقہ بتاؤ اور سارے کاموں کی تفصیل بھی جو تم کرتی ہو۔ کل سے یہ تمہارے ساتھ کام کرے گی۔"

"جی بیگم صاحبہ......" نذیراں کا منہ کھلے کا کھلا تھا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس اس چمکتی رنگت والی لڑکی کو بے یقینی سے دیکھا۔ جو خود بھی متحیر اور بے بس سی کھڑی تھی۔

"جو میں نے کہا وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا نذیراں؟" وہ غصے سے بولیں تو نذیراں گڑبڑائی۔

"ہلا بیگم صاحبہ! میں دسدی ہاں ایس نوں۔"

وہ ایبہا کو اپنے ساتھ لے گئی تو سفینہ نے دونوں ہاتھ جھاڑے۔

ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی پرسکون سی مسکراہٹ تھی۔



"ٹیرس پہ آؤ۔ موسم بہت اچھا ہو رہا ہے۔"

ثانیہ کے موبائل پر عون کا میسج آیا۔ ثانیہ کو موبائل ساتھ لیے پھرنے کی عادت نہیں تھی۔ ابھی سب ڈھولکی پر اکٹھے ہوئے تو وہ موبائل کمرے ہی میں چھوڑ گئی تھی۔

ارم کمرے میں آئی تو تکیے کے پاس پڑا موبائل اٹھا کر حسب عادت میسیجز چیک کرنے لگی۔ تب ہی عون کا میسیج آیا تھا۔

لڑکے اس محفل میں شریک نہیں تھے۔ تب ہی عون یقیناً" ٹیرس پہ چلا گیا تھا۔ ارم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں گئی، جہاں نازیہ کی دوستوں اور کزنز نے شور وغل مچا رکھا تھا۔ پھر ایک نظر سب پر ڈالتی اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

ثانیہ نے کچھ دیر پہلے عون کو اوپر جاتے دیکھا تھا۔ مگر چونکہ لڑکیوں کے کمرے اوپر ہی تھے۔ اس لیے اس نے خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ ابھی بھی اسے نیند آرہی تھی۔ وہ نیلم کے کان میں بتاتی معذرت کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی۔ چینج کرنے کے بعد اس کا ارادہ سونے کا تھا۔ اس نے عادتاً" موبائل اٹھایا۔ ارادہ مسڈ کالز چیک کرنے کا تھا۔ ساتھ ہی میسیجز پر بھی ایک نظر ڈالی۔

عون کا میسیج دیکھ کر اس نے ہلکا سا منہ بنایا۔ پھر موبائل واپس بستر پر ڈال دیا۔

اس کا ٹیرس پہ جانے کا قطعاً" موڈ نہیں تھا۔

وہ کپڑے تبدیل کرنے کے ارادے سے پلٹی۔ مگر ذہن میں ایک ہلکی سی سنسناہٹ ہوئی۔۔۔ عون کا میسیج ان ریڈ نہیں تھا۔ یعنی ثانیہ سے پہلے کوئی اس میسیج کو پڑھ چکا تھا۔

اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے یاد آیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ارم ٹیرس ہی کی طرف گئی تھی شاید۔۔۔۔

فنکشن تو نیچے تھا۔ پھر ارم کا اوپر کیا کام؟" وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی خود کو "مجھے کیا؟" کہہ کر لاپروا نہیں بن پائی تو جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔



اوپر موسم واقعی بہت اچھا ہو رہا تھا۔ عون کا دل چاہا اس پل ثانیہ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔

اسے یقین تو نہیں تھا۔۔۔ مگر دل کو ایک خوش فہمی سی تھی کہ شاید وہ آہی جائے۔

وہ دیوار پہ بازو جمائے دور سڑک پر ٹریفک کی چمکتی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ جب پیچھے سے دو نرم و ملائم سے ہاتھ اس کی آنکھوں پر جم گئے۔

عون کے ہونٹوں پر دلفریب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے ثانیہ کی آمد کا یہ اسٹائل بہت بھایا تھا۔

دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے وہ بڑی ترنگ میں پلٹا تو سامنے ثانیہ کی جگہ ارم کو پاکر لحظہ بھر کو بھک سے اڑا۔

"تم۔۔۔۔ یہاں کیا کر رہی ہو؟" عون کے انداز میں بے یقینی و ناگواری تھی۔ اسے ارم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے والی جسارت پسند نہ آئی تھی۔

"یونہی میرے دل نے کہا کہ تم اوپر تنہا ہو تو میں کھنچی چلی آئی۔"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی دیدہ دلیری اور جذب کی سی کیفیت میں بولی۔ تب ہی عون کو احساس

ہوا کہ اس نے غلط فہمی سے ارم کے جو ہاتھ پکڑے تھے وہ ابھی تک نہ صرف اس کے ہاتھوں میں تھے بلکہ اب ان کے ہاتھوں پر ارم کی گرفت بھی ہو چکی تھی۔

وہ اسے جھٹکنا' سخت سست کہنا چاہتا تھا۔ اسی وقت اس کی نگاہ سیڑھیوں پر پڑی جہاں سے ثانیہ کا چہرہ نمودار ہوا تھا اور وہ بے یقینی سے ان دونوں کو ہاتھوں میں ہاتھ دیے کھڑا دیکھ رہی تھی۔



ایبہا کا دکھ اور دکھ سے بڑھ کے بے یقینی حد سے سوا تھی۔ سفینہ بیگم اسے اس طرح ذلیل کریں گی۔ یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ گھر کی ملازمہ نذیراں بھی حیران تھی۔ وہ پنجاب سے آئی تھی۔

"بی بی جی! تساں نوں کیہ مجبوری پے گئی اے کم کرن دی؟" وہ اسے روزمرہ کے کام' صفائی ستھرائی اور ڈسٹنگ سمجھانے کے دوران کئی مرتبہ پوچھ چکی تھی۔

مگر ایبہا تو ایک صدماتی چپ کے زیراثر تھی۔ اپنی اس قدر تذلیل پر اس کے آنسو بھی مارے دکھ کے جم سے گئے تھے۔

معیز احمد کے ساتھ اس کا رشتہ جاننے کے بعد سفینہ بیگم نے اس پر جتلا دیا تھا کہ وہ اس رشتے کو ٹھوکر پہ رکھتی ہیں اور ایبہا کی اہمیت ان کے نزدیک ملازمہ سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

"تساں تے ایڈے سوہنے کپڑے پائے ہوئے نے۔ کم کرن ویلے تے اپنے پرانے کپڑے پا کے آؤنا۔ ایناں دا تے ستیاناس ہو جائے دا۔"

نذیراں نے بہت مخلص ہو کر اسے "کام والے" کپڑے پہن کر آنے کی ٹپ دی تھی۔ وہ کہہ نہ سکی جب نصیب ہی خراب ہوں تو کپڑوں کے اچھے برے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ مسلسل تکلیف میں تھی۔

خدا آپ کو اشرف المخلوقات بنائے مگر اس کے بندے آپ کی ذات کی یوں نفی کریں کہ آپ کو بالکل زیرو بنا دیں۔ تو اس سے زیادہ دکھ اور تکلیف کی بات اور کیا ہو سکتا ہے؟

مگر انسان زیرو کب بنتا ہے؟

جب وہ بنا کوشش کیے' بنا ہاتھ پاؤں مارے خود کو حالات کے تند و تیز دھارے پر چھوڑ دیتا ہے۔

جیسے تیرنا نہ بھی آتا ہو' ایک بار تو وہ بھی ہاتھ پاؤں مار کر خود کی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کے اکاؤنٹ میں پچاس لاکھ روپے تھے۔ اس کا ماہانہ جیب خرچ دس ہزار مقرر ہوا تھا اور وہ ماسی بننے کی تیاری میں تھی... تو اس میں قصور سفینہ بیگم کا تھا یا ایبہا معیز احمد کا...؟ اس کے نام کے ساتھ معیز احمد کا نام لگا تھا... اور وہ اپنی اس حیثیت کو چیلنج کرنے کی ہمت مجتمع نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نام کا سہارا دے کر کیا اللہ نے اسے ہمت کرنے کا موقع نہیں دیا تھا؟ اللہ بھی ان کی مدد کیا کرتا ہے... جو اپنی مدد آپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر وہ بیٹھی رونے لگی۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ اب یہی اس کا نصیب ہے۔

افسوس... صد افسوس۔



لمحہ بھر کی شاکڈ کیفیت کے بعد وہ یک لخت حواس میں آیا تو ارم کے ہاتھ جھٹک کر واپس پلٹتی ثانیہ کی طرف

بڑھا۔

"ثانی... ثانی! میری بات سنو۔" وہ مگرر کی نہیں تھی۔

"وہ دل پہ پاؤں رکھ کے گزر جانے والوں میں سے ہے عون عباس! بس کردو کیوں اپنے انمول جذبوں کو مٹی میں رول رہے ہو۔"

ارم کی پُرسکون سی آواز نے عون کو رُکنے پر مجبور کردیا۔ وہ تلملا کر اس کی جانب آیا۔

"شٹ اپ ارم! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم چاہتی کیا ہو۔ ذو معنی جملے' گھٹیا انداز... اگر یہ سب مجھے چارم کرنے کے لیے ہیں تو آئم سوری۔ آئم ناٹ انٹرسٹڈ۔" وہ بے حد تلخی سے اسے جھاڑتے ہوئے بولا۔

مگر وہ یونہی فدا ہونے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے عون کی زبان سے تلخ گفتگو نہیں بلکہ پھول جھڑ رہے ہوں۔

"میں تمہارے جذبوں کی اس طرح تذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتی عون! جیسے ثانیہ کرتی ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے عون عباس کیا ہے؟ میں تو اسے اٹھا کر دل میں رکھ لوں' آنکھوں میں بسالوں۔" ارم کی بے باکی کی شاید کوئی حد نہ تھی۔ مرد ہو کر بھی عون کو اس کی ہٹ دھرم سی بے حیائی سے خوف آیا۔

"یو میڈ...!"

حقارت سے کہہ کر وہ وہاں رکا نہیں تیزی سے سیڑھیاں اُتر گیا تھا۔

ارم نے اطمینان سے ایک گہری سانس بھری اور دھیمی آواز میں گنگناتے ہوئے ٹہلنے لگی۔

تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں...



سفینہ بیگم نے اگلے روز بہت ہوشیاری کے ساتھ معیز اور ایزد کے جانے کے بعد نذیراں کو بھیج کر ایبہا کو بلوایا۔ مگر زارا تو امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد اب گھر میں ہی تھی۔ اس لیے اس سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں ماما... اس کا یہاں کیا کام؟" نذیراں کے جاتے ہی زارا نے حیرت و بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔

"بس چپ رہو اب تم لوگ۔" سفینہ بیگم اسے جھڑکنے والے انداز میں بولیں۔

"جو کچھ کرنا تھا تم لوگ کر چکے۔ اب میری باری ہے۔" زارا کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموش مگر مضطرب سی بیٹھ گئی۔

نذیراں کے پیچھے ایبہا آئی۔

"یہ ٹیبل سمیٹو لڑکی! اور پہلے جا کر برتن صاف کرو اور اس کے بعد جو نذیراں کہے۔" سفینہ بیگم نے تنفر سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"ماما...!" زارا ہلکی آواز میں انہیں پکار کر رہ گئی مگر وہ اس کی طرف متوجہ ہی کہاں تھیں۔

ان کی نگاہ تو شکرے کی طرح اپنے شکار پر تھیں۔ ان کی آنکھ کا اشارہ پا کر نذیراں وہاں سے ہٹ گئی۔ لرزتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ایبہا نے برتن سمیٹنے شروع کیے۔

نادانستگی میں ہی سہی... مگر اس نے اپنی حیثیت تسلیم کرلی تھی۔

وہ برتن ٹرے میں رکھ کر کچن میں لے گئی۔

"ماما! یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ وہ بھائی کی بیوی ہے۔" زارا نے اس کے جاتے ہی احتجاج کیا تو انہوں نے فی الفور اسے ٹوکا۔

"بیوی نہیں منکوحہ اور وہ بھی زبردستی کی۔"

"بھائی کو پتا چلا تو وہ....."

زارا کو سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنی ناگواری کیسے بیان کرے تو معیز کا نام لے دیا۔ اسی وقت ایبہا کچن میں سے کپڑا لے کے آئی اور یقیناً "نذیراں کی ہدایت کے مطابق ڈائننگ ٹیبل صاف کرنے لگی۔

اس کی زردی گھلی رنگت زارا سے مخفی نہیں تھی۔

"تم اپنے بھائی کی فکر میں دبلی مت ہو۔ اس کی کون سی لو میرج ہے' جو اسے برا لگے گا۔ وہ تو خود اسے یہاں سے بھگانا چاہتا ہے اور اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہے اس گندگی کو باہر پھینکنے کا۔"

سفینہ بیگم ناگواری سے بولیں تو کچن کی طرف جاتی ایبہا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔



وہ آج ثانیہ کو شکر پڑیاں لے جا رہا تھا۔

رات ٹیرس سے نیچے آکر اس نے ثانیہ کے کمرے میں جا کر وضاحت کرنا چاہی مگر اس کا دروازہ لاکڈ تھا۔ عون نے اپنے کمرے میں جا کر فون کیا' تب بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔

"میں نے تمہیں ٹیرس پہ بلایا تھا ثانی! تم اپنا ان باکس چیک کر سکتی ہو۔ میں نہیں جانتا' وہ بلا کیسے اوپر پہنچ گئی۔"

عون نے میسیج کیا تھا۔

اور یہ سب تو ثانیہ بھی جان چکی تھی۔ تب ہی تو بے اختیار ارم کے پیچھے اوپر گئی تھی۔ مگر پھر بھی عون اور ارم کو یوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے کھڑے دیکھ کر اس کو شاک لگا تھا۔

"کل بات کریں گے۔ تم میرے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جا رہی ہو۔ پلیز انکار مت کرنا۔"

عون نے درخواست کی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ انکار نہیں کر پائی۔

"اوکے.....!" ثانیہ نے جواب دیا تھا۔

اور اب جبکہ وہ تیار ہو کے آئی تو عون کا کہیں پتا نہ تھا۔

اس نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"تم نہیں گئیں بازار.....؟"

تائی جان اس کے اضطراب کو بھانپتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"نہیں بازار تو نہیں عون نے باہر چلنے کو کہا تھا۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"ارے! وہ تو ارم کو لے کر مارکیٹ گیا ہے۔ اس کے بعد اسے اس کی سہیلی کے ہاں لے جائے گا۔ تم بھی ساتھ چلی جاتیں اگر وہ کہہ رہا تھا تو۔"

تائی جان نے اطمینان سے کہتے ہوئے اس کا سارا اطمینان ملیامیٹ کیا تھا۔

اس کا چہرہ دہک اٹھا۔

وہ عون کو کال ملانے لگی۔ مگر مسلسل بیل جانے پر بھی وہ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ نیلم چلی آئی۔

"میں عون بھائی کے کمرے کی صفائی کروا رہی تھی۔ ان کا موبائل چارجنگ پہ لگا ہوا ہے۔ آپ کی مسلسل کالز آ رہی تھیں۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ثانیہ ایک دم خاموش ہوئی۔ اسی وقت تائی جان نے فاران کو آواز دی تھی۔

"کیا ہو گیا.... کہاں کی تیاری ہے؟"

"سب ادھر ادھر نکل گئے بھائی جان! ہمیں بھی کہیں گھمانے لے چلیں۔ کیوں ثانیہ آپی....." نیلم کو موقع غنیمت لگا۔

"ہاں، ہاں۔ لے جاؤ بہنوں کو۔"

تائی جان نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ثانیہ کا دل برا ہو چکا تھا۔ اس کا قطعاً "جانے کا موڈ نہیں تھا مگر تائی جان نے اتنا اصرار کیا کہ وہ شرم سار سی ہو کر نیلم کی ہمراہی میں فاران کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے جانے پر تیار ہو گئی۔ نیلم خوشی خوشی تیار ہونے بھاگی۔

وہ لوگ گیٹ سے نکل رہے تھے جب تایا جان کی گاڑی آئی جس میں ارم اور عون تھے۔

ان دونوں نے ان لوگوں کو دیکھا مگر فاران نے گاڑی روکنے کی زحمت نہیں کی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے نکل گیا۔ مگر ثانیہ عون کے تاثرات میں پہلے بے یقینی اور پھر غصہ اترتا دیکھ چکی تھی۔

سو اس نے ریلیکس ہو کر سیٹ سے ٹیک لگالی۔

"کہاں چلنا ہے ثانی! تم بتاؤ....."

فاران نے غیر محسوس کن انداز میں مرر اس پر سیٹ کرتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا تو وہ کچھ سوچ کر مسکرائی۔

"شکرپڑیاں ہی چلتے ہیں۔ وہیں کا پروگرام تھا آج کا....."

فاران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور ثانیہ مطمئن تھی۔ اس کا دل جلا تھا تو اس نے بھی عون کی جان جلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی.... ہم نہیں جانتے بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات ہم شیطان کو خود دعوت بربادی دے رہے ہوتے ہیں۔ گاڑی تیزی سے اسلام آباد کی سڑکوں پر گامزن تھی۔



ایزد دوستوں سے جلدی فارغ ہو کر گھر آ گیا تھا۔ اپنی ہی دھن میں مگن وہ سفینہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھا تو اندر سے نکلتی وہ لڑکی بری طرح ایزد سے ٹکرا گئی۔ اس کے ہاتھ میں تھامی پلیٹ اور گلاس دونوں ہی زمین بوس ہو گئے۔

ایپھا کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

نذیراں دوڑی چلی آئی۔

ایپھا تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ ایزد کچھ بت بننے کے سے انداز میں کھڑا تھا۔

"یہ..... یہ کون تھی؟"

اس نے نذیراں سے پوچھا۔ جو کانچ اکٹھا کر رہی تھی۔ اس روز عبایا میں ملفوف ایپھا کو محض ایک نظر دیکھنے کے بعد اب وہ پہچان نہیں پایا تھا۔

"یہ جی بیگم صاحبہ نے نویں کم والی رکھی ہے۔" نذیراں نے دانت نکوسے۔ تو ملازم کے اتنے حسین ہونے پر غور کرتا وہ ماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں ایپھا کا گھبرایا ہوا سا انداز تر و تازہ تھا..... اور اس کی خوب صورتی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

شیریں ملک



"امی! پلیز دے دیں نا۔ اگر آپ نے مجھے پیسے نہ دیے تو آپ جانتی ہیں دوستوں کے سامنے میری کتنی سبکی ہوگی۔ میں نے ان سے پرامس جو کرلیا ہے کہ میں بھی ان کے پروگرام میں شامل ہوں گا۔ جو انہوں نے چاند رات کو رکھا ہے۔ آپ میری پوزیشن کو سمجھیں نا۔" احمر کتنی دیر سے اپنی امی کی منتیں کررہا تھا۔ لیکن ان پر بالکل بھی اثر نہیں ہو رہا تھا اور وہ اسے یکسر نظر انداز کیے بڑی جانفشانی سے پالک کے پتے چن چن کر کاٹتی جارہی تھیں۔

"امی! پلیز چند روپوں کی ہی تو بات ہے۔" وہ بڑی لجاجت سے بولا۔

"بیٹا جی! اگر بات چند روپوں کی ہوتی تو آپ کی امی ذرا دیر نہیں لگاتیں۔ لیکن بات ہے دس ہزار روپے کی۔ جس کی گنجائش میں کم از کم اس مہینے میں تو ہرگز نہیں نکال سکتی۔ کیونکہ عید پہ آنے والے اخراجات کے لیے میرے پاس جو رقم ہے' وہ بھی کم پڑ رہی ہے۔ تو میں تمہیں کہاں سے دوں؟ تم خود سمجھ دار ہو۔ تمہیں گھر کے حالات کو مد نظر رکھ کر اپنے دوستوں سے وعدہ کرنا تھا اور پھر مجھ سے فرمائش کرنی تھی۔ دو' چار ہزار کی بات ہوتی تو میں کچھ کرلیتی۔ لیکن تم نے تو منہ پھاڑ کر اکٹھے دس ہزار ہی مانگ لیے۔ یہ سوچے بغیر کہ اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں گی۔ ابھی گھر والوں کے عید کے کپڑے بننے ہیں۔ چلو! میں اور تمہارے ابو تو جیسے تیسے گزارہ کرلیں گے۔ لیکن تم تینوں بھائیوں کے کپڑے تو بنوانے پڑیں گے نا اور ان شاء اللہ قربانی کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ پھر سوچو لگی بندھی آمدنی میں اتنے اضافی اخراجات کے ساتھ میں تمہاری فرمائش کیسے پوری کروں؟" وہ بڑے مصروف سے انداز میں اسے ایسے سمجھا رہی تھیں۔ جیسے وہ سمجھ ہی تو جائے گا۔

"امی! اب یوں ناشکری تو نہ کریں۔ ابو کی اتنی اچھی پے ہے۔ کیا ہوا جو آپ اس میں سے میرے لیے کچھ رقم دے دیں تو..." بات ابھی اس کے منہ میں ہی تھی۔ لیکن شائستہ کی خشمگیں نظروں پہ اسے چپ ہونا پڑا۔

"تمہیں یہ معلوم ہے کہ تمہارے ابو کی پے کتنی اچھی ہے۔ لیکن شاید تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ تم تینوں بھائی کتنے اچھے تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہو۔ سعد اور فہد کی تو چھوڑو۔ وہ تو ابھی فرسٹ ایر میں ہیں۔ لیکن تمہارے ایم بی اے پہ کتنا خرچ آرہا ہے۔ تمہیں شاید یہ اندازہ نہیں۔ تمہارے ہر سمسٹر کی فیس بھرنے کے لیے مجھے کتنی ضرورتوں سے منہ موڑنا پڑتا ہے۔ میں یہ بتاتی نہیں ہوں۔ لیکن گھر کا بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے تمہیں احساس تو ہونا چاہیے نا؟ جب تم پہ ذمہ داریاں پڑیں گی تو تمہیں پتا چلے گا۔ یہ جیب میں آنے والی اچھی پے جب مختلف ضروریات کو پورا



کرتے ہوئے خرچ ہوتی ہے تو پھر اتنی اچھی نہیں لگتی۔" آخر میں وہ خود پہ مسکرائی تھیں۔ لیکن ان کی باتیں تو جیسے احمر کے سر سے گزرتی جا رہی تھیں۔ وہ ابھی تک وہیں تھا' جہاں سے شروع ہوا تھا۔

"امی! سعد اور فہد کو کہاں جانا ہے۔ ان کے تو دوست بھی یہیں گلی محلے کے ہیں۔ لیکن آپ جانتی ہیں میرے دوستوں کا تعلق ایلیٹ کلاس سے ہے۔ ان کے ساتھ دوستی میں کچھ تو ان کی کلاس کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے نا۔ اسی لیے جب انہوں نے کسی اچھی جگہ چاند رات منانے کا پروگرام بنایا تو میں اس میں شامل ہونے سے انکار نہیں کر سکا۔" اب وہ اپنی امی کے سامنے اچھی جگہ کی وضاحت نہ کر سکا۔ آیا وہ کوئی کلب ہو گا یا کسی ہوٹل کا کیبن کیونکہ ابھی کچھ فائنل نہیں ہوا تھا۔

"امی! مجھے موقع کی مناسبت سے ڈریس اپ ہونے اور وہاں خرچ کرنے کے لیے ہی پیسوں کی ضرورت ہے۔ میرے دوست کوئی مجھ سے مانگ رہے ہیں۔ لیکن میرے پاس تو ہونے چاہئیں نا؟ ابھی تو میں آپ کو بہت کم رقم بتا رہا ہوں اور آپ ہیں کہ پھر بھی دینے میں تامل برت رہی ہیں۔"

شائستہ نے بڑے دکھ سے اپنے اس لاڈلے سپوت کو دیکھا۔ جو شاید شروع سے ہی خود غرض تھا۔ وہی اس کا بچپنا سمجھ کر درگزر کر جاتیں۔ لیکن آج اس کے خیالات نے انہیں بہت دل برداشتہ کیا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم ہائی کلاس کے دوست بناؤ؟ تم نے اپنی حیثیت کیوں نہ دیکھی؟ تم بھی سعد اور فہد کی طرح گلی محلے کے ہی دوست بنا لیتے' تو آج یہ درد سر نہ مول لینا پڑتا۔۔۔ اور اگر دوست بن ہی گئے تھے تو دوستی کو یونیورسٹی تک محدود رکھتے۔ کیا ضرورت تھی ان کے ساتھ چاند رات منانے کی؟ اگر تم میں ذرا سی بردباری ہوتی تو اپنے بھائیوں اور والدین کے ساتھ خوشی مناتے۔ کیونکہ خوشی کو خوشی کی طرح ہی منانا چاہیے۔ اگر خوشی کو عیاشی سمجھ لیا جائے تو وہ اپنے معنی کھو بیٹھتی ہے۔ اگر ان دونوں میں فرق محسوس نہ ہو تو خود کو اور اپنے بھائیوں کو دیکھ لو۔ وہ کتنے پرسکون ہیں اور تم نے خود کو خوامخواہ ٹینشن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اپنے دوستوں سے معذرت کر لو۔ ویسے تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تمہیں معلوم ہے نا' پالک کی سبزی بنانا مجھے مشکل ترین کام لگتا ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ باتوں میں احساس ہی نہیں ہوا اور سبزی بن گئی۔ اب میں اسے پکانے جا رہی ہوں۔ تھینک یو بیٹا۔"

وہ پیار سے اس کے بال بکھیرتی اپنی سبزی کی ٹوکری اٹھائے کچن میں چلی گئیں اور احمر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔



آج اتوار تھا اور وہ گھر پر ہی تھا۔ امی کے صاف انکار پر اسے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ عید میں دن بھی بہت کم رہ گئے تھے۔ شام تک اپنے کمرے میں بے زاری اور کسل مندی سے لیٹے سوچتے ہوئے ایک دم سے اسے **عبیرہ** کا خیال آیا تھا اور وہ پرجوش ہو گیا تھا۔

"حیرت ہے یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہ آیا۔" مسکراتے ہوئے اس نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور صرف پانچ منٹ میں وہ اپنے گھر سے نکل کر ساتھ والے گھر کی عادتاً" بیل بجاتے ہوئے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اونچی آواز میں سلام کرتے ہوئے اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ کیونکہ سامنے ہی صحن میں بچھی چارپائی پہ طاہرہ خالہ بیٹھی پالک کاٹ رہی تھیں۔ شائستہ اور طاہرہ دونوں بہنوں کے گھر پاس پاس تھے۔ اسی لیے گھر کی ہر چیز کی خریداری ایک ساتھ ہی کرتی تھیں اور زیادہ تر ایک جیسی ہی کرتی تھیں۔ چاہے وہ سبزی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے دونوں گھروں میں تقریباً" ایک جیسی ہی چیزیں پکتی تھیں۔ پالک کو دیکھ کر

احمر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

وہ چارپائی کے پاس رکھی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے بڑی متلاشی نظروں سے اردگرد عبیرہ کو دیکھا۔

"میرا بیٹا آج بڑے دنوں بعد آیا ہے۔" طاہرہ نے بڑے پیار سے اپنے لاڈلے بھانجے کو دیکھا تھا۔

"بس خالہ جانی! آج کل کمبائن اسٹڈی کی وجہ سے دیر سے گھر آتا ہوں۔ اسی لیے یہاں کا چکر نہیں لگا سکا۔ آپ سنائیں کیا حال ہے اور گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟ باقی لوگ کدھر ہیں؟" خالہ کو یوں اکیلا دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"تمہاری بھابھی تو بچوں کو ساتھ لے کر میکے گئی ہے۔ میں نے کہا عید سے پہلے ہی میکے ہو آؤ۔ تاکہ عید ادھر ہی ہمارے ساتھ منا سکو۔ بچوں کے بغیر تو گھر گھر نہیں لگتا۔ اس لیے پہلے ہی ننھیال ملنے بھیج دیا۔ رہ گئی عبیرہ... تو وہ اندر بیٹھی بچوں کے پیپرز اور کاپیاں وغیرہ چیک کر رہی ہے۔ تم بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" طاہرہ سبزی والی ٹوکری اٹھائے کچن کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے خالہ جانی! میں اتنے میں عبیرہ سے مل لوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے میں آگیا۔ جہاں عبیرہ اپنے اردگرد پیپرز پھیلائے بڑی مصروف نظر آرہی تھی۔

"عبیرہ! تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کوئی مجھے اگنور کرے تو مجھے کتنا برا لگتا ہے۔ میں کب سے آیا ہوا ہوں اور تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ تم ایک کپ چائے کا ہی پوچھ سکو۔" وہ دروازے میں کھڑا بڑی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ گلہ کر رہا تھا۔

دوسری طرف عبیرہ اسے اپنے گھر دیکھ کر ہمیشہ کی طرح نہال ہو گئی۔

"تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ عبیرہ ساری دنیا کو اگنور کر سکتی ہے، لیکن تمہیں نہیں۔ مجھے تمہارے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ورنہ کوئی مصروفیت بھی تم سے اہم ہرگز نہیں۔"

وہ جلدی سے پھیلاوا سمیٹتے ہوئے بولی اور احمر بھی ہمیشہ کی طرح اس کے اظہار پر تفاخر کا احساس دل میں سموئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اور سناؤ! تمہاری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے۔" وہ دوپٹا سر پر اچھی طرح جماتے ہوئے اپنی قمیص کی شکنیں ہاتھوں سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

نجانے کیوں احمر کی وجیہہ پرسنالٹی کے سامنے اسے اپنی اچھی بھلی شکل و صورت بھی عام سی لگنے لگتی تھی۔ جبکہ احمر تو بڑے عام سے حلیے میں بھی یوں خاص لگتا کہ نظر اس پر ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ ذہانت سے بھرپور اس کی ڈارک براؤن آنکھیں اسے سب میں ممتاز کرنے کے لیے کافی تھیں۔

"اسٹڈی تو دوڑ رہی ہے، لیکن میں خود ایک جگہ پہ آکر اٹک گیا ہوں۔ سوچا تم سے ہیلپ لے لوں۔" وہ تمہید کا قائل نہ تھا۔ جلد ہی اپنے مطلب پر آگیا۔

عبیرہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم نے مجھے بتایا تھا جب سے اسکول میں تمہاری جاب لگی ہے۔ تم اپنی پے خالہ جانی کو دے کر کچھ سیونگ بھی کرتی ہو۔" عبیرہ نا سمجھی کے عالم میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"مجھے دس ہزار کی اشد ضرورت ہے۔ تم دے دو۔ جب میرے پاس ہوں گے۔ میں تمہیں لوٹا دوں گا۔" بڑا ہی لٹھ مار سا انداز تھا۔

"تمہیں ایسی کیا ضرورت آن پڑی؟" عبیرہ تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے بولی۔

"تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ میں تم سے مانگ رہا ہوں؟ "کیوں" اور "کیا" کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

کشادہ پیشانی پہ ایک دم سلوٹوں نے اپنا جال بنا تھا۔ جو عبیرہ کو ہراساں کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ احمر اس طرح کا مطالبہ کرنے والا ہے۔

عبیرہ ویسے تو ہر موقع پر اس کی مدد کرتی تھی۔ لیکن یوں اس نے کبھی نہیں کہا تھا۔ احمر کا جو بھی کام ہوتا، عبیرہ ماتھے پہ شکن لائے بغیر کرتی تھی۔ احمر کے

دوست وقت بے وقت بغیر بتائے آجاتے تھے۔ چونکہ خالہ اکیلی تھیں اور بیمار بھی رہنے لگی تھیں۔ اسی لیے احمر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے عبیرہ کو ان کی خاطر تواضع کے لیے کہہ دیتا اور وہ اپنے سارے ضروری کام چھوڑ کر خالہ کے گھر آجاتی۔ اس کے کپڑے پریس کر دینا' کمرے کی صفائی کرنا' اس کی پسند کی کوئی ڈش بنانا' حتیٰ کہ اس کے نوٹس اور اسائنمنٹ تک تیار کر دینا۔

عبیرہ کو ان سب کاموں کی عادت سی ہو گئی تھی اور احمر کو حکم چلانے کی۔ اسی لیے آج عبیرہ کا پس و پیش کرنا احمر کو غصہ دلا گیا۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ کیا پیسے خرچ کر دیے ہیں؟" انداز میں عجیب ناگواری سی تھی۔

"نہیں احمر! ایسی بات نہیں۔ اصل میں عمر بھائی نے اس دفعہ پہلے سے کہہ دیا کہ اس عید پہ کوئی اضافی خرچ نہیں کرنا اور قربانی کرنی ہے۔ کیونکہ ابو کی ڈیتھ کے بعد ہم نے کافی عرصے سے قربانی نہیں کی اور اس اضافی خرچ سے مراد ہے کہ کسی کے بھی نئے جوتے اور کپڑے نہیں بنیں گے۔ امی' میں اور بھابھی تو ان کی بات سمجھ گئے۔ لیکن سنی' شانی اور پنکی تو بچے ہیں نا۔ وہ اس بات پر بجھ کر رہ گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے معصوم ذہن اس جوڑ توڑ کو نہیں سمجھ سکتے۔ انہیں قربانی کرنے کی خوشی سے زیادہ نئے کپڑے نہ ہونے کا دکھ ہے اور پنکی تو باقاعدہ میرے پاس آکر رو پڑی کہ اس کی تمام فرینڈز نے عید کے لیے نئے کپڑے اور جوتے لے بھی لیے ہیں اور وہ اس کا مذاق اڑائیں گی۔ جب وہ چھوٹی عید والے کپڑے پہنے گی.... تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں ان دونوں کو عید کی شاپنگ کراؤں گی۔ ویسے بھی وہ سیونگ میں کون سا اپنے لیے کر رہی تھی۔ اسی لیے تو کر رہی تھی کہ ضرورت پڑنے پر سہولت ہو جائے گی اور اگر میری سیونگ سے بچے خوش ہو جاتے ہیں تو مجھے اور کیا چاہیے۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔ اس لیے تم کچھ اور انتظام کر لو...."

عبیرہ نے تفصیل بتاتے ہوئے ـــ ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن دوسری طرف احمر سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ وہ عبیرہ جو اس کی ہر بات پر ایمان لانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ آج اس کا انکار احمر کو غصہ دلانے کے لیے کافی تھا۔

"لیکن تم تو بڑے یقین سے یہ دعوا کرتی ہو کہ میں تمہارے لیے سب سے زیادہ اہم ہوں تو پھر تم ان بچوں کو مجھ پر فوقیت دے کر کیوں اپنے الفاظ کی نفی کر رہی ہو؟"

بڑا ہی شاہانہ سا انداز تھا۔ جیسے سامنے کوئی حقیر سی رعایا ہو اور بڑی حقارت سے باز پرس کی جا رہی ہو۔ جبکہ عبیرہ بڑے دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے احمر کو اتنی تفصیل اس لیے بتائی تھی کہ وہ اس کی بات کو سمجھ سکے۔ لیکن وہاں تو خود غرضی اور خود پسندی کا یوں غلبہ تھا کہ وہ الٹا عبیرہ سے جواب دہی کر رہا تھا۔

"احمر! وہ بچے تمہارے بھی تو کچھ لگتے ہیں۔ تم ایسے کیوں بی ہیو کر رہے ہو؟ وہ اداس ہوں تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟" وہ احمر کے برعکس بڑے نرم لہجے میں بول رہی تھی۔

"بچوں کو انسان بہلا سکتا ہے۔ لیکن تم خود دینا ہی نہیں چاہتیں اور یونہی بچوں کی آڑ میں بہانہ بنا رہی ہو۔ لیکن یاد رکھنا! آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

شہادت کی انگلی اٹھائے' خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتے' راہ میں آئی ہر چیز کو ٹھوکر مارتے ہوئے وہ بڑے غصے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ بے بسی کے مارے عبیرہ کی آنکھوں میں آئے آنسو بڑے تواتر سے گالوں پر بہنے لگے۔

جس شخص سے اس کا مستقبل جڑنے والا تھا۔ جس کو اس نے دل میں بڑی اونچی مسند پہ بٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس کی اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ خود کو بچوں کے مقابل کھڑا کر رہا تھا۔ کیا اس کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے باقی رشتوں سے منہ موڑنا پڑے گا؟

"عبیرہ! یہ احمر چائے پیے بغیر کہاں چلا گیا؟" وہ نجانے کتنی دیر یونہی سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی۔ جب

باہر سے آتی امی کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔

"امی! اس کا کوئی فون آیا تھا۔ اسی لیے جلدی چلا گیا۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کمرے کے دروازے سے ہی امی کو بتانے لگی اور پھر مغرب کی اذان پر وہ سارے خیالوں کو جھٹکتے ہوئے نماز کی تیاری کرنے لگی۔



طاہرہ اور شائستہ دو بہنیں اپنے ہی جیسے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے دو بھائیوں محمد علی اور احمد علی سے بیاہی گئی تھیں۔ ساس، سسر کی وفات کے بعد اپنا آبائی گھر فروخت کرکے دونوں بھائیوں نے نسبتاً" اچھے علاقے میں جگہ خرید کر دو پورشن ایک جیسے ساتھ ساتھ بنوائے تھے۔ ان سادہ سے لوگوں کی بڑی پرسکون سی زندگی تھی۔ طاہرہ اور محمد علی کے دو بچے عمر اور عبیرہ تھے۔ جبکہ شائستہ اور احمد علی کے تین بیٹے احمر اور جڑواں سعد اور فہد تھے۔

جب عبیرہ کی دفعہ طاہرہ امید سے ہوئی تو شائستہ نے پہلے ہی اپنی بہن سے وعدہ لے لیا کہ "اگر اس کے ہاں بیٹی ہوئی تو وہ ان کے احمر کی دلہن بنے گی۔" اور طاہرہ ایک سال کے گول مٹول سے احمر کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ لیکن شائستہ نے "ہاں" کرواکے ہی دم لیا۔ یوں عبیرہ کی دنیا میں آمد پہ جتنی خوش اس کی خالہ ہوئیں اور کوئی نہ ہوا۔

عبیرہ دونوں گھروں کی اکلوتی اور لاڈلی لڑکی تھی۔ وقت بڑی سبک روی سے گزرتا گیا۔ بچے شعور کی منزلوں کو چھونے لگے۔ عمر کی تعلیم ختم ہوتے اور جاب شروع ہوتے ہی طاہرہ نے ان کی شادی ان کی پسند سے ہی ان کی کلاس فیلو سبیعہ سے کردی تھی۔ عمر آرمی میں تھے۔ ان کے تین بڑے پیارے سے بچے سنی، شانی اور پنکی تھے۔ جن میں سب کی جان تھی۔ عبیرہ بی ایس سی کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرنے کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ ہی ایم اے انگلش کررہی تھی۔ جبکہ احمر جو اس سے تقریباً" ڈیڑھ سال بڑا تھا ایم بی اے کے فائنل ایئر میں تھا۔

ان دونوں کی عجیب طرز کی منگنی پر سب ہی ان کو چھیڑتے تھے اور خاص طور پر عبیرہ کو کہ اس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی احمر نے اس کو اپنے نام کروالیا تھا۔ وہ دونوں اپنے والدین کے اس فیصلے پر دل سے متفق تھے۔ لیکن احمر فطرتاً" لاپروا" اپنی منوانے والا اور خود پسند واقع ہوا تھا۔ خصوصاً" اس کا رویہ عبیرہ کے ساتھ بڑا ہی حاکمانہ سا تھا۔ وہ اس کے ساتھ یوں پیش آتا۔ جیسے وہ اس کی ملکیت ہو۔ وہ چاہے جتنا ضروری کام کررہی ہوتی۔ لیکن وہ کچھ کہتا تو اس کا دل چاہتا کہ وہ ہر کام اور ہر فرد پر اسے اور اس کے کام کو فوقیت دے۔

اور اس وقت احمر کو دلی تسکین محسوس ہوتی۔ جب عبیرہ اس کی توقعات پر پورا اترتی۔ کیونکہ وہ اس کی ناراضی برداشت ہی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ بہت ہی حساس، نرم دل اور سب کا خیال رکھنے والی اچھے مزاج کی لڑکی تھی۔ لیکن جب سے اس کے والد محمد علی کی وفات ایک حادثے میں ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ اپنے گھر والوں کا خیال رکھتی۔ اپنی ماں کی دل جوئی کرتی۔ بچوں کا خیال کرتی۔ جو اپنے حد سے زیادہ پیار کرنے والے دادا کی کمی بہت محسوس کرتے تھے۔ اس نے پڑھائی کے ساتھ جاب بھی اسی لیے شروع کی تھی۔ تاکہ مہنگائی کے اس دور میں اگر وہ اپنے بھائی کا ہاتھ نہیں بٹاسکتی تو کم از کم اپنا اور اپنی تعلیم کا بوجھ تو خود اٹھا سکے۔

بھائی اور بھابھی کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنے ساتھ بچوں کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کو بھی پورا کردیتی۔ جو اپنی پھوپھو سے بہت پیار کرتے تھے۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے اس دفعہ بھی بچوں کو شاپنگ کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ تاکہ وہ بھائی کو تنگ نہ کریں اور وہ اپنے نیک ارادے کو عملی جامہ پہنا سکے۔ لیکن اس کی یہ بات احمر کو بہت بری لگی تھی۔ وہ اس سے اتنا ناراض ہوا کہ اس کی طرف دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اس ناراضی میں تین دن گزر چکے تھے۔

احمر اس سے آج تک ناراض نہیں ہوا تھا' لیکن اس میں احمر کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ بلکہ عبیرہ اسے ناراض ہونے کا موقع ہی نہ دیتی۔ اسی لیے اب اسے احمر کی ناراضی بہت کھل رہی تھی اور سب سے بڑی بات جو عبیرہ کو پریشان کر رہی تھی' وہ یہ تھی کہ وہ احمر کو منانے کی کوشش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کوشش کا مطلب تو یہی ہوتا کہ وہ رقم اس کے ہاتھ پہ رکھتی اور کہتی کہ اب مان جاؤ۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ احمر کی ناراضی ختم کرنے کے لیے معصوم سی خواہشوں کو کچل نہیں سکتی تھی۔

"میں کیا کروں؟" بے بسی سے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ لیکن کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔



آج موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا۔ یہ موسم عبیرہ کو بہت بھاتا تھا۔ لیکن ایک تو وہ احمر کی وجہ سے ویسے ہی اپ سیٹ تھی۔ اوپر سے بچوں کے نہ ہونے سے عجیب سی بے زاری اور بوریت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی لیے وہ خواہ مخواہ ٹی وی لگائے چینل تبدیل کیے جا رہی تھی۔ پاس ہی طاہرہ بیٹھی بیڈ شیٹ پہ کڑھائی کر رہی تھیں۔ جب سعد اور فہد دونوں سلام کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

"عبیرہ آپی! جلدی اٹھیں۔ ہمارے گھر چلیں۔ ہمیں آپ سے کچھ کام ہے۔" بیٹھنے کے بجائے وہ دونوں اس کے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے۔

"ایسا کیا کام ہے' جو تم مجھے یہاں نہیں بتا سکتے اور گھر چلنے کو کہہ رہے ہو؟" وہ ان کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ چلیں تو سہی۔" سعد نے باقاعدہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"لیکن میں اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک تم مجھے کام کی نوعیت نہیں بتاؤ گے۔" وہ بھی ان کو تنگ کر کے خوش ہو رہی تھی۔

"عبیرہ آپی! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ ضد میں تو بالکل اپنی خالہ جانی پہ چلی گئی ہیں۔ ہم ایک گھنٹے سے ان کی منتیں کر رہے ہیں کہ ہمیں چائے کے ساتھ پکوڑے بنا دیں۔ لیکن انہوں نے ہماری ایک نہیں سنی اور یہاں آپ بھی ان ہی کی طرح بی ہیو کر رہی ہیں۔" سعد ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے ایک دم اس کی طرف سے منہ موڑ کے کھڑا ہو گیا اور فہد نے بھی فوراً" اس کی تقلید کی تھی۔

"اوہو! میرے پیارے بھائی تو ناراض ہو گئے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ پکوڑوں کے لیے تو میرا بھی دل مچل رہا تھا۔ لیکن اکیلے مزہ نہیں آتا تھا۔ اسی لیے نہیں بنائے۔ چلو! جلدی چلو۔ بارش بھی آنے والی ہے۔" اس نے دونوں کے ہاتھ پکڑے اور طاہرہ کو بتاتے ہوئے باہر کو لپکی۔ جو ان کی نوک جھونک پہ مسکرا رہی تھیں۔

وہ جب سعد اور فہد کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو پہلی ہی نظر اس ناراض سے شخص پر پڑی۔ جو برآمدے میں بیٹھا شاید کوئی میگزین پڑھ رہا تھا۔ احمر نے بھی اس کو دیکھا۔ لیکن ناراضی کے اظہار کے لیے سرعت سے اپنا رخ موڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ عبیرہ اس کے طرز عمل پر اداس ہوتی۔ سعد اسے پکڑ کر سیدھا کچن میں لے آیا۔ جہاں شائستہ چائے بنانے کے ساتھ ساتھ بیسن گھول رہی تھیں۔

"مجھے پتا تھا' یہ شیطان تم کو تنگ کریں گے۔ اسی لیے مجھے اٹھنا پڑا اور تم بھی ان کی ہر بات نہ مان لیا کرو۔ کبھی انکار بھی کر دیا کرو۔ ساری زندگی ان کے ساتھ گزارنی ہے۔ ان کی عادتیں بگاڑ کر انہیں سر پر مت چڑھاؤ۔" خالہ جانی کی بات پر عبیرہ جھینپ سی گئی۔ کیونکہ کچن کے دروازے سے احمر بھی نظر آ رہا تھا اور یقیناً" خالہ کی آواز اس تک بھی پہنچی ہو گی۔ اسی لیے عبیرہ جلدی سے خالہ کی اوٹ میں ہو گئی اور چولہے پہ کڑاہی رکھ کر تیل ڈالنے لگی۔

"خالہ جانی! آپ جا کر بیٹھیں۔ بس تھوڑی دیر میں سارا کام ہو جائے گا۔"

اس نے ان کے ہاتھ سے بیسن والا پیالہ لے کر

انہیں باہر بھیج دیا اور ساتھ میں ان دونوں بھائیوں کو بھی باہر نکالا۔ کیونکہ انہیں عادت کے مطابق اس کو احمر کے نام سے چھیڑنا تھا۔ جو کہ وہ احمر کی موجودگی میں اس وقت بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ چائے اور پکوڑوں کے ساتھ پودینے اور ٹماٹر کی چٹنی تیار کر کے باہر برآمدے میں آگئی۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی کے ساتھ پکوڑوں کی سوندھی سوندھی خوشبو اور بھاپ اڑاتے چائے کے کپ سب کا موڈ خوش گوار کرنے کے لیے کافی تھے۔ لیکن احمر کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ سب اسے نظر انداز کر رہے تھے۔ کوئی اس کی ناراضی کو اہمیت ہی نہیں دے رہا تھا۔ اسی لیے وہ میگزین ٹیبل پر پھینک کر ایک دم اٹھ گیا۔

"ارے احمر بھائی! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ چائے نہیں پینی؟" فہد نے اسے اٹھتے دیکھا تو کہے بنا نہ رہ سکا۔ لیکن وہ کوئی بھی جواب دیے بغیر باہر کی طرف چل دیا اور گلی والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ عبیرہ کا من بوجھل سا ہو گیا۔

"اسے کیا ہوا؟" عبیرہ نے بڑی بے اختیاری میں پوچھا اور جواب میں فہد نے اسے ساری بات بتا دی۔

"میں نے تو امی سے کہا بھی ہے کہ بھائی کو پیسے دے دیں۔ کیونکہ اس دفعہ ابو کو آفس سے عید کی وجہ سے بونس بھی ملا ہے۔ لیکن امی بھی چاند رات اور بھائی کے درمیان ظالم سماج کی طرح کھڑی ہو گئی ہیں۔" فہد کی بات پر عبیرہ نے حیران ہو کر شائستہ کو دیکھا۔

"بیٹا! میں تم لوگوں کی ماں ہوں۔ میں تمہاری خوشی کی وجہ تو بن سکتی ہوں' رکاوٹ کبھی نہیں بن سکتی ....اور تم بونس کی بات کر رہے ہو۔ اگر وہ نہ بھی ہو تو دس ہزار میرے احمر کی خوشی سے زیادہ نہیں۔ لیکن پیسے نہ ہونے کا بہانہ میں نے صرف شہر کے حالات دیکھ کر بنایا ہے۔ اب تو دن کو باہر نکلتے دل ہولتا ہے ....اور کہاں میں پوری رات کے لیے اپنے بیٹے کو خطروں کے حوالے کر دوں۔ دشمن تو ایسے ہی خوشی کے موقعوں کی طاق میں ہوتے ہیں۔ کہاں دو چار لوگ ہوں اور وہ اپنے ہتھیاروں کا استعمال کریں۔ اللہ تعالیٰ کل عالم کے ساتھ میرے بچوں کو محفوظ رکھے۔ میں احمر کی ناراضی تو برداشت کر لوں گی۔ لیکن پوری رات خدشات اور واہموں کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ اس سے بہتر یہ نہیں کہ وہ اپنوں کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں عید کی خوشیاں منائے؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آفتوں سے محفوظ رکھے۔ ویسے میرے اس لاڈلے بیٹے کی عادت ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر موڈ خراب کر لینا ہے۔ کبھی کبھی تو میرا شدت سے دل چاہتا ہے کہ احمر میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہوتا تو اس کا یہ بچپنا مجھے اتنا نہ کھٹکتا۔" آخر میں وہ ہمیشہ کی طرح مسکرائی تھیں۔

"ارے امی! اب یوں تو نہ کہیں۔ اگر بھائی ہم میں بڑے نہ ہوتے تو عبیرہ آپی کو پیدا ہونے سے پہلے ہی کون اپنے نام کرواتا؟" سعد اتنی سنجیدہ گفتگو میں بھی شرارت سے باز نہ آیا۔ عبیرہ اسے گھورتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر احمر کے بارے میں ہی سوچ گئی۔



آج اس کا موڈ صبح سے ہی خراب تھا۔ کیونکہ آج اس کی سالگرہ تھی اور احمر چاہے جتنا لاپرواسہی' وہ آج کے دن اس کو مبارک باد ضرور دیتا تھا اور اس کی پسندیدہ مصنفین کی کتابیں بھی ضرور گفٹ کرتا تھا۔ وہ گفٹ اور وہ لمحے اس کو پورے سال کا حاصل لگتے تھے۔ لیکن آج ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

وہ لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ انتظار ختم نہ ہوا۔ آج اسے احمر کی ناراضی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ اسی لیے اسکول میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ سارے پیریڈز بڑی بے زاری سے لیے۔ اس کا آخری پیریڈ فری تھا۔ اسی لیے وہ اسٹاف روم میں آگئی۔ تاکہ کچھ دیر سکون سے بیٹھ سکے۔ ابھی وہ بیٹھی ہی تھی۔ جب اس کی کولیگ اور

بہت اچھی دوست فریحہ بھی وہیں چلی آئی۔

اسکول میں عبیرہ کی سب سے اچھی گپ شپ تھی۔ لیکن دوستی صرف فریحہ سے ہی تھی۔ اسے یہ نٹ کھٹ سی زندہ دل لڑکی بہت اچھی لگتی تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ اچھے خاصے متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وقت گزارنے کے لیے شوقیہ جاب کرتی تھی۔

"عبیرہ! میں بھی فری ہوں۔ چلو! میڈم سے بات کرکے لگے ہاتھوں عید کی شاپنگ کرلیتے ہیں۔ مس عطیہ کہہ رہی ہیں کہ اسکول کی بیک پہ جو روڈ ہے' وہاں نئی مارکیٹ بنی ہے اور اپنی پبلسٹی کے لیے انہوں نے عید کی شاپنگ پہ بہت اچھا ڈسکاؤنٹ بھی رکھا ہے۔ وہاں کا وزٹ کرتے ہیں۔ کام بن گیا تو ٹھیک۔ ورنہ بازار چلیں گے۔" اس نے آتے ہی کھڑے کھڑے اپنا مدعا بیان کیا۔ جیسے وہ کہے گی اور عبیرہ اس کے ساتھ چل پڑے گی۔

"لیکن فریحہ! میں امی سے پوچھ کر نہیں آئی اور پیسے بھی نہیں لائی۔ کل چلیں گے۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"جہاں تک آنٹی سے پوچھنے کی بات ہے۔ وہ ابھی فون کرلو اور باقی میں ہوں نا۔ پچھلے دو مہینوں سے میں نے شاپنگ نہیں کی اور دو مہینوں کی پے اور پاکٹ منی میرے بیگ میں ہے۔ شاپنگ کرتے ہیں۔ پھر بعد میں تم مجھے رقم لوٹا دینا' سمپل۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح بات چٹکیوں میں اڑائی تھی اور اس کی بات سنتے ہوئے عبیرہ کے ذہن میں ایک دم جھماکہ سا ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ بات اس کے ذہن میں پہلے کیوں نہ آئی۔ لیکن اب اگر فریحہ کی وجہ سے ہی سہی آگئی تھی تو وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی۔

"لیکن فریحہ! یہ پیسے میں اگلے مہینے کی پے ملنے پر کروں گی۔" وہ اس کو جیسے خبردار کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ارے بابا! جب تمہاری مرضی اور سہولت ہوگی۔ تب کردینا۔ اب اٹھو۔ تاکہ جلدی سے جائیں اور فارغ ہوجائیں۔ میں چادر لے کر آتی ہوں۔ جب تک تم آنٹی سے بات کرلو۔" وہ یہ کہتے ہوئے چلی گئی اور پھر امی سے فون پر اجازت لینے کے بعد وہ بھی شاپنگ کے لیے تیار تھی۔

فریحہ نے تو صرف اپنی ہی شاپنگ کرنی تھی۔ لیکن عبیرہ نے سب سے پہلے بچوں کے کپڑے دیکھے تھے۔ سنی اور شانی کے لیے ایک جیسی پینٹ شرٹ اور پنکی کے لیے بہت اچھا شاکنگ پنک فراک لیا۔ وہ بہت گوری تھی۔ یہ رنگ اس پر بہت سوٹ کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ مسکرادی۔ پنکی کے لیے میچنگ کھسہ بھی لیا۔ بچوں کے کپڑوں کا سائز تو اسے معلوم تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے دکان دار سے بات کرلی کہ اگر سائز صحیح نہ ہوا تو وہ چینج کردیں گے۔ وہ ساتھ ساتھ فریحہ کو مشورہ بھی دیتی جارہی تھی۔ پھر اس نے بھابھی کے لیے بھی تھری پیس نفیس سا سوٹ لیا۔

"بھابھی کے گھر آنے سے پہلے سلائی کردوں گی۔ خوش ہوجائیں گی۔" سوچتے ہوئے لگے ہاتھوں امی کے لیے بھی ایک سوٹ لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شاپنگ مکمل ہوچکی تھی۔

"یہ کیا؟ تم نے سب کے لیے شاپنگ کی اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں لیا۔" فریحہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر چاند رات کی طرح اس دفعہ بھی خالہ جانی کی طرف سے میرا تو عید کا مکمل پیکج مجھے مل جائے گا۔ جس میں میری پسند کے کپڑے' جوتے' چوڑیاں' مہندی اور جیولری سب کچھ خالہ جانی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس پیار بھری دھمکی کے ساتھ کہ اگر میں نے صبح وہ ساری چیزیں استعمال نہ کیں تو وہ واپس لینے میں ہرگز تامل نہیں کریں گی۔ اسی لیے میں نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔ تم بس بل بنواؤ۔" مسکراتے ہوئے اس نے اپنی شاپنگ کاؤنٹر پر رکھی۔ فریحہ بھی اس کی بات پر مسکراتے ہوئے یہ بل بنوانے لگی۔

پیمنٹ کرنے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو جارہی

تھیں تو عبیرہ صرف ایک بات سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ آج احمر کی ناراضی ختم ہو جائے گی۔ ورنہ فریحہ سے بات کرنے سے پہلے تو وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اس کی برتھ ڈے پر اپنی ناراضی کو ہنوز برقرار رکھ سکتا ہے تو عید پہ بھی اس کا یہی رویہ ہوتا تھا.... جو کہ عید کی خوشی کو غارت کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہی سوچتے ہوئے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے امی کے پاس آئی۔ تاکہ ان کو شاپنگ دکھا سکے۔ طاہرہ کو ساری چیزیں بہت پسند آئیں۔ انہوں نے اپنی اس حساس سی بیٹی کو چوم لیا۔ جسے سب کا خیال تھا۔

"جب سب کے لیے کچھ نہ کچھ لیا ہے تو بیٹا! اپنے لیے بھی کچھ لے لیتیں۔ تمہارے بھی اسکول میں پہننے والے کپڑے اب پرانے سے ہو رہے ہیں۔" فریحہ کی طرح انہیں بھی اس کا یوں خود کو نظر انداز کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"اپنے لیے عید کے بعد لوں گی۔ ابھی سب کچھ بہت مہنگا تھا۔" اس نے یونہی بہانہ بنایا۔ اب وہ امی کو کیا بتاتی کہ وہ چاہتی تھی کہ کم سے کم بل میں یہی کام ہو جائے تاکہ فریحہ کے پیسے واپس کرنے میں بھی آسانی ہو۔

"امی! پلیز جلدی سے مجھے کھانا دیں۔ تاکہ میں آج ہی بھابھی کے کپڑے سلائی کر دوں۔ کل تک وہ گھر آجائیں گی۔ کیونکہ کل شام تک عمر بھائی بھی کھاریاں سے آجائیں گے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں آج ہی فارغ ہو جاؤں۔"

امی سے کہتے ہوئے اس نے ساری چیزیں اٹھائیں اور بھیا بھابھی کے کمرے میں رکھ آئی۔ وہ خود ہاتھ منہ دھو کر امی کے پاس کچن میں ہی آگئی۔ امی نے اسے کھانا دینے کے ساتھ ہی چولہے پر چائے بننے کے لیے رکھ دی۔ آج بڑے دنوں بعد عبیرہ کو کھانا مزے کا لگ رہا تھا۔ اس کا موڈ بڑا خوش گوار تھا۔ ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی بوجھ کندھوں سے اتر گیا ہو۔

"کھانا کھانے کے بعد خالہ جانی کی طرف جاؤں گی اور....."

"عبیرہ!" ابھی اس کی سوچ محو پرواز ہی تھی۔ جب امی کی پکار نے اس کی سوچ کا تسلسل توڑا تھا۔

"بیٹا! مجھے بتانا یاد ہی نہیں رہا۔ جب صبح تم اسکول چلی گئی تھیں تو احمر آیا تھا۔ آج تمہارا برتھ ڈے ہے نا۔ گفٹ دینے آیا تھا۔ اسے شاید تمہاری اسکول ٹائمنگ کا اندازہ نہ تھا۔ اسی لیے اسے دیر ہو گئی۔ تمہارا گفٹ اندر رکھا ہے۔ دیکھ لینا اور شائستہ کی طرف جب جاؤ تو اسے کہنا کہ رات کا کھانا نہ بنائے۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہی کھانا کھائیں۔ ذرا رونق ہو جائے گی۔ رات کو میں بریانی اور قیمہ مٹر پکاؤں گی۔ تمہیں پسند ہیں نا۔" انہوں نے پیار سے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ہمیشہ سے ہی آج کے دن اس کے لیے کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کرتی تھیں۔ طاہرہ تو شاید ابھی سے رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی تھیں۔ لیکن عبیرہ نے ان کی احمر کے گفٹ والی بات بڑی حیرانی سے سنی تھی۔ دل تو ویسے بھی احمر کی طرف سے کبھی بدگمان نہیں ہوا تھا اب تو منظر اور بھی نکھر سے گئے۔ اس نے جلدی سے آکر گفٹ دیکھا۔ ٹی وی ٹرالی پہ اچھے سے ریپر میں لپٹی یقیناً" کوئی کتاب تھی اور ساتھ میں ہیپی برتھ ڈے اور عید مبارک کا بڑا پیارا سا کارڈ تھا۔

"میں ایسے ہی صبح سے خود پر قنوطیت طاری کیے بیٹھی تھی اور وہ تو ناراضی میں بھی آج کے دن کو اگنور نہیں کر سکا۔" آنکھوں کی سطح نم ہونے لگی اور لبوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ اس نے جلدی سے دس ہزار روپے چھوٹے سے والٹ میں ڈالے اور امی کو بتا کر خالہ کے گھر آگئی۔ وہاں اسے بڑی خاموشی محسوس ہوئی۔

"اس کا مطلب ہے فہد اور سعد دونوں ہی گھر پر نہیں ہیں۔ ان کی موجودگی میں اتنی خاموشی تو ناممکن ہے۔" وہ اندازہ لگاتی برآمدے میں آئی تو خالہ جانی سامنے ہی چادر تانے سو رہی تھیں۔ وہ ان کو ڈسٹرب کیے بغیر واپسی کے لیے مڑی تھی۔ جب کچن سے کھٹر پٹر کی آواز پر چونکی اور اسی طرف آگئی۔ جہاں

احمر شاید اپنے لیے چائے بنانے لگا تھا۔ ایک نگاہ غلط اس پر ڈالتا فریج سے دودھ نکالتے ہوئے خود کو بڑا مصروف ظاہر کرنے لگا۔

"احمر! میں اتنے دنوں سے ایسے ہی پریشان تھی کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔ لیکن اسکول سے آکر میں نے تمہارا گفٹ دیکھا تو مجھے لگا' میں کتنی بے وقوف ہوں۔ ایسے ہی تم سے بدگمان ہو رہی تھی۔" وہ دروازے میں کھڑے کھڑے بڑے اچھے موڈ میں اس سے بولی۔

"آج کے دن گفٹ دینا عادت سی بن گئی ہے۔ اس لیے یاد نہیں رہا کہ میں تم سے ناراض ہوں اور تم بے وقوف ہرگز نہیں ہو۔ تم نے جو کچھ محسوس کیا' وہ حقیقت ہے۔"

وہ اپنے جذبات چھپائے خفگی ظاہر کرتے ہوئے بولا تھا۔ عبیرہ اس کے جواب پر مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور والٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ پیسے پکڑو۔ اپنی خود ساختہ ناراضی کو ختم کرو۔ اور آگے سے ہٹو۔ مجھے چائے بنانے دو۔" والٹ اسے پکڑاتے اس نے چولہا جلایا اور چائے کے لیے دودھ اوپر رکھا۔

"جب دینے ہی تھے تو اتنے دن تنگ کیوں کیا؟" احمر کا موڈ ہنوز برقرار تھا۔

"یعنی احمر علی! تم نے خوش ہونا تو سیکھا ہی نہیں۔" وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

"غلطی ہو گئی۔ آئندہ کبھی تنگ نہیں کروں گی۔"

اس نے مسکراتے ہوئے چائے کپ میں ڈالی اور اس کے آگے رکھی۔ وہ وہیں رکھے اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔

"اپنے لیے کیوں نہیں بنائی؟"

"میں ابھی پی کر آئی ہوں۔ دوبارہ پینے کا موڈ نہیں۔ لیکن تم سے ایک ریکویسٹ ہے۔ جب دوستوں کے ساتھ جاؤ تو پلیز! اپنا خیال رکھنا اور کوشش کرنا کہ جلدی گھر آجاؤ۔ ورنہ عید کے دن انجوائے کرنے کے بجائے سوتے رہو گے جو کہ سب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بہت برا لگے گا۔" اس دن کی شائستہ کی باتوں کے پیش نظر وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"تم پر یقیناً" تمہاری خالہ جانی کی باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔ تب ہی تم مجھے یوں نصیحت کر رہی ہو۔ لیکن ایک بات خود بھی سمجھ لو اور امی کو بھی باور کرا دینا کہ اب بڑا ہو گیا ہوں۔ بچہ نہیں ہوں' جو اپنا خیال نہ رکھ سکوں۔" وہ بڑے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"جناب! ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ بڑے ہو گئے ہیں۔ اگر بچے ہوتے تو خالہ جانی کان پکڑ کر اپنی بات منوا لیتیں۔ خیر! خالہ جانی اٹھیں تو بتا دینا کہ آج رات کا کھانا ہمارے گھر ہے۔ تم بھی آجانا اور گفٹ کے لیے بہت تھینکس۔" آخر میں وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"لیکن تم جا کیوں رہی ہو... بیٹھو گی نہیں؟" اس کو واپس مڑتے دیکھ کر احمر کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں! گھر میں کام ہے۔ اس لیے چلوں گی۔ رات کو سب مل کر بیٹھیں گے اور گپ شپ کریں گے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"عبیرہ!" اس کی پکار پر وہ رک گئی۔ "تھینکس یہ احساس دلانے کے لیے کہ میں تمہارے لیے سب سے زیادہ اہم ہوں۔" وہ والٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے اچھے موڈ میں بولا۔

اور اس کی بات پر عبیرہ کا دل جیسے بجھ کر رہ گیا۔ اب وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ "پیار میں درجہ بندی نہیں ہوتی۔ وسعت ہوتی ہے۔ خلوص ہوتا ہے۔ اپنے پن کا احساس ہوتا ہے۔ پیار جیسا انمول جذبہ دو دلوں میں محصور ہو کر نہیں رہتا۔ بلکہ یہ تو حصار کرتا ہے۔ اپنی وسعت میں سب کو سمو لیتا ہے۔ اپنے ہونے کا احساس دلا کر دلوں کو مسحور کرتا ہے۔ میں دعا کروں گی' تم جلد ہی اس حقیقت کو سمجھ لو۔"

وہ کچھ بھی کہے بغیر بے دلی سے مسکراتے ہوئے واپسی کے لیے مڑی تھی۔



آج طاہرہ کے گھر میں بہت رونق تھی۔ ان کا بیٹا عمر آج ساڑھے تین ماہ بعد ان کی آنکھوں کے سامنے

تھا۔ چھٹی نہ ملنے کے باعث عمر عید الفطر پہ بھی گھر نہ آسکے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں گھر کا کوئی بھی فرد عید جیسے موقع پر بھی خوش نہ تھا۔ بچے بھی مرجھائے ہوئے سے تھے۔ لیکن آج جیسے عید سے ایک دن پہلے ہی ان کی عید ہو گئی تھی۔

ربیعہ اور بچے بھی ننھیال سے واپس آچکے تھے اور بچوں کی خوشی تو اس وقت دوبالا ہو گئی۔ جب عمر اپنے چچا احمد علی کے ساتھ جا کر دونوں گھروں کے لیے بکرے لے آئے جو کہ ادھر ہی صحن سے ہٹ کر بنے چھوٹے سے کچے احاطے پر بندھے تھے۔ جہاں طاہرہ عموماً سبزیاں وغیرہ لگاتی تھیں۔ لیکن ان دنوں خالی پڑا ہوا تھا۔ اب وہاں دونوں بکرے بندھے تھے اور بچوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔ سعد اور فہد بکروں کو سجا رہے تھے۔ ان پر مختلف قسم کے رنگوں سے طبع آزمائی کی جا رہی تھی۔ عمر اور چچا جان بھی تھوڑے فاصلے پر بیٹھے انہی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ طاہرہ اور شائستہ بھی صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھیں یوں گفت و شنید کر رہی تھیں۔ جیسے کوئی اہم معاملہ زیر غور ہو اور کچن میں بھابھی کے ساتھ کام کرتی عبیرہ گاہے گاہے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ اسے احمر کی کمی بہت کھل رہی تھی، جو نجانے کدھر غائب تھا۔

عبیرہ آج اس لیے بھی خوش تھی کہ اس کی شاپنگ بھابھی اور بچوں کو بہت پسند آئی تھی۔ بچوں کے ساتھ بھابھی بھی بہت خوش ہوئی تھیں۔ جب اس نے ان کو کپڑے دیے تھے۔ جو اس نے دل لگا کر سلائی کیے تھے اور اب خوب صورت بٹن اور لیس کی وجہ سے بالکل ریڈی میڈ لگ رہے تھے۔ جب بھابھی نے تعریف کی تو عبیرہ کو لگا اس کا سیروں خون بڑھ گیا ہو۔

اور جب رات کو وہ برآمدے میں بڑی سی چٹائی بچھائے سب کے لیے کھانا لگانے لگی تو احمر بھی با آواز بلند سلام کرتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ عبیرہ کو لگا منظر مکمل ہو گیا ہو۔ سب نے بڑے اچھے موڈ میں کھانا کھایا۔ صبح عید تھی۔ سب کو جلدی اٹھنا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے خالہ جانی اور چچا جان کی فیملی اپنے گھر سدھاری۔ بھابھی اور بچے بھی سونے چلے گئے۔ لیکن عبیرہ جاگ رہی تھی محلے کی بچیاں اس سے مہندی لگوانے آئی ہوئی تھیں۔ طاہرہ بھی پاس ہی لیٹی اونگھ رہی تھیں۔ پھر عبیرہ نے فارغ ہونے کے بعد وہ شاپر کھولا تھا۔ جس میں خالہ جانی اسے عیدی دے کر گئی تھیں۔ وہ اپنی ہر بات اس سے شیئر کرتی تھیں لیکن اس کی عید کی شاپنگ وہ چاند رات کو ہی دکھاتی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اسے تاکید کر کے گئی تھیں کہ صبح اسے یہی ڈریس پہننا ہے۔ ڈارک میرون رنگ کی نہایت ہی خوب صورت فراک اور چوڑی دار پاجامہ تھا۔ جس پر بڑی نفیس سی سلور کڑھائی کی گئی تھی اور بڑے سے دوپٹے کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے تارے چمک رہے تھے۔

عبیرہ مسکراتے لبوں کے ساتھ ساری چیزیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے کپڑے ہینگ کر کے سامنے ہی رکھے۔ پاس ہی بڑا خوب صورت سا میچنگ کھسہ رکھا۔ ٹیبل پر میچنگ چوڑیاں اور جیولری رکھی اور پھر سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد چوکڑی مار کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور کون اٹھا کر بائیں ہاتھ پر بڑا خوب صورت سا مہندی کا ڈیزائن بنانے لگی۔ دل میں ڈھیروں اطمینان، آنکھوں میں خوشی کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ سجائے وہ بڑی مگن سی تھی۔ اس کی زندگی میں ایسی بہت سی ساعتیں آئی تھیں۔ لیکن اسے ہر دفعہ ہی بڑا انوکھا سا احساس ہوتا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔



چاند رات اپنے دامن میں بھر بھر کر جو خوشیاں لائی تھی۔ نجانے کیوں عید کی صبح ان خوشیوں کو صحیح معنوں میں بٹور ہی نہ سکی اور نظریں چرا کر بیٹھ گئی۔

صبح کا آغاز معمول کے مطابق ہوا تھا۔ طاہرہ اور ربیعہ کچن میں تھیں۔ جبکہ عبیرہ بھائی کی تیاری میں

بھی مدد دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ بچوں کو بھی تیار کر رہی تھی۔ تاکہ سنی اور شانی بھی عید کی نماز پڑھنے بھیا کے ساتھ جاسکیں۔ بچے تیار ہو کر بڑے ہی پیارے لگ رہے تھے اور پنکی کی تو چھب ہی نرالی تھی۔ ان تینوں کو ہی اپنی پھوپھو پہ بہت پیار آرہا تھا۔ جوان کے لیے اتنے اچھے کپڑے لائی تھیں۔ عبیرہ ان کی شرارتوں پہ مسکراتے ہوئے پھیلاوا سمیٹتی جارہی تھی۔ تفصیلی صفائی تو وہ کل ہی کرچکی تھی۔ اس لیے آج ضرورت نہیں تھی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

"عمر! بیٹا جاؤ۔ دروازہ کھولو۔ سعد ہوگا۔ اسے شیر خورما بہت پسند ہے۔ صبر نہیں ہوا۔ لینے آگیا ہوگا۔" طاہرہ ممتا بھرے لہجے میں مسکراتے ہوئے بولیں۔ لیکن عمر جب دروازے پر گئے تو ان کا کوئی دوست تھا۔

"امی! میرا دوست نبیل ہے۔ ہم نماز پڑھنے جارہے ہیں۔ آجاؤ بچو۔" سنی اور شانی کو پکارتے ہوئے انہوں نے دروازے سے ہی اطلاع دی۔

"لیکن عمر! اپنے چچا اور بھائیوں کے ساتھ مل کر جانا۔" طاہرہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

"امی! دیر ہورہی ہے اور میرے خیال میں وہ لوگ بھی نکل گئے ہوں گے۔" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے دروازہ بند کردیا۔ طاہرہ اپنے بچوں کے گرد آیت الکرسی کا حصار پھونکتے ہوئے کام میں لگ گئیں۔

"عبیرہ! کہاں ہو؟ یہ شیر خورما اور کسٹرڈ باؤل میں ڈالو اور خالہ کو دے آؤ۔" چاہے عید چھوٹی ہو یا بڑی عید ان کے گھر بڑوں کے لیے شیر خورما اور چھوٹے بچوں کے لیے جیلی اور کسٹرڈ ضرور بنایا جاتا تھا۔

"امی! پہلے میں اور بھابھی تیار ہولیں۔ اتنے میں بھائی بھی آجاتے ہیں تو پھر مل کر جاتے ہیں۔" عبیرہ نے اپنا ملگجا سا لباس دیکھتے ہوئے کہا رات کو وہ مہندی خشک کیے بغیر سوگئی تھی۔ اسی لیے کپڑوں پر جگہ جگہ مہندی کے نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے۔

"اچھا ربیعہ! تم بھی جاؤ۔ بیٹا! تیار ہوجاؤ۔ باقی کام میں سنبھال لوں گی۔" انہوں نے کاموں میں الجھی ربیعہ سے کہا تو وہ بھی تیار ہونے چلی گئیں۔

وہ دونوں تیار ہوگئیں۔ طاہرہ نے دونوں کو پیار کیا اور دعائیں دیتے ہوئے عیدی دی۔ عبیرہ ٹرے میں چیزیں رکھ رہی تھی۔ جب عمر بھائی اور بچے نماز پڑھ کر واپس آگئے۔

"امی! چچا جان اور احمر لوگ یہاں نہیں آئے؟" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں بیٹا! ادھر تو نہیں آئے۔ خیریت تو ہے۔" طاہرہ فکر سے بولیں۔

"امی! وہ لوگ نماز پڑھنے بھی نہیں گئے۔ میں جاکے دیکھتا ہوں۔ کہیں سوتے ہی تو نہیں رہ گئے۔" عمر الٹے پاؤں واپس لوٹ گئے تینوں بھی بچوں کو ساتھ لیے دل میں آتے وسوسوں کو جھٹلاتی اس کے ساتھ ہولیں۔ لیکن ان کے گھر کا کھلا دروازہ دیکھ کر دل ہولنے لگا۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ طاہرہ کے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ وہ وہیں برآمدے میں بچھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

کسی انہونی کے ڈر سے عبیرہ کا دل بھی پتے کی طرح کانپنے لگا۔ عمر اونچی آواز میں آوازیں دیتے سب کمروں کے دروازے کھول کر دیکھ رہے تھے۔ آرمی میں ہونے کے باوجود دو خالی کمرے ان کا حوصلہ پست کرنے کے لیے کافی تھے۔ لرزتے ہاتھوں سے انہوں نے تیسرے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھلنے کے بعد سامنے کا منظر دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہوگئے۔

"عمر! میرے بچے کیا ہوا؟" ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر وہ تینوں بھی اس کی طرف لپکی تھیں۔ سامنے گھر کے پانچوں افراد کرسیوں پہ اس حالت میں بیٹھے تھے کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے بندھے تھے اور منہ پر ٹیپ لگی تھی۔

وہ تینوں تو جیسے سکتے میں آگئی تھیں۔ ایسی صورت حال کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن عمر نے ہمت دکھائی اور سب کی رسیاں کھولنے لگے۔ عبیرہ بھاگ کر پانی لائی۔ شائستہ تو بالکل بے ہوش ہوچکی

تھیں۔ ربیعہ جلدی سے ان کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگی۔ چچا جان اور احمر تو پھر بھی حوصلے میں تھے۔ لیکن سعد اور فہد تو عمر بھائی سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ان کو یوں روتا دیکھ کر سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سب کو کچھ کچھ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ یقیناً" رات کو گھر میں چور ڈاکو گھس آئے ہوں گے۔ مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ کوئی چیز بھی اپنی جگہ سے ہلی ہوئی نہ تھی۔ کوئی بے ترتیبی کوئی سامان کا پھیلاوا نہ تھا۔ لیکن ابھی وہ کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اسی لیے یہ لوگ سوال جواب کرنے کی بجائے انہیں حوصلہ دے رہے تھے۔ پھر چچا جان نے ہمت کرکے انہیں بتایا کہ۔

"ہم لوگ جیسے ہی رات کو تمہارے گھر سے آئے تو دروازہ بجا۔ غلطی یہ ہوگئی کہ سعد نے بغیر پوچھے دروازہ کھول دیا۔ یہ سوچ کر کہ اتنی رات کو تم لوگوں میں سے ہی کوئی ہوگا' لیکن ایک دم دو مسلح افراد اندر گھس آئے۔ انہوں نے آتے ہی گن پوائنٹ پہ سب کو یہاں جمع کیا اور کرسیوں پہ بٹھا کر ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ ہم ہراساں تو ضرور ہوئے' لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ ان کا مقصد بہرحال ہمیں نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ شاید وہ کسی سے چھپ رہے تھے۔ ہو سکتا پولیس ان کے پیچھے لگی ہو۔ وہ صرف ہمارے گھر حفاظت سے یہ رات گزارنا چاہتے تھے۔ صبح ہوتے ہی ہمیں نقصان پہنچائے بغیر چلے گئے۔ لیکن پھر بھی ہمارے لیے یہ رات بڑی ہی خوفناک تھی۔" آخر میں وہ بڑی بے بسی سے بولے۔

"شکر کریں چچا جان! آپ لوگ خیریت سے ہیں اور کوئی نقصان بھی نہیں ہوا۔" عمر جو خود بہت پریشان ہوئے تھے۔ لیکن ان کو تسلی دینے کی غرض سے بولے۔

"لیکن بیٹا! اگر میرے بچوں کو کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی۔ احمر کے غصہ کرنے پر وہ اس کو مارنے کے لیے بڑھے تھے۔ لیکن پھر میری منتوں پر پیچھے ہٹ گئے۔" شائستہ کے آنسو تھمنے کا نام نہیں رہے تھے۔

"امی! پلیز چپ ہو جائیں۔ ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ خالہ جانی! آپ امی کو گھر لے جائیں۔ ہم لوگ بھی فریش ہو کے آتے ہیں۔" احمر نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"طاہرہ آپا! میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن آپ اب آئی ہیں جب نو بجنے والے ہیں اور عبیرہ تم بھی نہیں آئیں۔ حالانکہ مجھے لگ رہا تھا تم سب سے پہلے آؤ گی۔" وہ روتے ہوئے عبیرہ کو دیکھ کر بولیں اور عبیرہ جو کب سے ضبط کیے بیٹھی تھی ایک دم رو پڑی۔

"معاف کردیں خالہ جانی! غلطی ہو گئی۔" اور اس کے اس طرح بولنے پر سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"عمر بھائی! پلیز سب کو لے جائیں۔ دیکھیں بچے کتنے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔" احمر روتی ہوئی عبیرہ کو دیکھ کر بمشکل مسکراہٹ روکتے ہوئے بولا۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں سوائے احمر کے وہ سب عبیرہ کے گھر میں تھے۔ جہاں سب ان کی دل جوئی کر رہے تھے۔

"خالہ جانی ابھی تک رو رہی ہیں۔ انہیں لگ رہا ہے کہ ان خطرناک لوگوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ کہیں وہ پھر نہ آجائیں۔" "مجھے تو لگتا ہے اگر وہ اسی طرح روتی رہیں تو کہیں ان کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔" عبیرہ کچن میں تھی۔ جب ربیعہ بھابھی نے آکر اسے بتایا تھا۔

ویسے خالہ جانی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ ایسے لوگوں کا کیا بھروسا.... کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" عبیرہ بھی اس سارے قصے سے خوف زدہ تھی۔

"ارے عبیرہ! تم بھی بالکل خالہ جانی کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہو۔ رات کے اندھیرے میں ان لوگوں کو جو گھر پہلے نظر آیا۔ انہوں نے اس میں پناہ لے لی۔ اگر انہیں کسی کو نقصان پہنچانا ہوتا تو رات کو انہیں کون روک سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے' سب خیریت سے

ہیں۔ اب تم خالہ جانی کے سامنے پھر سے یہ موضوع نہ لے کر بیٹھ جانا۔ بلکہ کوشش کرنا کہ ان کا دھیان بٹ جائے اور جلدی سے جائے 'ناشتا ادھر پہنچاؤ۔ تمہارے بھائی کو قصاب کی طرف بھی جانا ہے۔ اس نے گیارہ بجے کا ٹائم دیا ہوا ہے۔ لیکن آج کے دن انہیں کہاں کچھ یاد رہتا ہے۔ بلانے جانا پڑے گا۔"

اور پھر ربیعہ اور عبیرہ نے سب کو اچھی طرح ناشتا کرایا۔ ساتھ اونچی آواز میں ٹی وی لگا دیا۔ جہاں مزاحیہ مشاعرہ نشر ہو رہا تھا اور قربانی کے حوالے سے بڑے اچھے چٹکلے سنائے جا رہے تھے۔ شاندار سے ناشتے کے ساتھ مزاحیہ مشاعرے نے سب کے موڈ کو بحال کر دیا۔ خاص کر سعد اور فہد تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ بچوں نے علیحدہ رونق لگائی ہوئی تھی۔

"ارے! یہ احمر کدھر رہ گیا۔ کہہ تو رہا تھا فریش ہو کے آتا ہوں۔ ابھی تک نہیں آیا۔" طاہرہ نے سب کو مسکراتے دیکھا تو سکون کا سانس لیا اور احمر کی کمی محسوس کرتے ہوئے وہ بولیں۔ سعد اور فہد دونوں ہی اس کو دیکھنے کے لیے اٹھے۔ ساتھ ہی عمر اور احمد علی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاکہ قصاب کو جا کر گھر لا سکیں۔ تب ہی عبیرہ نے سعد اور فہد کو روکا تھا۔

"ٹھہرو سعد! میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ بھابھی! میں بچوں کو بھی ادھر ہی لے جا رہی ہوں۔ کہیں بکروں کو ذبح ہوتے دیکھ کر بچے سہم نہ جائیں۔" اس نے احمر کے لیے ٹرے تیار کی اور بھابھی کو اطلاع دے کر بچوں 'سعد اور فہد کے ساتھ خالہ جانی کے گھر آگئی۔

"سعد چاچو! آپ نے پرامس کیا تھا کہ عید پہ آپ ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلیں گے تو پھر آج آپ کو اپنا پرامس پورا کرنا پڑے گا۔" بچوں کی ان سے خوب بنتی تھی۔ اسی لیے انہوں نے آتے ہی فرمائش کی وہ لوگ وہیں صحن میں کھیلنے لگے۔ عبیرہ برآمدے کی طرف آئی۔ جہاں احمر سیڑھیوں پہ بیٹھا نجانے کن خیالوں میں گم تھا۔

"احمر! تم ابھی تک ادھر بیٹھے ہو۔ آئے کیوں نہیں؟ چلو! جلدی سے یہ شیر خورما ٹیسٹ کرو اور بتاؤ کیسا بنا ہے۔ ویسے میں نے نہیں بنایا۔ امی نے بنایا ہے۔" اس کا دھیان بٹانے کے لیے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"پلیز عبیرہ! ابھی موڈ نہیں۔ اندر رکھ آؤ۔ بعد میں لے لوں گا۔" اس کا انداز بڑا الجھا ہوا سا تھا۔ عبیرہ نے پھر اصرار نہ کیا۔ خاموشی سے ٹرے جا کر کچن میں رکھ آئی اور واپس آ کر اس کے پاس سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔

"احمر! تم کو دکھ ہو رہا ہے کہ تم رات کو دوستوں کے ساتھ نہیں جا سکے۔ لیکن اس میں اتنا اداس ہونے والی کیا بات ہے۔ تم آج چلے جانا۔ انجوائے کرنے کے لیے تو پوری زندگی پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ سب خیریت سے ہیں اور مالی نقصان بھی نہیں ہوا۔" اس نے احمر کی اداسی کو اپنے انداز سے جانچا تھا۔ احمر نے پاس بیٹھی اس پر خلوص سی لڑکی کو دیکھا۔ جو معمول سے ہٹ کر آج کافی تیار تھی اور اس کی گندمی رنگت ڈارک میرون کپڑوں میں بہت کھل رہی تھی۔ احمر اس کی بات سن کر ہولے سے مسکرا دیا۔

"عبیرہ! ایک بات تو بتاؤ۔ تم مجھے ایسے کیوں ٹریٹ کرتی ہو جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ظاہر ہے جب تم بچوں کی طرح بی ہیو کرو گے تو ہم لوگ بھی تمہیں اسی طرح ٹریٹ کریں گے نا۔" آج احمر کا موڈ اچھا تھا۔ اسی لیے وہ بھی خائف ہوئے بغیر بولی۔

"لیکن عبیرہ! نہ تو میں وہ بات سوچ رہا ہوں جو تم سمجھ رہی ہو اور نہ ہی میں اداس ہوں۔ ہاں! حیران ضرور ہوں اور نادم بھی۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد ابھی کچھ دیر پہلے مجھے میرے انہی دوستوں میں سے ایک نے کال کی تھی۔ جن کے ساتھ میرا چاند رات کا پروگرام تھا اور اس نے مجھے جو کچھ بتایا۔ میں شاکڈ رہ گیا۔ پتا ہے وہ کہاں سے بول رہا تھا۔" بات کرتے ہوئے اس نے ایک دم عبیرہ کی طرف دیکھا اور

عبیرہ جو اس کی بات غور سے سن رہی تھی۔ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

"وہ تھانے سے بول رہا تھا عبیرہ! وہ تینوں ہی اس وقت تھانے میں بند ہیں۔" عبیرہ کو بھی اس کی بات سن کر دھچکا سا لگا۔

"لیکن کیوں؟ انہوں نے ایسا کیا کیا کہ عید والے دن وہ تھانے میں ہیں؟"

"وہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے رات کو بہت انجوائے کیا۔ میرے فون پر بھی ٹرائی کرتے رہے۔ لیکن میرا فون تو رات کو ان لوگوں نے آف کر دیا تھا.... تو رابطہ نہ ہو سکا۔ خیر! جب وہ لوگ واپس آ رہے تھے یونہی موج مستی کے موڈ میں تھے۔" تو ان کی گاڑی سے ایک موٹر سائیکل کی ٹکر ہو گئی۔ اس پر دو لوگ سوار تھے۔ ایک شخص اتنا شدید زخمی ہوا ہے کہ اس کے بچنے کی امید کم ہی ہے۔ چاند رات کو لوگوں کی سیکورٹی کے لیے پولیس بھی جگہ جگہ گھوم رہی ہوتی ہے۔ اس لیے اسی وقت دھر لیے گئے۔ حالانکہ ان تینوں ہی کے والد اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ صرف ایک فون کال پہ ہی پولیس نے ان کو چھوڑ دینا تھا، لیکن ان لوگوں کو گھر اطلاع دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ موٹر سائیکل پر موجود دوسرا شخص جو کہ زخمی کا سگا بھائی ہے۔ اس نے میرے دوستوں کے خلاف رپورٹ درج کرا دی۔ اوپر سے عید کی تین چھٹیاں ہیں۔ آگے سنڈے آ رہا ہے۔ کورٹ میں بھی چھٹی ہے۔ ان کے پیرنٹس ان کی ضمانت کے لیے بھی کوئی کارروائی بھی نہیں کر سکتے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ عید جیسے خوشی کے موقع پر ان کے گھروں میں بہت پریشانی ہو گی۔ لیکن وہ شخص جو زندگی اور موت کی کشمکش میں اسپتال میں پڑا ہے۔ اس کے گھر والوں پہ کیا بیت رہی ہو گی۔" بات کرتے ہوئے وہ بہت افسردہ لگ رہا تھا۔

عبیرہ اس کی بات سن کر بہت پریشان ہو گئی۔ وہ احمر کی تسلی کے لیے کچھ بھی نہ بول سکی۔ دونوں کے درمیان چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

"عبیرہ! میں نے سب کو بہت تنگ کیا ہے نا؟ خاص طور پر امی کو اور تمہیں۔ پیسوں کے نہ ملنے پر تو میں تم سے ناراض بھی ہو گیا تھا۔ میں نے تمہیں ایموشنلی بلیک میل کیا۔ مجھے معلوم ہے نا تم میری ناراضی برداشت نہیں کر سکتیں۔ اور تم میری بات مان لو گی۔ پھر تم نے مان بھی لی۔ صرف میری خوشی کے لیے۔ عبیرہ! میں بہت خود غرض ہوں؟ نا صرف اپنے بارے میں، اپنی خوشی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ لیکن یہ میری غلطی ہے۔ میں تو صحیح طرح سے اپنے آپ کو نہ جان سکا۔ رات کو مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اپنوں کو تکلیف میں دیکھ کر انسان کو کتنی اذیت پہنچتی ہے۔ رات کو جب میں امی کو روتا ہوا دیکھ رہا تھا تو مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا، میں ان غنڈوں کو شوٹ کر دوں۔ لیکن اب میرا دل چاہ رہا ہے۔ وہ مجھے ملیں اور میں ان کا شکریہ ادا کروں کہ وہ تو میرے اپنوں کو تکلیف سے بچانے کا وسیلہ بنے ہیں۔ ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ اس فقرے کے معنی کو میں کبھی پا ہی نہیں سکا۔ لیکن آج مجھے اس بات کی سچائی کا ادراک ہوا ہے۔ سوچو عبیرہ! اگر کل وہ غنڈے ہمارے گھر میں نہ گھستے اور رات ہمارے گھر میں نہ گزارتے تو ظاہر ہے میں تو دوستوں کے ساتھ چلا جاتا۔ اور پھر ابھی میں بھی ان کے ساتھ جیل میں ہوتا۔ میں کب سے یہی سوچ رہا ہوں کہ اس وقت تم لوگوں کا کیا حال ہوتا۔ امی تو میری ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتیں۔ ان کی کیا حالت ہوتی۔ سعد اور فہد تو رات کو بھی بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ وہ کیسے برداشت کرتے؟ اور ابو.... جنہوں نے ساری زندگی بڑی عزت سے گزاری ہے.... میری وجہ سے ان کی ساکھ کتنی خراب ہوتی اور میری تو پوچھو مت.... میرے دوستوں کے والد تو اپنا اثر و رسوخ اور پیسہ لگا کر اپنے بیٹوں کو آزاد کروا لیتے۔ ابو تو ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے سارا ملبہ مجھ پہ ہی گرتا۔ امی صحیح کہتی ہیں۔ مجھے دوستی اپنے ہم پلہ لوگوں سے کرنی چاہیے۔" عبیرہ! تمہیں اندازہ نہیں ان دنوں میں نے امی سے کتنی بحث کی ہے۔ میں نے پہلے ہی امی کی

بات کیوں نہ مانی؟ میں نے تم کو تنگ کیوں کیا؟ میں سب کچھ حق سمجھ کر کیوں وصول کرتا ہوں؟ میں بہت برا ہوں نا' بہت برا؟"

افسردگی سے بولتے ہوئے اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پہ گرا لیا۔ اس کو یوں پریشان دیکھ کر عبیرہ بھی دکھی ہو گئی۔

"احمر! تم یہ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو کہ اگر ایسا ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ لیکن تمہیں پریشان ہونے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ بے شک گزری ہوئی رات ہماری پریشانی کا سبب بنی ہے۔ لیکن ہم بڑی پریشانیوں سے بچ بھی تو گئے ہیں اور تمہیں اس بات کا احساس بھی ہو گیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔

"اور احمر! یہ ہماری سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے' جو ہم اپنے تہواروں کو بازاروں' ہوٹلوں اور کلبوں جیسی جگہوں سے منسلک کر دیتے ہیں۔ اگر تہوار سادگی سے اپنی حیثیت کے مطابق گزاریں تو صحیح معنوں میں خوشی کا احساس بھی ملتا ہے اور انسان پر سکون بھی رہتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اپنوں کا ساتھ ملتا ہے۔" آخر میں وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"تو یہی باتیں تم مجھے پہلے بھی تو بتا سکتی تھیں نا؟ کیوں میری بات مانی؟" احمر مصنوعی خفگی سے بولا۔

"آج تو تمہیں خود احساس ہوا ہے تو بولے جا رہی ہوں۔ ورنہ تمہارے پاس مجھے تنگ کرنے کے لیے ایک طریقہ ناراضی ہے نا' اور....."

"عبیرہ آپی! پلیز اب ان بچوں کو خود سنبھالیں۔ کیونکہ ہم تو تھک گئے ہیں۔ لیکن ان کا تھکنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں۔" فہد نے آکر اس کو بچوں کی طرف متوجہ کیا تھا اور ان کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

"احمر چاچو! عبیرہ پھوپھو! آپ آئیں نا' ہمارے ساتھ کھیلیں۔" پنکی اپنا پھولا پھولا سا چہرہ لیے بڑے لاڈ سے ان دونوں سے فرمائش کر رہی تھی۔ جس پر وہ دونوں ہی مسکرا دیے۔

"عبیرہ! بچوں کو نئے ڈریس تم نے ہی لے کر دیے ہیں نا؟" احمر نے اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ جواب میں عبیرہ نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

"کیسے؟"

"تم ان باتوں کو چھوڑو۔ بچے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے احمر کا دھیان بٹانا چاہا۔

"عبیرہ! میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔" احمر وہیں کھڑا بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ عبیرہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

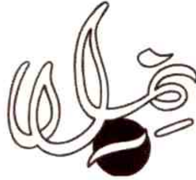
"ایک دوست سے قرض لیا تھا۔ اگلے مہینے واپس کر دوں گی۔" وہ ایسے شرمندہ ہو رہی تھی۔ جیسے غلطی احمر کی نہیں اسی کی ہو۔ اس کی بات سن کر احمر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"سوری عبیرہ! میں نے تمہیں ہرٹ کیا..... تمہیں مشکل میں ڈالا۔ لیکن افسوس اس بات پر ہو رہا ہے کہ اب اس احساس کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ تم میں اور مجھ میں یہی تو فرق ہے۔ میں صرف اپنے لیے سوچتا ہوں اور تم سب کے لیے سوچتی ہو۔ تم یہ رکھو..... عید کے بعد اپنی دوست کو اس کی رقم لوٹا دینا۔" احمر نے وہی والٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اور اس کو یوں شرمندہ دیکھ کر عبیرہ کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔

"احمر! پلیز اب اتنا بھی منہ لٹکانے کی ضرورت نہیں۔ چلو جلدی سے بچوں کے ساتھ کھیلو۔ پھر قربانی ہو جائے گی تو سب میں گوشت بانٹیں گے۔ ساتھ ساتھ اس زخمی کے اور تمہارے دوستوں کے لیے دعا کریں گے اور اپنی خوشیوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کریں گے۔" آنکھوں میں جگنوؤں کی سی چمک لیے وہ سادہ دل سی مخلص لڑکی احمر کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت لگی تھی۔



نمرہ احمد



فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف فارس غازی کا بھانجا ہے۔ جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے' حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی

مکمل ناول



یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مرجاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی، سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے، جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

فارس غازی، ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے، رہائش پذیر تھا۔ فارس غازی کے جیل جانے کے بعد اس کا پورشن مقفل ہے۔

سعدی یوسف کے لیے وہ دن خوشیوں سے بھرپور تھا جب اسے فارس غازی کے رہا ہونے کی خبر ملتی ہے۔

ہاشم نے یہ خبر سن کر عہد کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے تو اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔ فارس غازی جیل سے نکلتا ہے تو سعدی یوسف ان کا منتظر ہوتا ہے۔ فارس اس سے قبرستان چلنے کو کہتا ہے۔ قبرستان جا کر فارس دو قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے سعدی کا موبائل لے لیتا ہے۔ قبرستان میں وہ کسی کو فون کر کے کوئی ہتھیار منگواتا ہے۔

ہاشم کاردار، زمر کو اپنی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دینے کے ساتھ سعدی کا کارڈ بھی زمر کو دے دیتا ہے۔

زمر کے والد کو اپنے پوتے سعدی یوسف سے بہت محبت ہے۔ وہ زمر سے کہتے ہیں، سعدی کی سالگرہ پر وش کرنے ان کے گھر جائے۔ وہ پھول لے کر کارڈ دینے سعدی کے گھر جاتی ہے۔ زمر کو دیکھ کر سعدی کے ساتھ تمام گھر والے حیران ہو جاتے ہیں۔ زمر، سعدی کو سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دیتی ہے۔

زمر کے جانے کے بعد سعدی نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔ اسی وقت ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔ اس نے ہوٹل میں ہاشم کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگایا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سعدی نے جب بیگ سے ٹیبلٹ نکالا تو اسے پریس کرنے کے بعد اسکرین پہ پیغام آیا کہ آپ کی ڈیوائس کو ایک ہارڈ ڈرائیو ملی ہے "کیا آپ سارا ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟" سعدی نے مسکراتے ہوئے "یس" دبایا۔ اسکرین پہ دوسرا پیغام دیکھ کر سعدی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

اسکرین پہ پیغام جل بجھ رہا تھا کہ "پاس ورڈ داخل کریں" سعدی کے پاس 'پاس ورڈ' نہیں تھا۔

سعدی یوسف، ہاشم کاردار کی سابقہ بیوی شہرین سے ایک شاپنگ مال میں مل کر کہتا ہے۔ مجھے آپ سے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔ شہرین، سعدی سے کہتی ہے کہ "تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" سعدی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے کہ "ہاشم بھائی نے جو ہم سے چرایا تھا، میں وہ واپس چرانے جا رہا ہوں۔"

شہرین نوشیرواں کے پاس جا کر کہتی ہے کہ سونیا کو اس کی اور ہاشم کی ہنی مون کی پکچرز چاہئیں۔ یہ جھوٹ بول کر نہایت چالاکی سے شہرین نوشیرواں سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

حنین یوسف پر اس کی دوست کی وجہ سے کمرہ امتحان میں نقل کا الزام لگتا ہے ٹیچرز حنین سے کہتی ہیں کہ اس پر کیس بنے گا اور وہ تین سال تک پیپرز نہیں دے سکتی۔ وہ حنین کو آفس میں بٹھا کر چلی جاتی ہیں تو حنین کی نظر میز پہ سپرٹنڈنٹ کے پرس کے ساتھ رکھے موبائل پر پڑتی ہے۔ حنین موبائل اٹھا کر دھڑکتے دل سے ہاشم کا نمبر ملا کر اسے تمام صورت حال

سے آگاہ کرتی ہے۔ ہاشم کچھ دیر بعد ہی امتحانی مرکز میں پہنچ جاتا ہے اور کمال ہوشیاری سے حنین کو مشکل وقت سے نہ صرف نکلوا تا ہے بلکہ حنین کو پیپر مکمل کرنے کے لیے ٹیچرز سے ایکسٹرا ٹائم بھی دلوا دیتا ہے۔

پیپر دینے کے بعد حنین ہاشم کا شکریہ ادا کرتی ہے اور ہاشم سے کہتی ہے۔ کہ سعدی بھائی کو اس معاملے کے بارے میں مت بتائیے گا۔ ہاشم حنین سے پارٹی میں آنے کا پوچھتا ہے۔ جس پر حنین کہتی ہے کہ پارٹی میں ہم سب آئیں گے۔

قصر کے سبزہ زار میں سیاہ شام سنہرے تاروں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ روشنیاں، قہقہے، سیاہ اور سنہری امتزاج سے سجی سونیا کی سالگرہ کی تقریب کی رونق عروج پر تھی۔

حنین سنہری فراک میں جبکہ سعدی، نسیم اور زمر سیاہ سوٹ میں ملبوس تقریب میں شریک تھے۔ شہرین ان کی میز کے پاس آکر زمر کو ڈی اے کہہ کر پکارتی ہے اور سعدی سے رسمی سا حال احوال پوچھ کر کمال مہارت سے نیب پکڑا کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ سعدی نیب کو کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر سوچتا ہے کہ آدھا کام ہو گیا مگر ابھی پاس ورڈ لینا باقی ہے۔

جواہرات دو، تین خواتین کے ساتھ سعدی اور زمر کی میز کی طرف آتی ہے۔ جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کا تعارف کرواتی ہے پھر سعدی یوسف کا تعارف بھی کروا کر سعدی سے کہتی ہے کہ وہ اپنا شجرہ نسب ان خواتین کو بتائے۔ نوشیرواں قدرے فاصلے پر کھڑا تند نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ سعدی سمجھ جاتا ہے کہ جواہرات اس وقت نوشیرواں کی بے عزتی کا بدلہ اتار رہی ہے، پھر سعدی اپنا شجرہ نسب ایسا بتاتا ہے کہ جس سے نوشیرواں کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور جواہرات کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اسی دوران جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کے سابقہ منگیتر حماد کا ذکر چھیڑ دیتی ہے، جس کی وجہ سے زمر ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

شہرین بڑی ہوشیاری سے سعدی کو پاس ورڈ بتا دیتی ہے۔

دوسری جانب زمر کا گیسٹ روم میں فارس سے سامنا ہو جاتا ہے فارس کو دیکھ کر زمر غصے میں باہر کی طرف آجاتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے، ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم غصے میں خاور سے کہتا ہے کہ سعدی جیسے ہی ایگزٹ پر پہنچے، اسے روکو۔ جبکہ ملازمہ فیونا ہاشم کے کہنے پر جان بوجھ کر سعدی سے ٹکراتی ہے اور اس کے کوٹ میں نیکلس ڈال کر معذرت کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔

جیسے ہی زمر، سعدی، حنین اور نسیم گھر جا رہے ہوتے ہیں تو خاور انہیں روک کر بتاتا ہے کہ مسز جواہرات کا نیکلس چوری ہو گیا ہے، زمر غصے میں خاور سے کہتی ہے کہ یہ میری فیملی کے بچے ہیں، ان کی تلاشی لینے سے پہلے میری تلاشی لینا ہو گی۔ اس دوران ہاشم بھی وہاں آجاتا ہے اور پھر بگڑتی صورت حال دیکھ کر انہیں جانے دیتا ہے۔

ریسٹورنٹ کا بل دینے کے لیے سعدی حنین سے اپنے کوٹ سے والٹ نکالنے کو کہتا ہے، حنین کے ہاتھ میں والٹ کے بجائے نیکلس آجاتا ہے۔ زمر کی نگاہیں نیکلس کو دیکھ کر ٹھہر جاتی ہیں، زمر غصے میں سعدی کو کہتی ہے اسے گھر ڈراپ کر دے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شیرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔

دوسری جانب بڑے ابا زمر پر یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گروہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

زمر سعدی کے ریسٹورنٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ بڑے ابا نے اسے بتا دیا ہے کہ اسے گروہ کسی خاتون نے نہیں بلکہ اس نے دیا ہے۔ اسی دوران فارس وہاں آجاتا ہے جسے دیکھ کر زمر نفرت آمیز نگاہ فارس پر ڈال کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔

سعدی بہت دنوں بعد آفس جاتا ہے اور اپنی باس سارہ کو فیلڈ رپورٹ دے کر کہتا ہے کہ اس نے کام مکمل کر لیا ہے، اور فیلڈ پہ جانے کی تیاری بھی مکمل کر لی ہے۔

مرحوم ذوالفقار یوسف کے گھر میں سعدی کے دادا، پھپھو زمر، والدہ اور بہن بھائی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسی دوران حنین سعدی کے کمرے میں جاتی ہے تو وہاں سعدی کے کھلے لیپ ٹاپ کے اسکرین پہ چلتے نمبرز دیکھ کر حیران ہوتی ہے سعدی جلدی سے آکر لیپ ٹاپ میں اپنا ایک ہاتھ مار کر بند کر دیتا ہے۔

ہاشم سعدی سے ملاقات کا کہتا ہے۔ وہ ہاشم کو ٹالنے کے لیے ہاں کہہ دیتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکرمند ہے۔

حنین اپنے اور سیم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مخملیں ڈبے پر پڑتی ہے تو اس کے اندر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر پرویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں "اینننس ایور آفٹر" کندہ تھا۔ یہ سعدی کی چین کا جڑواں تھا۔

سعدی زمر سے ایک رشتے دار کی شادی میں جانے کا پوچھتا ہے۔ جس میں زمر کا سابق منگیتر حماد بھی آئے گا۔ زمر سعدی سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو وہ شادی میں جائے گی یہ بات جب بڑے ابا کو پتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔

ہاشم کی سیکریٹری کال کر کے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا، وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔

ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جا سکتے ہیں! جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔

دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہو گئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔

۴

چوتھی قسط

انسان دوست

اگر تم حوصلہ مجتمع رکھ سکو جب ارد گرد
سب ہمت کھو رہے ہوں اور تم کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہوں
اگر تم خود پہ بھروسا کر سکو جب سب تم پر شک کریں
مگران کو شک کی اجازت بھی دو
اگر تم انتظار کر سکو اور انتظار سے تھکو نہیں
یا تم سے جھوٹ بولا جائے مگر تم نہ بولو
یا تم سے نفرت کی جائے مگر تم نفرت کو راستہ نہ دو
اور پھر بھی نہ تم بہت اچھے لگو نہ بہت عقل مند
اگر تم خواب دیکھ سکو اور خوابوں کو اپنا آقا نہ بناؤ
اگر تم سوچ سکو مگر سوچوں کو اپنا مقصد نہ بناؤ
اگر تم "فتح" اور "تباہی" دونوں سے مل سکو
اور ان دونوں دھوکے بازوں سے ایک جیسا سلوک کر سکو
اگر تم اپنے بارے بولا گیا سچ سننے کی ہمت کر سکو،
جسے نادانوں کو بھکانے کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کیا

جائے
یا جن چیزوں کو تم نے اپنی زندگی دے ڈالی' ان کو ٹوٹا ہوا دیکھ سکو
اور پھر جھک کر ان کو گھسے پٹے اوزاروں سے دوبارہ تعمیر کر سکو
اگر تم ہجوم سے بات کرو اور اپنے اندر کی اچھائی بھی برقرار رکھو
یا بادشاہوں کے ساتھ چلو اور اپنا عام ہونے کا احساس بھی نہ کھو سکو
اگر نہ دشمن' نہ دوست تم کو دکھ دے سکیں
اگر تم بے رحم منٹ کو بھر سکو' ساٹھ سیکنڈ جتنے فاصلے کی دوڑ سے
تب۔۔۔ ہاں تب
تمہاری ہو گی یہ زمین اور جو اس میں ہے
اور سب سے بڑھ کر
تب تم ہو گے ایک "انسان" "میرے بچے!"
(کپلنگ کی نظم "اگر")



تم ناحق ٹکڑے چن چن کر دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیا آس لگائے بیٹھے ہو

گھر آ کر سعدی نے سب سے پہلے حنین کے کمرے میں جھانکا' پھر یاد آیا' وہ اس وقت ٹیوشن اکیڈمی گئی ہوتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر پیکنگ کرتا رہا۔ جب مغرب کے قریب لاؤنج سے باتوں اور ٹی وی کی آوازیں بلند ہوئیں تو وہ باہر آیا۔ حنین بیگ صوفے پہ رکھ کر (یعنی کہ پھینک کر) کچن میں گھس گئی تھی۔ وہ چوکھٹ پہ جا کھڑا ہوا۔
"ایک بری خبر ہے۔" مسکراہٹ دبائے بات کا آغاز کیا۔ وہ فریج سے کھانا نکالنے میں مصروف تھی' مصروف ہی رہی۔
"میں نے آج نوشیرواں کے گھر تمہاری گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست دیکھی۔ معذرت کے ساتھ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اب آپ پہلے نمبر پہ نہیں ہیں۔"
"ڈنر خراب نہ کرو بھائی! مجھے پتا ہے' میں ہی ٹاپ پہ ہوں۔" وہ خفگی سے اسے دیکھ کر پلیٹ لیے لاؤنج میں چلی آئی۔ کمپیوٹر چیئر کھینچی' بٹن دبایا' ساتھ ہی لقمہ توڑا۔
"آخری دفعہ کب چیک کیا تم نے؟" وہ بھی ساتھ آ کھڑا ہوا۔
"پرسوں۔ آپ کو پتا ہے میں دو دن ٹیسٹ کی تیاری میں رہی۔ اس لیے کھول نہیں سکی تو آپ مجھے بنا رہے ہیں۔" ایک ہاتھ سے کھاتے' دوسرے سے ماؤس چلاتے' وہ ای میل کھول رہی تھی۔ پھر لبوں پہ مسکراہٹ آئی' انگلی سے عینک پیچھے کی۔
"کاردار صاحب کی ای میل آئی ہے۔" سعدی نے بھی آگے ہو کر پڑھا۔ حنین نے ان کو چار پانچ روز قبل موویز کی ایک فہرست بھیجی تھی جو ان کو دیکھنی چاہئیں جس کے جواب میں انہوں نے **"تھینکس"** لکھ کر بھیجا تھا۔ ساتھ ایک اسمائل بھی تھی۔
حنین مسکرا کر اپنی گیم والی سائٹ کھولنے لگی۔ پھر سب سے پہلے فہرست سامنے لائی۔ اپنا نام ڈھونڈا' مسکراہٹ غائب ہوئی۔ وہ پلیٹ رکھ کے آگے ہوئی۔ وہ دوسرے نمبر پہ تھی اور پہلے پہ کوئی اور تھا۔
"یہ کون ہے؟ اور اس نے کب؟" وہ حیران اور ذرا غصے میں اس کی پروفائل کھول کر دیکھنے لگی۔ مونٹ' اور تعلق امریکہ سے اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔
"آنٹس ایور آفٹر Ants ever after اس کا کیا مطلب ہوا؟"
بمشکل مسکراہٹ روکے سعدی نے شانے اچکا دیے۔ حنین اب نچلا لب دبائے بے چینی سے ادھر ادھر صفحے کھول رہی تھی۔ وہ بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ بہنوں کو تنگ کرنے سے زیادہ لطف بھی ہوتا ہے' کسی چیز میں بھلا؟
"آخر اس نے جیلی والا راؤنڈ کیسے پار کیا؟ اور ایک

دم سے ٹاپ پہ کیسے آ گئی؟"

سعدی اسے تنگ کر چکا تھا' سو مسکرا کر کچن میں امی کے پاس چلا گیا۔ وہ اب بھی ویسے ہی لب کاٹ رہی تھی۔ پھر کچھ دیر سوچتی رہی اور اس کو پیغام بھیجا۔ کھانا وانا سب بھول گیا تھا۔

"ہائے!"

"ہیلو۔" اگلے ہی منٹ جواب آیا۔ حنین کی بورڈ پہ انگلیاں رکھے' اسکرین کو دیکھتی ٹائپ کر رہی تھی۔

"آپ نے جیلی والا راؤنڈ کیسے پار کیا؟"

ذرا توقف سے جواب چمکا۔ "نارملی ہم بات کا آغاز حال احوال پوچھنے سے کرتے ہیں۔"

"میں نارمل نہیں ہوں' میں حنین ہوں۔ اب بتاؤ' تم نے وہ راؤنڈ کیسے پار کیا؟"

"محنت کی' بار بار کوشش اور ہو گیا۔ تو تم حنین ہو پاکستان سے؟"

"ہاں اور تم کون ہو امریکہ سے؟" وہ ابھی بھی متعصب انداز میں خفگی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں پہلے مسکراتا ہوا نشان ابھرا اور پھر پیغام۔

"میں علیشا ہوں (Alicia) ورجینیا سے اور میرے آباواجداد فرانسیسی ہیں۔"

(فرنچ امریکن؟) حنین نے مشکوک نظروں سے اسکرین کو گھورا۔ "میں کیسے یقین کر لوں کہ تم وہی ہو جو تم کہہ رہی ہو؟"

"او کے' میں کیمرہ آن کر دیتی ہوں۔ مجھے اس ہائی اسکورر سے بات کر کے اچھا لگے گا جس کا ریکارڈ میں نے توڑا ہے۔"

اور اس نے کیمرہ چیٹ آن بھی کر دی۔ حنین کے لیے اتنی جلدی یہ غیر متوقع تھا پھر بھی اس نے کانوں پہ ہیڈ فون چڑھا لیے' اپنا کیمرہ مگر آن نہیں کیا۔ (ورنہ امی نے کچن سے جوتا پھینکنا تھا) کانوں میں خوب صورت سی آواز گونجی۔ "کیا تم مجھے دیکھ سکتی ہو؟"

اسکرین پہ چوکھٹا بنا تھا جس میں ایک چھوٹا سا بیڈ روم نظر آ رہا تھا۔ علیشا کی پشت پہ دیوار پہ شیشہ تھا جو کمپیوٹر ٹیبل کا عکس دکھاتا تھا۔ وہ واقعی امریکی لڑکی تھی۔ سترہ' اٹھارہ برس کی' بال سیاہ تھے' شولڈر کٹ' بہت گوری' بڑی بڑی آنکھیں' کسی ہلکے رنگ کی اور بہت پیاری مسکراہٹ۔ اسکرین پہ اس نے ہاتھ ہلایا' وہ بھی اتنا مسکرا کر کہ حنین کے ناراض اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ذرا پرجوش سی ہو کر آگے ہوئی' بات کرنے لگی۔

"تو تم فرنچ امریکن ہو۔"

"ہاں' مگر میں خود کو امریکن کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں۔" وہ پھر ہنسی۔ اسے ہنسنے کی عادت تھی۔

"لیکن تم اپنے نام سے کیوں نہیں آتیں اور تمہارے اس نک نیم کا کیا مطلب ہوا؟"

"اوہ! وہ..." اس نے لاپروائی سے شانے اچکاتے ہوئے جھک کر دراز سے کچھ نکالا۔

"وہ تو ایک عبارت ہے جو میری کی چین پہ لکھی ہوئی ہے۔" ساتھ ہی سیاہ پتھر والی کی چین لہرائی اور وہیں میز پہ رکھ دی۔ "مجھے خود بھی اس کا مفہوم نہیں پتا۔"

"اچھا وہ جیلی والا راؤنڈ۔" حنین کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"ایک دو ٹپس بتا سکتی ہوں میں۔" علیشا دائیں ہتھیلی پہ ٹھوڑی گرائے آگے ہو کر بیٹھی بولنے لگی۔ حنین بہت غور سے سن رہی تھی۔ جب سعدی وہاں سے گزر کر کمرے میں جانے لگا۔ اسکرین دیکھ کر رستے میں رکا' اشارے سے پوچھا کہ کون ہے؟ حنین نے مائیک پہ ہاتھ رکھ کر بتایا "میری نئی دوست" اور فوراً" دوبارہ وہیں متوجہ ہو گئی۔

وہ ابرو اچکا کر کمرے کی طرف چلا گیا...

فون کی گھنٹی بجی تو سعدی چونکا' اور ادھر ادھر اجنبی نظروں سے دیکھا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ سات سال گزر چکے تھے اور سب کچھ بدل چکا تھا۔

تکان سے سر جھٹک کر اس نے فون اٹھایا جو ابھی تک ہاشم کی کال کے بعد سے گرم تھا۔

"جی' میں آپ کو بھیجتا ہوں۔" آفس میں سے کسی کی کال تھی' وہ سرہلا کر کہتا' لیپ ٹاپ اسکرین کو دیکھ رہا تھا جہاں اس نے غلط کمانڈ دے کر اپنے ڈیٹا کو کرپٹ کر دیا تھا۔ اب دوبارہ سے ہاشم کی فائلز وہ کیسے لے گا؟

اف!

اس نے فون رکھ کر سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

ذہن خالی خالی سا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت

بینکوئٹ ہال میں اندھیری شام اس پل خوب روشن تھی۔ موسیقی' قہقہے' رنگ' اسٹیج پہ دولہا دلہن کے ساتھ رش لگا تھا' تصویریں اتروائی جارہی تھیں۔ گروپ فوٹوز' ہیپی اینڈنگز۔ فیری ٹیلز۔

دوسری جانب کھانا کھل چکا تھا۔ بوفے اسٹینڈ کی طرف جانے والوں میں حنین اور سیم بھی تھے۔ حنین ہلکی گلابی لمبی فراک اور چوڑی دار میں پاجامے میں ملبوس تھی اور سیم کا کرتا شلوار تھا۔ وہ قد میں حنہ کے کان تک آتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے وہ ذرا آگے نکلنے لگا تو بہن نے کہنی سے پکڑ کر قریب کیا۔ اور تفتیشی انداز میں گھورا۔

"موٹے آلو.... ایک منٹ۔ شادی میں کھانے کے تین اصول یاد ہیں نا؟"

"بالکل!" وہ مڑا اور اس کو دیکھتے ہوئے انگلیوں پہ گنوانے لگا۔ "پہلا اصول' وہ چیزیں نہیں کھانی جو صرف معدہ بھرتی ہیں جیسے چاول' روٹی اور سلاد۔ دوسرا جو عام طور پہ کھاتے رہتے ہیں جیسے مرغی اور بیف' ان پہ زیادہ قیمتی گوشت کو ترجیح دینی ہے جیسے مٹن اور پراڈنز تیسرا اور آخری اصول' یہ سب اپنا آخری کھانا سمجھ کر کھانا ہے۔"

"درست!" اس نے رعب سے سر کو خم دیا اور پھر دونوں ساتھ ساتھ آگے آئے' پلیٹیں اٹھائیں' تنقیدی نگاہ سے دور تک بوفے ڈشز کا جائزہ لیا۔ پھر باربی کیو کو دیکھ کر حنین کی آنکھیں چمکیں۔ دونوں پراعتماد چال چلتے اس طرف آئے۔

زمر بھی وہیں کھڑی تھی' نفاست سے پلیٹ میں ذرا سا کھانا ڈالتی۔ آج بھی سیاہ رنگ پہنا تھا۔ گھنگھریالے بال بھی ویسے ہی آدھے بندھے تھے۔ حنین اسے نظر انداز کر کے اپنی پلیٹ بھرنے لگی۔

زمر نے سر اٹھایا تو وہ ساتھ کھڑی تھی۔ وہ لوگ اکٹھے ہی آئے تھے اور تب سے دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ زمر ذرا سا مڑی اور میز پہ رکھے مایونیز کے بھرے پیالوں میں سے ایک اٹھا کر حنین کی طرف بڑھایا۔

حنین نے یوں ظاہر کیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ کھانا ڈال کر اس میز کی طرف آئی' ایک اور پیالہ اٹھایا اور دوسری طرف مڑ گئی۔ زمر کی مسکراہٹ پھیکی پڑی' پیالہ ہاتھ میں رہ گیا۔

"پھپھو! یہ میں لے لوں۔" سیم نے جلدی سے اس کو شرمندگی سے بچایا' زمر مسکرا دی۔

حنین نے سن لیا تھا' مگر سنجیدگی سے پلیٹ میں گریوی ڈالتی رہی۔ چمچ رکھا تو ایک مہندی والے ہاتھ نے اسے اٹھالیا۔ بے اختیار اس کی نگاہیں اٹھیں۔

وہ کرن تھی۔ کام دار لباس' زیور' میک اپ' ذرا بھری بھری سی' ہنستی مسکراتی۔ ساتھ میں اس کی کوئی کزن بھی تھی۔ وہ اس سے بات کرتے ہوئے کھانا ڈال رہی تھی۔ حنین کی نگاہ مزید پیچھے گئی۔ قریب ہی ایک میز پہ اس کی ساس تھیں' نوکرانی تھی' دو جڑواں بچے تھے جن کو ہر کوئی رک کر' جھک جھک کر پیار کر رہا تھا۔

حنین نے بے اختیار مڑ کر زمر کو دیکھا۔ وہ دیکھ چکی تھی' اور اب سنجیدگی سے رخ موڑ گئی تھی۔ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کسی کے پاس وہ دیکھنا جو آپ سے چھینا گیا ہو۔ حنین پیچھے مڑی کہ پھپھو کے ہاتھ سے مایونیز کا پیالہ تھام لے مگر وہ اب سیم کے پاس تھا۔ اب دیر ہو چکی تھی۔

"حماد!" اس نے نام کی پکار پڑتی سنی تو ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اپنی ماں کی میز پہ جھک کر کسی سے مل رہا تھا۔ گلاسز لگائے ہوئے' اچھی شکل کا تھا مگر اس وقت وہ اسے زہر لگ رہا تھا۔ ذرا دبے دبے غصے سے وہ کھانا نکال کر زمر کے برابر آکھڑی ہوئی۔ امی' اور بھائی دور کسی ٹیبل پہ تھے' مگر وہ تینوں یہیں کھڑے رہے۔

"یہ کرلی بالوں والی پراسیکیوٹر تھی نا' حماد بھائی کی ایکس فیانسی؟" کرن کی کزن نے اونچی سی سرگوشی کی۔ ان دونوں کی طرف ان کی پشت تھی' مگر آواز کا راستہ کون روک سکا ہے بھلا۔

کرن نے ترچھے ہو کر دیکھا اور پھر شانے اچکا کر کھانا نکالتے ہوئے بولی۔

"تھی نہیں' وہ اب بھی پراسیکیوٹر ہے۔ کیریر ویمن یو نو۔"

"تو اس کی شادی نہیں ہوئی؟ سچ گردے ضائع گئے تھے نا؟"

"گردے کا کیا ہے؟ وہ تو مل گیا تھا۔ کوئی فرنچ عورت کسی آوارہ بھٹکتی روح کی طرح اچانک سے آئی اور گردہ دے گئی۔ سو فلمی ہے نا!"

حنین کا رنگ سفید پڑا' پلیٹ پہ جمے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوئی۔

"گردے کا بہانہ ہے۔ جو عورتیں کیریر کے پیچھے پڑ جاتی ہیں' پھر ان کے گھر کہاں بستے ہیں۔ اسی لیے ہمارے دین میں بھی گھر اور خاندان کی کتنی اہمیت ہے۔"

بے نیازی سے لٹ پیچھے کرتے کرن کی آواز اتنی "دھیمی" تھی کہ آس پاس کے چند ایک لوگ تو سن ہی چکے تھے۔ حنین نے کن انکھیوں سے زمر کو دیکھا۔ وہ کانٹے میں مچھلی کا ٹکڑا پھنساتی سنجیدہ' سپاٹ نظر آرہی تھی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں' دہشت گردی اتنی بڑھ گئی ہے۔"

"یار! انسان کو خود سمجھ ہوتی ہے ساری۔ اب کس نے کہا ہے کہ عورتیں قتل کے کیسز میں پڑیں؟ اسی لیے ہمارے دین میں...." یہاں سب کا اپنا اللہ اور اپنا دین تھا۔

"ہیلو کرن!" کسی نے کرن کو مخاطب کیا تو اس کی مسلسل چلتی زبان رکی۔

زمر اب کسی دوسرے اسٹینڈ کی طرف جارہی تھی' یہ آواز پہ لمحے بھر کو رکی' پھر چلتی گئی اور حنین کی تو ساری دنیا ہی اس آواز پہ رک جاتی تھی۔ وہ جو ذرا ترچھی ہوئی تھی' پوری پیچھے مڑ گئی۔

اور مڑی تو کرن بھی تھی' بہت خوشگوار حیرت سے۔

"ارے ہاشم! آپ!" وہ ایک ہاتھ میں کانٹا اور ایک میں پلیٹ لیے مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔ بنا ٹائی کے شرٹ' اوپر گرے کوٹ۔ مسکراتے ہوئے کرن کے رسمی کلمات کا جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ آئے۔ کیا آپ کی ممی بھی آئی ہیں؟" اس نے ہاشم کے عقب میں دور مجمع میں تلاشنا چاہا۔ وہ ان کی کمپنی کے ایک عہدے دار کی بیٹی تھی' اور وہ لوگ اس کے باس تھے۔ چند لمحے پہلے کی

رعونت، تمکنت، سب غائب ہو گیا۔ خوش اخلاقی عود کر آئی۔

"کیسی ہو تم؟ اور یہ تمہاری آنکھوں کے نیچے اتنے حلقے کیوں پڑ گئے ہیں؟" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا، مگر لہجہ اتنا ٹھنڈا تھا کہ کرن کے ہاتھ نے بے اختیار اپنی آنکھوں کو چھوا۔

"اپنی صحت کا خیال رکھا کرو کرن! کیونکہ اگر کسی کا ٹریک ریکارڈ ہو خرابی صحت کی بنا پہ کسی عورت کو چھوڑ دینے کا تو میں سوچتا ہوں، اگر موجودہ عورت کی بھی ٹانگ، بازو کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تو اس کا کیا ہو گا؟ ہیلو حنین!"

وہ کہہ کر حنین کو مخاطب کرتا آگے بڑھ آیا۔ کرن بالکل ہکا بکا سی کھڑی تھی، مگر حنین اب اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے لب مسکرانے لگے تھے، تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ سر کے خم سے جواب دیتی وہ وہاں سے ذرا دور ہٹی، ایسے کہ ہاشم بھی ساتھ ہی چلتا آیا۔ کرن پرے رہ گئی۔

زمر دور ٹیبل پہ سیم، سعدی اور ندرت کے ساتھ جا بیٹھی تھی۔

"یہ کرنے کی۔" کہتے ہوئے حنین نے دور زمر کو دیکھا "کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے زمر کے لیے نہیں کیا اور تمہیں یہ معلوم ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں شانے ذرا اچکا کر پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔

"آپ بس اتنا سالیں گے؟" اس نے پہلے ہاشم کی پلیٹ کو دیکھا، پھر اپنی۔

"اس میں بھی بہت کیلوریز ہیں جس کا مطلب ہے ایکسٹرا ورک آوٹ میں بوڑھا ہو رہا ہوں، سمجھا کرو۔" حنین ہنس کر سر جھٹکتی کباب اٹھانے لگی۔ ہاشم نے کانٹے میں پھنسا ٹکڑا منہ میں رکھتے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرے حلقہ احباب میں کوئی دوسری حنین نہیں ہے، میں نے جھوٹ بولا تھا۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ "یعنی آپ نے واقعی مجھے نہیں پہچانا تھا؟"

"ہاں، کیونکہ جس حنین کو میں جانتا تھا، وہ اتنی گھبرائی ہوئی، پریشان سی نہیں ہوتی تھی، تمہیں کیا ہو گیا ہے کچھ عرصے سے؟"

وہ بالکل ٹھہر گئی۔ کیا وہ واقعی اتنا بدل گئی تھی کہ ہاشم تک نے محسوس کر لیا؟

"میں تو ویسی ہی ہوں اور آپ سے تو اب تقریبات میں ہی ملاقات ہوتی ہے۔ (ایفل ٹاور) آپ کو کیا پتا میں کیسی ہوں؟"

وہ سنبھل کر مسکرا دی مگر ہاشم نے گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

"اور تم چاہتی ہو کہ میں اس وضاحت پہ یقین کر لوں۔ اوکے، کر لیا۔"

حنین ذرا سر جھکا کر کھانے لگی، دفعتاً کسی احساس کے تحت اس نے چہرہ گھما کر دیکھا۔ دور، جواہرات کے ساتھ نوشیرواں کھڑا تھا اور وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ بگڑے تاثر، بھنچی بھنوؤں کے ساتھ۔ وہ سیدھی ہوئی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" ہاشم نے گویا اسے تسلی دی، وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ اس نے ابرو اچکا دیے۔

"آپ کا بھائی ابھی بھی مجھے اسی طرح دیکھ رہا ہے۔ اس دن آپ کے گھر بھی اس نے مجھے دیکھتے ہوئے بھائی اور ماموں سے کچھ کہا تھا۔ وہ ابھی تک مجھ سے عداوت رکھتا ہے۔"

"آئی ایم سوری، میں اس کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔" اس نے نرمی سے کہا اور پھر شیرو کو گھور کر تنبیہاً دیکھا، وہ دوسری جانب دیکھنے لگا۔ حنین اثبات میں سر ہلا کر ڈش سے کباب نکالنے لگی۔ اس کا چہرہ اب ذرا سنجیدہ اور بجھا بجھا سا تھا۔ ہاشم معذرت کر کے آگے بڑھنے لگا، پھر ایک دم رک کر اسے دیکھا۔ کچھ کلک ہوا تھا اچانک سے۔

وہ ٹھہر گیا۔ لمحے بھر کو ساری دنیا ٹھہر گئی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی تکلیف ابھری۔ بمشکل وہ چہرے پہ مسکراہٹ لایا، سر اثبات میں ہلایا۔

"آئی ایم سوری، حنین! آئی ریئلی ایم! میں پہلے یہ

نہیں کہہ سکا، تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ذاتی بہت.... آئی ایم سوری!"

حنین نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں درد تھا، تکان تھی۔ اس کے ذہن کے پردے پہ ایک بھولا بسرا لمحہ ابھرا۔ تب بھی اس کی آنکھوں میں ایسا ہی درد تھا۔ حنین نے سر جھٹکا۔ وہ لمحے بھر میں شادی کی تقریب میں واپس آئی مگر اب ہاشم جاچکا تھا۔

وہ اپنی میز تک خالی الذہنی کے عالم میں واپس آئی، زمر کھاچکی تھی، ٹشو سے لب تھپتھپاتی وہ سعدی سے آہستہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ حنین نے بے دھیانی سے سنا۔

"کیا تم نے وہ اسے واپس کردیا؟"

"کردوں گا جلد ہی!" سعدی نے مختصراً کہا۔ حنہ چونکی۔ بھائی نے کب نیکلس واپس کرنا ہے آخر؟ مگر پھر اس کے ذہن کی رو بھٹک گئی۔ ہاشم کی معذرت.... ڈیڑھ سال بعد اس نے وہ شکوہ دور کردیا جو حنین کو اس سے تھا ہی نہیں۔

"سیم! کپڑوں پہ مت گراؤ۔" ندرت کی توجہ ادھر نہیں تھی، وہ حسب معمول سیم کو لتاڑ رہی تھیں۔ وہ بھی آگے سے حنین اور سعدی کا بھائی تھا۔

"امی! داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔"

حنین واپس آچکی تھی مکمل طور پہ۔ تنگ کر اسے دیکھا۔

"یہ خود بھی ہمارے خاندان پہ کسی داغ سے کم نہیں ہے۔"

"مت تنگ کرو اسے۔" ندرت نے دبا دبا سا گھورا وہ فوراً چمک کر بولی۔

"یہ شروع کرتا ہے ہمیشہ، تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔"

"مگر تھپڑ ایک ہی سے پڑتا ہے اور گھر جا کر پڑتا ہے۔"

اس دھمکی پہ وہ بڑبڑا کر سر جھکائے کھانا کھانے لگی۔

سعدی اٹھ کر گیا تو ندرت نے زمر کے قریب ہو کر کہا "یہ جو سامنے نیلے کپڑوں والی جارہی ہے نا، یہ حمیرا آپا کی بیٹی رانیہ ہے، انجینئرنگ مکمل کی ہے اسی سال، مجھے یہ سعدی کے لیے پسند ہے۔"

زمر نے چونک کر اسے دیکھا اور کافی دلچسپی سے۔

"یہ تو بہت پیاری ہے۔ پھر کب مانگ رہی ہیں آپ رشتہ؟" اس کے چہرے پہ جو کرن کی باتوں سے ڈسٹرب سا تاثر چھایا تھا، وہ زائل ہو کر مسرت میں بدلنے لگا۔

حنین نے ایک اچٹتی نگاہ اس دراز قد لڑکی پہ ڈالی جو لمبے سے فراک میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی، اور چونکہ اس کے لیے یہ خبر نئی نہیں تھی، اس لیے سر جھٹک کر کھانے لگی۔

"ابھی بڑے ابا سے مشورہ کرنا ہے پھر ہی کوئی بات شروع ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے بھی بلکہ صرف سوچتے ہوئے بھی ندرت کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔

"اور امی! اگر انہوں نے انکار کردیا؟" سیم نے اپنے تئیں بہت بڑوں والا سوال پوچھا تھا اور ندرت کا ہاتھ بس جوتے تک جاتے جاتے رہ گیا۔

"کیوں انکار کریں گے وہ ہمارے سعدی کو؟ کوئی وجہ بنتی ہے کیا؟" زمر نے مسکراہٹ دبائے اس سے پوچھا۔ وہ جواباً "مسکرا کر رہ گیا مگر....

حنین کا چمچ لبوں تک لے جاتا ہاتھ رکا، سر اٹھایا، سنجیدگی سے زمر کو دیکھا اور پھر دیکھتی رہی یہاں تک کہ زمر نے بھی اس کو دیکھا، ندرت سویٹ ڈش لینے اٹھ گئیں، تب حنین بولی۔

"بغیر وجہ کے بھی انکار ہوجاتے ہیں پھپھو! کسی اچھے بھلے آدمی کو بھی اپنے زعم میں جنگلی، جاہل، غصہ ور کہہ کر رد کردیا جاتا ہے۔"

زمر کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا "سوری؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"میں تو آپ کی میموری ری فریش کررہی تھی۔ کیوں؟ کیا آپ نے یہی کہہ کر فارس ماموں کے رشتے کو انکار نہیں کیا تھا؟" اور سر جھکا کر درمیان میں روکا چمچ منہ میں ڈال لیا، پھر رخ پھیر کر سویٹ ڈش کے لیے

اٹھ گئی۔

اور زمر... وہ جہاں تھی، وہیں رہ گئی۔ ساکت، جامد سانس تک بند ہو گیا۔ جیسے اندھیرے میں سیڑھیاں اترتے آخری زینے کے بعد یہ سمجھ کر پاؤں اتارا جائے کہ ابھی ایک زینہ اور باقی ہے اور وہ لمحے بھر کو پاؤں کا ہوا میں معلق ہو کر زمین کو لگنا... وہ لمحے بھر کا شاک... وہ دل کی بے ترتیب دھڑکن... وہ وقت کی رفتار کو تھما دیتی ہے... بالکل خاموش... رکا ہوا وقت۔



موجودہ دن سے پانچ سال قبل

کچھ زخم صدیوں بعد بھی تازہ رہتے ہیں فراز
وقت کے پاس بھی ہر مرض کی دوا نہیں ہوتی

حنین کے کمرے میں فل پنکھا چل رہا تھا۔ کارپٹ پہ جائے نماز بچھائے زمر تشہد میں بیٹھی تھی۔ نظریں ہاتھوں پہ مرکوز، چہرے کے گرد دوپٹہ، لب ملتے ہوئے۔ پھر اس نے دائیں بائیں سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ تب ہی نگاہ الماری سے کچھ نکالتی حنین پہ پڑی۔ زمر مسکرائی، اور وہ جو کسی بات پہ جھنجھلائی کھڑی تھی، پھیکا سا مسکرا دی اور پھر سے چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

زمر ہاتھوں میں دیکھتی، زیر لب دعا مانگتی رہی۔ پھر چہرے پہ ہاتھ پھیر کر اٹھی تو حنین پلنگ کے کنارے پہ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا سا، دماغ کہیں اور اٹکا ہوا لگ رہا تھا۔ کوئی پریشانی تھی شاید، مگر کون پوچھے اور کون بتائے؟ ان کا رشتہ اتنا پر تکلف تھا کہ دو سال سے سعدی کی غیر موجودگی نے بھی ان کو ایک دوسرے کے قریب نہیں کیا تھا۔ بس مسکراہٹ سے مسکراہٹ تک کا رشتہ۔

"کیا میں اسے یہیں رہنے دوں حنہ؟" اس نے جائے نماز اٹھانے سے قبل پوچھا۔

حنین نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ابھی امی دو چار صلواتیں مزید سنائیں گی تب وہ وضو کرنے جائے گی، زمر کو معلوم تھا حنین چہرہ ہتھیلیوں پہ گرائے بیٹھی رہی

"پھپھو! آپ تو ساری نمازیں پڑھتی ہیں نا؟ میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟" وہ الجھن بھرے انداز میں اس طرح پوچھنے لگی جیسے ریاضی، سائنس یا معاشرتی علوم کے سوال ڈسکس کرنے ہمیشہ اس کے پاس آتی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کبھی کچھ نہیں ڈسکس کرتی تھی۔

"پوچھو!" وہ نرمی سے کہتی واپس جائے نماز پہ بیٹھ گئی۔

"کیا آپ کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے؟"

"ہاں ہے!" زمر کے لیے جواب آسان تھا۔

"کیسے؟ میرا مطلب ہے، آپ اس محبت کی تعریف کیسے کریں گی؟"

زمر چند لمحے پر سوچ نگاہوں سے اس کا کم عمر چہرہ تکتی رہی، پھر ذرا سے شانے اچکائے۔

"میرا نہیں خیال کہ میں اس محبت کو ڈیفائن کر سکتی ہوں۔"

"اوکے، میری ایک کرسچن دوست نے پوچھا تھا، اسی لیے میں پوچھ رہی تھی۔" وہ سر ہلا کر اٹھ گئی۔

زمر نے گردن موڑ کر اسے باتھ روم جاتے دیکھا۔ ماتھے پہ کٹے بال اور باقی بال ہیئر بینڈ میں جکڑے کندھوں سے نیچے گرتے تھے۔ چہرے پہ پھیلی الجھن وہ الجھن اب بھی وہیں تھی۔ کوئی مسئلہ تھا۔ مگر خیر اس نے گھڑی دیکھی۔ اب اسے گھر جانا تھا، ورنہ امی خفا ہوں گی۔

جب حنین نماز پڑھ کر باہر آئی تو زمر جا چکی تھی۔ چونکہ حنین سامنے نہیں تھی اس لیے وہ آج کچھ نہیں بھولی، نہ حنہ کو یاد رہا۔ وہ بس بے زاری سے کمپیوٹر کے سامنے آ بیٹھی اور اسے آن کیا۔ ڈیسک ٹاپ کی گھڑی اس نے علیشا کی ریاست کے مقامی وقت کے مطابق سیٹ کر رکھی تھی۔ وہاں صبح ہو چکی تھی اور علیشا آن لائن تھی۔

چوکھٹے میں علیشا صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ دو سال پہلے کی نسبت اب ذرا بڑی لگتی تھی، یہی کوئی بیس

برس کی۔ دوسرے چوکھٹے میں حنین تھی' اداس اور خفا خفا سی۔ اس کے گھر والوں کو **علیشا** کی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ سارا وقت بھی حنین کا کیمرہ آن رہتا تو کسی کو مسئلہ نہ ہوتا۔

"تم اداس لگ رہی ہو!" **علیشا** اس کا چہرہ دیکھتے ہی بوجھ گئی۔ حنین نے گردن دائیں بائیں ہلائی مگر آنکھوں میں وہی اداسی چھائی رہی۔

"میں فورم پہ تمہارے سوال کا جواب پوسٹ کرنے لگی تھی۔" ساتھ ہی وہ کیز دبائے جا رہی تھی۔ **علیشا** نے چیک کیا۔ پھر اس کی آنکھیں الجھن سے سکڑیں۔

"حنین! مجھے لگتا ہے تم نے غلط جواب لکھ دیا ہے۔ میرا سوال تھا' کیا آپ کو خدا سے محبت ہے؟ تم نے جواب میں پتا نہیں لکھ دیا ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ مجھے واقعی پتا نہیں ہے۔"

"مگر..." **علیشا** چپ ہو گئی۔ حنین اب مٹھی پہ ٹھوڑی گرائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مگر تم اور میں' ہم زیادہ تر دین کی باتیں کرتے ہیں' ایک دوسرے کو اپنے اپنے دین کے بارے میں بتاتے ہیں' اور تم بھی میری طرح اپنی کتاب بہت پڑھتی ہو پھر؟"

"بہت نہیں' میں ہفتے میں ایک' دو دفعہ ہی پڑھ پاتی ہوں۔ جب بھائی تھا تو ہم روز پڑھتے تھے مگر مجھے اب وقت نہیں ملتا۔" **حنہ** نے شانے اچکائے۔

"دیکھو **علیشا**' میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں وہ ناولز اور ڈرامے جن میں ہیرو یا ہیروئن بہت ہی گناہگار ہوتے ہیں اور پھر کسی بڑے واقعے کے بعد وہ بالکل مذہبی ہو کر اللہ کی محبت میں سب گناہ چھوڑ دیتے ہیں' میں ایسی کہانیوں کی بہت قدر کرتی ہوں مگر میں خود کو ان سے ریلیٹ نہیں کر سکی کبھی۔ میں اس کا شکر ادا کرتی ہوں' احترام بھی کرتی ہوں' دعا بھی مانگتی ہوں۔ اسے معبود تسلیم کرتی ہوں۔ میں امی' اپنے بھائیوں ابو اور (مڑ کر دیکھا' زمر جا چکی تھی کب کی) اور کچھ دوسرے رشتے داروں سے بہت محبت کرتی ہوں' اسی لیے میں کہہ سکتی ہوں۔"

ذرا توقف کر کے وہ چہرہ ہتھیلی سے ہٹا کر' پیچھے ٹیک لگاتے ہوئے صاف گوئی سے کہنے لگی۔

"تمہاری ساری تقریر ایک طرف... ابھی تم کس بات پہ پریشان ہو؟ میں صرف اتنا کہوں گی کہ جو بھی مسئلہ ہے' اس کو حل کرنے کی کوشش کرو۔"

"ہاں' ایک اسکول کا مسئلہ ہے' خود ہی حل ہو جائے گا۔" وہ تلخ ہوئی **علیشا** نے لب بھینچ کر نفی میں گردن ہلائی۔ اس کی سرمئی آنکھوں میں فکرمندی تھی۔

"مسئلے خود حل نہیں ہوتے' کرنے پڑتے ہیں اور اس کے دو طریقے ہیں یا تو خود میں ہمت تلاش کرو' یا زیادہ ہمت والے کو تلاش کرو۔" اور پھر وہ عادتاً ہنسی۔ یہ اس کا انداز تھا۔

(زیادہ ہمت والا؟) حنین نے مڑ کر دروازے کو دیکھا پھر نفی میں سر جھٹک کر سیدھی ہوئی۔

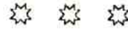
"کیا تم نے ______ پریزن بریک کا یہ سیزن ختم کر لیا؟" ساتھ ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ "حنین نے بیزاری سے دور پڑے فون کو بجتے دیکھا۔ امی اور سیم' زمر کے جاتے ہی سونے چلے گئے تھے۔ اسے ہی اٹھنا پڑے گا۔

"نہیں' میں ابھی چھٹی قسط پہ ہوں۔ یار! اس سیزن میں سارہ ہی نہیں ہے۔ مزا نہیں آ رہا۔ ویسے مجھے مائیکل سے زیادہ لنکن پسند ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں' اس وقت میری ایک رشتے دار آنٹی کا فون ہوتا ہے عموماً" اور وہ لمبی بات کرتی ہیں۔"

وہ الوداعی کلمات کہتی سائن آف کرنے لگی۔ پھر بھاگ کر مسلسل بجتا فون اٹھایا۔ سی ایل آئی پہ نمبر ان جانا تھا' مگر پھر بھی کہیں دیکھ رکھا تھا۔

"ہیلو؟ جی حنین بات کر رہی ہوں۔ اوہ... جی' جی شیور ابھی؟ ابھی نہیں مگر شام میں ماموں آئیں گے ہماری طرف' تو میں ان کے ساتھ آ جاؤں گی۔ شیور

اورنگ زیب انکل۔" مسکرا کر اس نے فون رکھا۔ چہرے پہ آئی ساری کلفت' بے زاری زائل ہو گئی وہ امی کو بتانے بھاگی۔ اورنگ زیب صاحب کو کام تھا اور انہوں نے اسے بلایا تھا۔ واہ۔



اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

لیڈز میں سرمئی صبح اپنے اندر نمی سموئے اتر رہی تھی۔ سارہ کے کچن کی کھڑکی سے بادلوں ڈھکا آسمان صاف نظر آتا تھا۔ وہ چولہے سے ساس پین اتار کر' گرم دودھ کپ میں انڈیل رہی تھی۔ پیچھے کرسی پہ ذکیہ بیگم بیٹھی پھل کاٹ کر سعدی کے سامنے رکھتی جا رہی تھیں۔ وہ جب سے آیا تھا خاموش بیٹھا تھا۔

"کتنے دنوں بعد آئے ہو' اتنا نہیں ہوتا کہ چکر لگا لو۔ وہ بھی میرے وارث کو شکایت کرنے پہ کہ ندرت آپا سے کہیں سعدی کی خبر لیں تم آئے ہو۔ پی ایچ ڈی میں کر رہی ہوں یا تم؟"

اپنے ازلی سادہ انداز میں ابرو سکیڑے بولتی ہوئی وہ ادھر آئی' ٹرے میز پہ رکھی۔ باری باری ہر مگ میں چمچ ہلایا۔ پھر سب کے سامنے مگ رکھے۔ ذکیہ بیگم نے مگ اٹھاتے ہوئے بغور سعدی کو دیکھا۔

"آج سعدی نے آتے ساتھ ہی بچیوں کا نہیں پوچھا۔"

وہ چونک کر سنبھلا' ذرا سا مسکرایا۔ "نہیں تو میں بس۔"

"وہی تو امی! یہ آج بہت بجھا بجھا لگ رہا ہے۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔" اپنا کپ لے کر سامنے بیٹھتی' وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

"اصل میں.... میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میرا ایک دوست ہے' اس کا مسئلہ ذرا پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"او کے؟" سارہ نے توجہ سے سنتے ہوئے کپ لبوں سے لگایا۔

"اس لڑکے کی ممی کافی.... کافی پوزیسیو ہیں اور کیئرنگ بھی۔ وہ ادھر آیا بھی اس لیے کہ اس کی ممی اس کو میرے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں' تاکہ میں اس کا خیال رکھوں' اور اس پہ نظر بھی رکھوں۔ وہ ڈرگز پہ چلا گیا تھا پہلے۔"

"اوہ.... تو کیا اس نے ڈرگز چھوڑ دیں؟" ذکیہ بیگم نے ذرا فکرمندی سے پوچھا۔ سعدی کے چہرے پہ بے بسی در آئی۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔ میرے اور اس کے **سبجیکٹس** الگ ہیں' ڈیپارٹمنٹ الگ ہیں' کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے' اس کی ممی کی ہر میل کے جواب میں' میں سب اچھا ہے کی رپورٹ دیتا تھا مگر ابھی کچھ دیسی لڑکوں سے مجھے پتا چلا ہے کہ وہ پھر سے ڈرگز پہ چلا گیا ہے۔ شاید کوئی لڑکی چھوڑ گئی ہے اسے۔ ایک تو اسے بھی ہر دوسرے مہینے سچی محبت ہو جاتی ہے۔" آخر میں وہ جل کر بولا۔ ذکیہ اور سارہ ہنس دیں۔

"اس نے اس دن گاڑی کہیں ماری ہے' جرمانہ بھی ہوا' مطلب چالان' شکر ہے' وہ اس وقت ڈرگز پہ نہیں تھا ورنہ معاملہ بگڑ جاتا۔ اس کی ممی کو نہیں معلوم یہ بات۔ اب میں کیا کروں؟ دوست کی شکایت لگاؤں یا اس کے عیب چھپاؤں۔"

"دیکھو سعدی!" سارہ کپ رکھ کر سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "ایک ماں ہونے کی حیثیت سے میرا حق ہے کہ مجھے اپنے بچے کے ہر کام کی رپورٹ ملے۔ اگر تم اس کے سچے دوست ہو تو اس کی ماں کو ضرور بتاؤ تاکہ وہ اس کی اصلاح کر سکے۔ اگر اس کی جگہ سیم یہ کرتا تو تم یہی چاہتے کہ تمہاری امی کو خبر دی جائے۔ ہے نا؟"

"اوہ!" سعدی کے لب سکڑے' پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سمجھ گیا تھا۔

"سارہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے' اس کی ماں کو بتاؤ تاکہ وہ جوتے لگائے وہ اس کو۔" ذکیہ بیگم کی ساری ممتا جاگ اٹھی تھی۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"تھینک یو! آپ دونوں کا۔" پھر کپ اٹھاتے ہوئے موضوع بدلا۔ "وارث ماموں ٹھیک ہیں؟ صرف ایک سال رہ گیا ہے نا آپ کے پروگرام کا؟"

"صرف؟ پورا ایک سال پڑا ہے۔" سارہ گھونٹ بھرتے ہوئے اداسی سے مسکرائی "اور پھر ہم بالآخر ایک فیملی ہوں گے' اور فیملی کی طرح رہیں گے۔ بہت خوار کردیا ہے ان پڑھائیوں نے۔"

"واقعی!" ذکیہ بیگم بھی سارہ کو دیکھتے ہوئے مغموم سی مسکرادیں۔ صرف ایک سال.... پورا ایک سال.... رہ گیا تھا۔

سعدی مسکرا کر گھونٹ بھرنے لگا۔



ہمیں نے روک لیا پنجہ جنوں ورنہ
ہمیں اسیر یہ کوتاہ کمند کیا کرتے

لاؤنج کی قد آدم کھڑکی کے ساتھ جواہرات کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی اور ہاتھ میں جکڑے موبائل پہ سعدی کی تازہ ای میل کھلی تھی۔ موبائل اتنی دیر سے یوں پکڑ رکھا تھا کہ اسکرین پسینے سے نم ہو گئی تھی۔

میری اینجیو قدم قدم چلتی اس کے قریب آئی' مودب سا پکارا۔

"مسز کاردار' آپ کی تمام پیکنگ مکمل ہو گئی ہے' رات کے لیے لیڈز کی فلائیٹ بھی بک کروادی ہے اور مسز شہرین نے کہا ہے کہ وہ بھی چلیں گی۔"

جواہرات نے ابرو سے "ہوں" کا اشارہ کیا تو وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ تب ہی اورنگ زیب سیڑھیاں اترتے دکھائی دیے۔ جواہرات آہٹ پہ بھی بدستور باہر دیکھتی رہی' یہاں تک کہ وہ پیچھے ایک صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھ گئے۔

"اچانک ہی تم نے انگلینڈ کا پروگرام بنالیا؟"

"میں شیرو کو مس کر رہی تھی اور اس بہانے شہرین اور سونیا کا بھی دل بہل جائے گا۔ ہاشم کے پاس تو اتنا وقت نہیں ہوتا۔"

"یعنی کہ تم نے اسے ایک مکمل فیملی ٹرپ کی شکل دے دی ہے۔ ویری گڈ اور میرے ڈاکومنٹس؟" وہ بہت ضبط سے اسے دیکھ کر بولے۔ جواہرات نے مڑے بنا ذرا سے کندھے اچکائے۔

"کیا میں دو دن سے کئی دفعہ بتا نہیں چکی کہ میرا لیپ ٹاپ خراب ہو گیا ہے' اس لیے وہ فی الوقت ری کور نہیں ہو سکتے' نہ ان کا ڈرافٹ تیار ہو سکتا ہے۔"

"اور چونکہ اب تم باہر جا رہی ہو تو ایک مہینے کے لیے یہ کام ملتوی ہو گیا' تب تک میری سماعت کی تاریخ بھی گزر جائے گی اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ تو تمہیں ہی ہو گا۔"

اس طنزیہ لہجے پہ بھی جواہرات سکون سے کھڑی باہر دیکھتی رہی۔ دفعتاً" خاور اندر آیا۔ سوٹ میں ملبوس' تراشیدہ مونچھوں والا وہ چونتیس پینتیس برس کا آدمی تھا۔

"جی سر؟"

"آئیے خاور صاحب! اور ذرا وضاحت کیجیے کہ آپ جیسا ایکسپرٹ میری بیوی کا ایک لیپ ٹاپ کیوں نہیں ٹھیک کر سکا؟"

خاور نے ذرا کی ذرا جواہرات کو دیکھا اور پھر اورنگ زیب کو' دو ناخداؤں کا ہونا بھی عذاب تھا۔

"سر! میں نے کوشش کی مگر مسئلہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ اگر آپ کہیں تو کسی پروفیشنل کے پاس لے جاؤں؟ یا آفس سے کسی کو بلا کر.....؟"

جواہرات تیزی سے اس کی طرف مڑی۔

"میرے لیپ ٹاپ میں ہماری کمپنی کے کتنے خفیہ ڈاکومنٹس ہیں' معلوم ہے تمہیں؟ میں کیسے اسے کسی دوسرے کے حوالے کر سکتی ہوں؟"

"میری بیوی کو یہی خوش فہمی ہے کہ میں کسی اور کو لیپ ٹاپ نہیں دے سکتا' جبکہ میں دے سکتا ہوں۔ میری!" انہوں نے خشمگیں نگاہ دونوں پہ ڈال کر میری

کو آواز دی۔ جواہرات نے مضطرب سی ہو کر خاور کو دیکھا اور خاور نے ذرا پریشانی سے اورنگ زیب کو۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ اورنگ زیب یہ نہیں کرے گا مگر۔

"مگر سر۔۔۔!" اورنگ زیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرایا۔ میری سامنے آئی تو انہوں نے اسے صرف اشارہ کیا' وہ پہلے سے مطلع کردی گئی تھی' سو سر کو خم دیتی باہر نکل گئی۔

جواہرات گویا سلگ کر واپس باہر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پہ شدید اضطراب پھیلا تھا۔ یہ آدمی ناقابل برداشت تھا۔ شدید ناقابل برداشت۔



دلبری ٹھہرا زبان خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام

انیکسی کے اندر چھوٹا سا لونگ روم تھا جس میں ٹی وی چل رہا تھا اور سامنے بیٹھی حنین چینل بدل رہی تھی۔ اس نے ماتھے والے بال چھوڑ کر باقی پونی میں باندھ رکھے تھے اور ذرا بے چین سی لگ رہی تھی۔ ندرت اور فارس خاموش سے بیٹھے تھے۔

"تم نے اورنگ زیب انکل کی طرف نہیں جانا؟ انہوں نے بلایا جو تھا۔" ندرت نے اسے پکارا۔

"ان کی نوکرانی نے ہمیں آتے دیکھ لیا تھا' جب بلانا ہو گا خود بلا لیں گے۔"

"اچھا' اٹھ کر ہمارے لیے چائے تو بنا دو۔ کوئی کام نہیں کرتیں تم۔"

"امی! آپ سیدھے سیدھے کہہ دیں کہ حنہ تم باہر چلی جاؤ' ہمیں بات کرنی ہے' تو میں چلی جاؤں گی۔" وہ ریموٹ رکھ کر برا سا منہ بناتی اٹھ گئی۔ فارس خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"اب کہاں جا رہی ہو؟" ندرت نے پھر پکارا۔

"وارث ماموں کے پاس۔ وہ کال سننے باہر گئے تھے وہیں رہ گئے۔" وہ داخلی دروازے سے باہر نکل آئی اور دروازہ ذرا سا کھلا چھوڑ دیا۔ پھر باہر اس کے ساتھ کھڑے ہو کر' کان لگا کر سننے لگی۔ آنکھوں میں شرارت اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

"جی' کیا بات کرنی تھی آپ کو؟" فارس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ایسا ہے فارس کہ سلیم بھائی نے اپنی بیٹی زرتاشہ کے لیے اشاروں کنایوں میں بات کی ہے' اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بات شروع کروں؟" وہ اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گئیں اور بڑی آس سے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

"کیا زرتاشہ ہی ہے خاندان میں واحد لڑکی؟" اس نے ناک سے مکھی اڑائی اور بے زاری سے ادھر ادھر دیکھا۔

"اچھا تم بتاؤ' جہاں کہو گے' میں رشتہ لے کر چلی جاؤں گی۔"

حنین چہرہ دروازے پہ جھکائے' لب شرارت سے دبائے' سن رہی تھی۔

فارس چند لمحے کو ندرت کو دیکھتا رہا۔

"آپ کی نند۔۔۔ اس کا بھی تو ابھی کہیں رشتہ نہیں ہوا۔" بہت ہی کوئی سرسری انداز میں کہا۔ ندرت چونکیں' پھر آنکھوں میں خوش گواری ابھری۔

"ہاں' اس کا بھی۔۔۔" پھر رک گئیں' آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ فارس نے غور سے ان کے تاثرات دیکھے۔

"میں اس کے قابل نہیں یا وہ میرے؟"

"نہیں' اصل میں میری ساس۔۔۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں مانیں گی۔"

"نہیں مانتیں تو نہ مانیں۔ ایک دفعہ بات کر لیجئے گا بس۔" اس کے تاثرات ذرا سخت ہو گئے۔ ندرت نے جلدی سے بات سنبھالی۔

"نہیں' میں پوری کوشش کروں گی' وہ بہت اچھی لڑکی ہے' اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ اس کا ایک اور رشتہ بھی آیا ہوا ہے آج کل' میں پھر اسی ہفتے جا کر بات کرتی ہوں۔"

اور باہر' دل پہ ہاتھ رکھے کھڑی حنین' حیران' خوش' ایکسائٹمنٹ' غرض ہر جذبے سے گزر رہی تھی۔ تب

ہی کسی نے اس کو کان سے پکڑ کر دوسری طرف کھینچا۔ وہ گڑبڑا کر گھومی۔ وارث سامنے کھڑا تھا۔

"ماموں۔۔۔ میں آپ کی طرف ہی آرہی تھی۔"

"مگر میں نے سوچا کہ ۔۔۔۔ کن سوئیاں لینے میں بھی ہرج نہیں ہے۔" اس نے حنین کا فقرہ مکمل کیا۔ وہ ابھی تک کان رگڑ رہی تھی 'جھنجلا کر اسے دیکھا۔

"آپ کدھر رہ گئے تھے؟ گرمی میں اتنی دیر سے کھڑے ہیں؟"

"وہ گاڑی ہٹا کر اپنی سامنے کر رہا تھا۔" اس نے فارس کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ حنین کا کان رگڑتا ہاتھ رکا' آنکھوں میں کچھ چمکا۔ اس نے وارث کے ہاتھ سے چابی جھپٹی اور گاڑی کی طرف بھاگی۔ جلدی سے دروازہ کھولا' فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی اور ڈیش بورڈ کے خانے کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔ وارث ذرا حیران سا اس طرف آیا۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"جب ماموں' ہمیں پک کرنے آئے تھے تو۔۔۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے کچھ اس میں ڈالا تھا۔ مل گیا۔ بلکہ مل گئی۔" سیاہ مخملیں ڈبی ہاتھ میں لیے حنین نے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا اور پرجوش سے ہو کر ڈبی کھولی۔

"اوہ گاڈ' حنو' واپس رکھو فوراً"۔ یہ فارس کی پرسنل چیزیں ہیں۔"

"دیکھنے تو دیں۔" وارث نے ہاتھ بڑھا کر ڈبی لینی چاہی مگر اس نے ہاتھ دور کر لیا۔ ڈبی کھل چکی تھی اور وہ جو تاپس یا انگوٹھی کی توقع کر رہی تھی' خود بھی ٹھہر سی گئی۔

سیاہ مخمل پہ ہیرے کی ننھی سی لونگ تھی' بالکل مونگ کی دال کے دانے جتنی۔

"واپس رکھو اسے۔" دروازے کے ساتھ کھڑے وارث نے اب سختی سے کہا تو اس نے ڈبی بند کر کے احتیاط سے واپس رکھ دی' پھر خود بھی باہر نکل آئی۔ چہرے پہ مسکراہٹ تھی' آنکھوں میں چمک۔

"یہ نوز پن (ناک کی لونگ) تھی۔"

"فارس نے لی ہوگی کسی کے لیے۔ اب مت چھیڑنا اسے۔"

"آہا۔۔۔ مجھے پتا ہے کس کے لیے۔ میری پھپھو ناک کی لونگ پہنتی ہیں۔"

وارث کی آنکھوں میں ناگواری ابھری' بے اختیار ادھر ادھر دیکھا۔

"عقل کدھر ہے تمہاری؟ دوبارہ یہ بات مت کرنا۔"

"کیوں؟ میں نے کیا کہا ہے؟"

"میری بات سنو غور سے۔" وہ سنجیدگی سے اس کے سامنے کھڑا کہنے لگا۔ "مجھے بھی پتا ہے کہ تمہاری پھپھو ناک میں لونگ پہنتی ہیں' اور مجھے یہ بھی پتا ہے تم اندر سے کیا سن کر آرہی ہو فارس نے پہلا مشورہ مجھ سے کیا تھا۔ یہ باتیں حنین! ہمارے خاندانوں میں پسند نہیں کی جاتیں۔ ڈیڑھ دو سال پہلے تک وہ اس کا اسٹوڈنٹ بھی رہا ہے' اگر اس نے تب یہ بات نہیں کی تو اس لیے کہ خاندان میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ان کا کوئی۔۔۔ افیئر رہا ہے۔ اب یہ والی بات۔۔۔" سختی سے ڈیش بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کسی کے سامنے نہیں دہرانی تم نے۔ ندرت آپا کے سامنے بھی نہیں۔"

"اچھا۔" حنین نے منہ بنا کر گردن پھیر لی۔ سارے ایڈونچر کا ان احتیاط پسند ماموں نے بیڑا غرق کر دیا تھا۔ تب ہی میری اینجیو اس طرف آتی دکھائی دی۔ حنین بے اختیار سیدھی ہوئی۔

"کاردار صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

حنین سرہلا کر جانے لگی تو وارث کار لاک کر کے آگے آیا۔ "ٹھہرو! اکیلی مت جاؤ' میں ساتھ آرہا ہوں۔" اس کے چہرے پہ کافی سختی سمٹ آئی تھی۔



اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پس' زنداں' کبھی رسوا سر بازار

ہاشم کے کمرے کی کھڑکی کا رخ انیکسی کی طرف تھا'

اس لیے وہاں سے یہ منظر صاف نظر آتا تھا۔ ہاشم ایک سرسری نظر اُن پر ڈال کر پلٹا۔ سامنے بیڈ پہ کھلا بیگ رکھا تھا اور شہرین الماری سے ہینگرز نکال نکال کر ڈھیر کر رہی تھی۔ وہ بھنچے ہوئے ابرو کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

"کچھ عرصے سے تمہارے انگلینڈ کے چکر زیادہ نہیں لگ رہے؟"

ہینگر سے شرٹ اتارتے شہرین کے ہاتھ تھمے، پھر اسے کھینچ کر اتارا، تین تہیں لگائیں، بیگ میں رکھا اور سنہرے بال کان کے پیچھے اڑستی سیدھی ہوئی۔

"مسز کاردار نے پیشکش کی تھی اور وہاں میری خالہ بھی رہتی ہیں۔ اچھا ہے اس بہانے ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ تمہارے پاس وقت ہوتا تو ہم ایک فیملی کی طرح جاتے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم شاید میرے بغیر وہاں زیادہ خوش رہتی ہو۔" وہ تلخی سے کہتا آنکھیں سکیڑ کر اسے کپڑے تہہ کرتے دیکھ رہا تھا۔

"تم جھگڑے کے موڈ میں ہو؟" اس نے بےزاری سے کہتے ہوئے ڈریسر سے ایک ڈبا اٹھایا اور اس میں چیزیں بھرنے لگی۔

"جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہاں جا کر بھی تم نے میری بیٹی ملازموں پہ چھوڑ دینی ہے۔ اس کا بخار پچھلے ہفتے ٹھیک ہوا ہے مگر شیری! تمہارے پاس نہ ادھر اس کے لیے وقت ہوتا ہے، نہ ادھر ہو گا۔"

"تم وقت نکالنا شروع کرو، میں پیروی کروں گی۔" وہ لپ اسٹکس اٹھا اٹھا کر ڈبے میں ڈال رہی تھی۔ ہاشم تلخی سے سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

راہداری کے دوسرے سرے پہ ایک کمرے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ وہ نرسری تھی اور ادھر کاٹ کے ساتھ ایک ملازمہ کھڑی نظر آ رہی تھی۔ ہاشم کی آنکھوں میں افسوس ابھرا، پلٹ کر ایک ملامتی نظر اپنے کمرے پہ ڈالی اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

بیچ سیڑھیوں کے وہ رک گیا۔ ابرو بھنچ گئے۔ پھر تیزی سے آخری زینے تک آیا۔

"تمہارا بھائی ملا تھا مجھے پچھلے سال، کہہ رہا تھا جب بھی کمپیوٹر خراب ہوتا ہے، وہ تمہیں کال کرتا ہے۔"

اورنگ زیب صوفے پہ براجمان کہہ رہے تھے۔ سامنے والے صوفے کے کنارے حنین ٹکی تھی اور بار بار کبھی ساتھ کھڑے وارث کو دیکھتی، کبھی کھڑکی کے ساتھ موجود خود کو سلگتی نظروں سے گھورتی جواہرات کو۔

"بھائی کمپیوٹرز میں اچھا نہیں ہے۔ اس لیے۔" وہ ذرا تذبذب سے بولی، پھر دوبارہ جواہرات کو دیکھا۔ جواہرات اب سینے پہ بازو لپیٹے، تندہی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ عام حالات میں پر اعتماد رہنے والی حنین گڑبڑا رہی تھی۔ ہاشم بمشکل ضبط کر کے وہیں کھڑا رہا۔

"یہ لیپ ٹاپ....." اورنگ زیب نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ "چل نہیں رہا۔ ویسے تو میں کسی کو بھی بلا لیتا مگر..... تمہارا امتحان بھی آج لے لیتے ہیں۔"

حنین نے ایک نظر وارث کو دیکھا۔ جس پہ اورنگ زیب نے دوسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی، اور پھر لیپ ٹاپ اٹھا کر گود میں رکھا۔ اسے کھولا۔ آن کیا۔ اب وہ جواہرات کو دانستہ طور پہ نہ دیکھنے کی سعی کر رہی تھی۔ اسکرین پہ کچھ حروف لکھے آ رہے تھے۔ حنین نے چند کیز دبائیں۔ پھر نگاہ اٹھائی تو آخری سیڑھی پہ کھڑا ہاشم بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بالکل سانس روکے۔ مضطرب۔

کاردارز کے چہروں کی تاب لانا مشکل تھا، وہ سر جھکا کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔ چند بٹن مزید دبائے۔ سسٹم چلنے لگا۔

"غالباً" یہ آن ہو گیا ہے۔ تو پھر حنین! کیا مسئلہ تھا اس میں؟" اورنگ زیب نے ایک استہزائیہ مسکراہٹ سے بیوی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ حنین نے چہرہ اٹھایا۔ ہاشم سے نظر ملی۔ ہاشم نے ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔ "اونہوں کچھ منفی مت بتانا۔"

اس نے اورنگ زیب کو دیکھا۔ وہ منتظر تھے۔ وہ کسی فیملی وار کے درمیان پھنس گئی تھی۔ نارمل حالات میں اسے..... ایک منٹ وہ نارمل نہیں تھی۔ وہ

حنین تھی۔ اس نے تن کر گردن سیدھی کی' لیپ ٹاپ کا رخ ان کی طرف پھیر کر اسے میز پہ واپس رکھا اور بالکل سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"اس میں کوئی بھی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ اسٹارٹ اپ کا مسئلہ بھی خود ساختہ تھا' شاید آپ نے یا کسی اور نے۔" معصومیت سے مسز کاردار کی آنکھوں میں دیکھا۔ "کوئی شرارت کی تھی اس کے ساتھ۔" گردن اورنگ زیب کی طرف موڑی' مسکرائی۔ وہ بھی سر کو خم دے کر ہلکا سا مسکرائے۔ ہاشم نے "اف" کراہ کر آنکھیں بند کیں۔ "یہ بچے بھی نا۔"

"میں اس فیور کو یاد رکھوں گا۔" اورنگ زیب نے بلند آواز میں کہا تھا۔ حنین اور وارث جانے کے لیے مڑے۔

"کیا کھانا کھا کر نہیں جاؤ گی؟" جواہرات ذرا مسکرا کر سرد آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں' ہم جلدی میں ہیں۔" وارث نے اسے اشارہ کیا۔

"بہت عرصے سے تم نے مجھے موویز کی فہرست نہیں بھیجی؟" اورنگ زیب نے اسی سخت اور بارعب لہجے میں پوچھا تھا' شاید ان کا سب سے نرم انداز یہی تھا حنین نے بے نیازی سے شانے جھٹکے۔

"میں اب موویز نہیں دیکھتی۔ وہ دو تین گھنٹے میں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر دل کرتا ہے' بالکل اس جیسی مووی اور بھی دیکھی جائے' مگر ویسی مووی نہیں ملتی۔ سو میں اب امریکی ٹی وی شوز دیکھتی ہوں۔ لمبے لمبے سیزن.... بار بار کی انجوائے منٹ۔"

یہ وہ آخری بات تھی جو اس نے کہی' پھر خدا حافظ کہہ کر وہ نکل آئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وارث نے ایک خاموش مگر گہری نظر ہاشم پہ ضرور ڈالی تھی۔

"میں تمہیں ایک نصیحت کروں گا۔ کاردارز سے فاصلہ رکھنا۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ سبزہ زار عبور کر رہے تھے جب اس نے کہا۔ حنین نے الٹا تعجب سے اسے دیکھا۔

"میں تو دو سال سے ان کے گھر بھی نہیں آئی'

کاردار صاحب کو بھی آخری میل سال پہلے کی تھی شاید۔ یہی بھجواتے ہیں ہر ماہ باسکٹ۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ ان کا بزنس کیا ہے۔"

"باسکٹ؟" اس سوال پہ حنین دل کھول کر ہنسی۔

"ہاشم بھائی کی بیٹی چھ مئی کو پیدا ہوئی تھی' سو ہر ماہ کی چھ تاریخ کو چاکلیٹس اور برانڈڈ سوئیٹس سے بھری باسکٹ سب رشتے داروں کے گھر آتی ہے کہ بھئی اب سونیا اتنے ماہ کی ہو گئی' اب اتنے کی۔ جب تک وہ دو سال کی نہیں ہو جائے گی' یہ ہوتا رہے گا۔ امیروں کے چونچلے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دور ہوتے جا رہے تھے۔

ہاشم نے کھڑکی سے ان کو جاتے دیکھا' آنکھوں میں گہری سوچ تھی' مگر پھر باپ کی آواز نے چونکایا۔

"ہاشم! مجھے ڈرافٹ نکال کر دو تاکہ میں پیپرز بنواؤں اور یہ کام تمہاری ناقابل اعتبار ماں کے جانے سے پہلے ہو جانا چاہیے۔"

ہاشم کے ابرو تن گئے' خاور کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا تو وہ سامنے آیا صوفے پہ براجمان باپ کے بالکل سامنے۔

"میری ماں کو ملازموں کے سامنے بے عزت مت کیا کریں۔"

وہ کھڑے ہوئے' ایک خشمگیں نگاہ اس پہ ڈالی اور دوسری جواہرات پہ' جس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے تھے' آنکھوں میں مسرت چمکی۔

"جو کہا ہے' وہ کرو' مجھے مت سمجھایا کرو۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کا دروازہ بند ہوتے ہی جواہرات تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"کیا تم نے دیکھا' وہ ہمیشہ کس ہتک سے ملازموں کے سامنے۔"

"ممی! میرے ساتھ میرے باپ کے خلاف بات مت کیا کیجئے۔" جواہرات رک گئی' نگاہیں یک ٹک ہاشم کے چہرے پہ ٹھہر گئیں۔ وہ غصے میں لگ رہا تھا۔

"آئندہ آپ ان سے غلط بیانی نہیں کریں گی۔

زمین نہیں پہنچنی تو مجھے بتائیں ' ہاشم ہر مسئلہ سنبھال سکتا ہے۔ خود غلط قسم کے اقدام مت کیا کریں۔"

جواہرات نے اس کو دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔ ہاشم ایک طرف سے گزر کر باہر نکل گیا۔

برآمدے کے اونچے ستونوں کے ساتھ خاور چوکس مودب کھڑا تھا۔ وہ برہمی سے کہتا اس کے سامنے آیا۔

"تم میری ماں کے لیے کام نہیں کرتے ' میرے باپ کے لیے بھی کام نہیں کرتے۔ تم میرے لیے کام کرتے ہو۔ آئندہ ان دونوں کا کوئی بھی ایسا حکم مت ماننا' جو ان کے درمیان کسی جھگڑے کا سبب بنے۔ کیا میں دہراؤں یا تم سمجھ گئے ہو؟" خاور نے سر جھکا لیا۔

"سوری سر! مسز کاردار نے مجھے دھمکی... اوکے میں احتیاط کروں گا۔"

ہاشم نے گہری سانس لے کر گردن موڑی۔ یہاں سے انیکسی نہیں نظر آتی تھی' وہ پچھلی طرف تھی' مگر اسے کچھ ان دیکھا نظر آیا تھا۔

"یہ آدمی... فارس کا بھائی وارث غازی' اس پہ نظر رکھو خاور! فون ٹیپ کرو' آفس بگ کرو۔ جو بھی کرو میں نے سنا ہے یہ پیٹرولیم درآمدات کی ڈیلنگز کی رپورٹ تیار کر رہا ہے۔ بظاہر کوئی خطرے کی بات نہیں ہے' مگر جس طرح یہ مجھے دیکھ رہا تھا... ابھی سمجھ گئے ہو نا؟" اس کا کندھا تھپتھپا کر پوچھا۔ خاور نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"گڈ!" ہاشم واپس مڑ گیا اور کاردار قصر پہ اترتی نیلی شام آہستہ آہستہ سیاہی میں بدلتی رہی۔



فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری تحقیر ہوتی ہے
میں مسجود ملائک ہوں ' مجھے انسان رہنے دو

ذوالفقار یوسف کے گھر کا لاؤنج آج زیادہ ہی پر رونق لگ رہا تھا۔ زمر رات ان کے پاس ٹھہرنے کو آئی تھی۔ ندرت خوشی خوشی اسٹور سے صاف تولیے اور لحاف وغیرہ نکال رہی تھیں۔ حنین البتہ قدرے مضمحل سی زمر کے سامنے والے صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھی تھی۔ زمر نے بہت دفعہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھا مگر پھر خاموش رہی۔

حنین کا چہرہ اسکول سے آتے ساتھ ہی ایسا تھا۔ جس بات کو وہ اتنے دنوں سے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی' وہ آج زیادہ بھیانک طریقے سے سامنے آ گئی تھی۔ اس کی اس بد تمیز' مغرور اور نالائق کلاس فیلو سبرینہ جاوید کی والدہ یاسمین جاوید جو اسکول کی وائس پرنسپل بھی تھیں' نے اسے آج اپنے آفس میں بلایا تھا۔

"آپ نے نائنتھ میں بورڈ ٹاپ کیا تھا حنین! کیونکہ آپ کے نوٹس بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

"جی... میم!" اس نے محتاط نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا۔ وہ کرسی پہ بہت تمکنت اور رعب سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اور سبرینہ کافی دن سے آپ سے نوٹس مانگ رہی ہے' نہ نوٹس آپ نے دیے نہ ہی اس کی پریکٹیکل نوٹ بک بنا کر دی۔"

"میم! وہ نوٹس میں لیکچر کے دوران لیتی ہوں۔ انگریزی کے خط' مضمون وغیرہ میں جن کتابوں سے تیار کرتی ہوں وہ میرے بھائی اور پھپھو کی پرانی کتابیں ہیں۔ وہ میں کیسے کسی کو دے سکتی ہوں؟ اور میں اس کو کیوں نوٹ بک بنا کر دوں؟"

"آپ کو پتا ہے نائنتھ کا بورڈ ٹاپ تب میٹر کرے گا جب آپ دسویں میں بھی ٹاپ کریں۔ ملا کر رزلٹ آئے گا نا؟ سو آپ سبرینہ کی مدد کیا کریں' اگر نہیں کریں گی تو اس بات کو ذہن میں رکھیے گا کہ وائس پرنسپل چاہے تو آپ کا داخلہ بھی نہ بھیجے' چاہے تو ایسے کمنٹس لکھ کر اسکول سے خارج کر دے کہ اگلے تین سال تک کوئی اسکول ایڈمیشن دینے کا اہل نہ رہے۔ منڈے تک سبرینہ کی نوٹ بک تیار ہونی چاہیے۔ آپ جا سکتی ہیں۔"

اور وہ بے بسی' غصہ' یہاں تک کہ ڈر' ہر جذبے میں گھری واپس آئی اور تب سے ایسے ہی تھی۔

"امی... میرے براؤن جوتے نہیں مل رہے

لنڈے والے۔" سیم کو پھپھو کی موجودگی میں تازہ تازہ خریدے جوتوں کو دکھانے کی جلدی تھی اس لیے کافی دیر سے آوازیں لگا رہا تھا۔ حنین چونکی، پھر اٹھ کر اندر گئی جہاں وہ الماری کھولے کھڑا تھا اور اسے زور کی چٹکی کاٹی۔

"کتنی دفعہ امی نے بتایا ہے، لنڈا نہیں کہتے، ایل شاپ کہتے ہیں۔"

"اچھا!" اور پھر سے حلق پھاڑ کر چلایا۔ "امی، امی! میرے ایل شاپ والے جوتے نہیں مل رہے، جو لنڈے سے لیے تھے۔"

"اف!" وہ کراہ کر باہر نکل آئی۔ زمر بمشکل مسکراہٹ روک کر بیٹھی تھی۔ حنین پھیکا سا مسکرائی۔

"باہر ہوا ہے اوپر ٹیرس پہ بیٹھتے ہیں۔" زمر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیم جوتے ڈھونڈ کر فوراً" باہر آیا اور آنکھیں پھیلائے تعجب سے اسے دیکھا۔

"پھپھو! اس وقت باہر نہیں جائیے گا۔ ہمارے لان کا درخت ٹیرس تک جاتا ہے۔ اس پہ جن ہوتے ہیں۔"

زمر نے گہری سانس لی۔ جنات.... جن کے بارے میں سنانے کو ہر شخص کے پاس ایک کہانی ضرور ہوتی ہے۔

"اور پتا ہے پھپھو! میرے دوست کے گھر کے قریب ایک قبرستان ہے جہاں۔" سیم پرجوش سا سنانے لگا۔ وہ اس عمر میں داخل ہو گیا تھا جب بچے اسکول سے آکر "میری ٹیچر اور میرا دوست" کے اقوال زریں سارا وقت سناتے ہیں۔ زمر نے نرمی سے اس کے ماتھے سے بال ہٹائے۔

"میں تمہیں اس سے بہتر کہانی سناتی ہوں۔ مگر پہلے اوپر چلو۔" سیم کی پریشانی نظرانداز کر کے وہ اوپر آ گئے۔ حنین بھی بجھی بجھی سی ان کے ساتھ تھی۔

اوپر والا پورشن کسی دوسری فیملی نے کرائے پہ لے رکھا تھا۔ البتہ ٹیرس کی طرف بیرونی لوہے کا زینہ جاتا تھا اور وہاں یہ لوگ بھی بیٹھ جایا کرتے تھے کبھی کبھار۔ باغیچے کا درخت ٹیرس کے ایک حصے پہ گھنا سا سایہ کرتا تھا۔ وہ درخت سے دور، وسط میں بچھی کرسیوں پہ جا بیٹھے۔

"تو اسامہ یوسف خان جنات سے ڈرتا ہے؟" سیم کو بازو کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ بٹھائے، وہ کن اکھیوں سے سامنے بیٹھی حنین کو دیکھتے ہوئے بولی۔ سیم نے تذبذب سے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ.... ڈراؤنے ہوتے ہیں نا۔"

"اور یہ تو تمہیں پتا ہے کہ انسان فرشتوں اور جنوں سے زیادہ اشرف ہے۔ یعنی کہ زیادہ نوبل ہے۔"

"مجھے پتا ہے۔" اس نے دینیات میں پڑھ رکھا تھا۔ اشرف المخلوقات۔

"تو انسان زیادہ نوبل اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ ہم وہ بھی کر سکتے ہیں جو جن نہیں کر سکتے۔"

"جن غائب ہو سکتے ہیں پھپھو!"

"ہاں اور ہمیں چھپنے کے لیے غائب ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ آرام سے پریشانی اور اندر کا خوف دوسروں سے چھپا کر خود کو نارمل ظاہر کر لیتے ہیں۔" زمر نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ حنین چونکی تھی۔

"مگر وہ اڑ بھی سکتے ہیں۔" سیم کو جنوں کی تحقیر پسند نہیں آ رہی تھی۔

"اور ہمیں اوپر جانے کے لیے پیروں کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کردار ہمیں بلند کرتا ہے۔ ہم زیادہ مضبوط ہیں کیونکہ ہم اپنی فیملی کا مشکل اور پریشانی میں ہاتھ تھامتے ہیں۔"

"مگر...." سیم ذرا کی ذرا درخت کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا مگر زمر اسے سمجھا بھی نہیں رہی تھی۔

"میں تمہارے دوست سے زیادہ اچھی جنوں کی کہانی سناتی ہوں تمہیں۔" وہ سیم کو مخاطب کر کے اس کے بال سہلاتی کہہ رہی تھی۔ حنین بھی ذرا آگے ہو کر غور سے سننے لگی۔

"صدیوں سے جن آسمانوں کا سفر کرتے، فرشتوں کی باتیں سنا کرتے تھے۔ پھر ایک دن اچانک انہوں نے آسمانوں کو ٹٹولا تو اسے سخت پایا۔ وہ کان لگانے گئے

تو ان پہ شعلے برسنے لگے۔ وہ اس وقت نہیں جانتے تھے کہ ان کے رب نے انسان کے ساتھ نیکی کا ارادہ کیا ہے یا برائی کا۔ تو وہ زمین میں پھیل گئے تاکہ خبر لیں کہ کیا غیر معمولی واقعہ پیش آ رہا ہے جو آسمان پہ اتنے پہرے لگ گئے ہیں۔"

کہتے ہوئے اس نے آسمان کو دیکھا۔ وہ تاریک تھا۔ چاند کے بغیر' صرف تاروں سے ڈھکا۔ پراسرار' خاموش اور گہرا۔

"پھیلتے پھیلتے ان میں سے کچھ وادی نخلہ پہ جا پہنچے۔ وہاں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو فجر کی نماز پڑھا رہے تھے تو قرآن اتر رہا تھا۔ نماز کا قرآن جب انہوں نے سنا تو ان کے دل بدل گئے۔ وہ فوراً" اپنی قوم' اپنے خاندانوں کی طرف پلٹے اور ان کو بتایا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو راہنمائی دیتا ہے۔ تو سیم یوسف...... تمہارے دوست کا دوست جو بھی کہے' مجھے تو قرآن میں جنات کا ذکر بہت پیار سے بیان کیا ملا ہے۔ مجھے تو وہ بہت نوبل لگے۔ انہوں نے سچائی جان لی تو اسے چھپایا نہیں۔ اپنے لوگوں میں واپس جا کر ان تک حق پہنچایا۔ یہ تو انسانوں کی اچھائی ہے نا۔ سچ کے لیے اسٹینڈ لینا۔ کیا اب بھی تم جنوں سے ڈرتے ہو؟"

سیم جو بالکل مسحور ہو کر سن رہا تھا' استفسار پہ چونکا ذرا سے شانے گرائے۔

"نن..... نہیں تو۔"

"جنوں سے نہ ڈرا کرو سیم! ایٹم بم نہ انہوں نے بنائے تھے' نہ برسائے تھے۔ انسان زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

حنین یک ٹک' مبہوت سی سن رہی تھی۔ زمر اب سیم کو نیچے سے کچھ لانے کے لیے بھیج رہی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے زمر کو اپنی طرف رخ کرتے دیکھا۔

"اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم ڈرنا چھوڑ دو حنہ! انسان کو انسان بننے کے لیے بہادر بننا ہوتا ہے۔" نرمی سے مسکرا کر کہا۔ تاریک رات' گھنا درخت' ٹیرس کی تنہائی' حنین کے اندیشے' خوف سب اس کی آنکھوں کی نرمی میں زائل ہو تا گیا۔ زمر نہیں پوچھے گی' یہ تو طے تھا۔ وہ صرف سوال کا اعتماد دے کر فیصلہ دوسرے پہ چھوڑ دے گی۔

حنین اٹھی اور سیم کی جگہ پہ اس کے قریب آ بیٹھی۔ اب سر جھکا کر انگلیاں مروڑتے ہوئے بات کا آغاز کرنا چاہا' مگر الفاظ حلق میں پھنس گئے۔ زمر نے غور سے اس کا جھکا چہرہ دیکھا۔

"میں ایک بہت پر اعتماد لڑکی کو جانتی ہوں' جو ہر بات کا ترنت جواب دے کر سب کو ہنسا دیتی ہے۔ آج کیا وہ گھر پہ نہیں ہے۔ میں جب سے آئی ہوں' مجھے نظر نہیں آئی؟"

حنین ہلکا سا ہنس دی۔ سر اٹھایا۔ ہنسی سمٹی۔ آنکھوں میں اضطراب ابھرا۔

"علیشا کہتی ہے' میری امریکن دوست کہ مسئلوں کے دو حل ہوتے ہیں' یا خود میں ہمت تلاش کر و یا زیادہ ہمت والے کو۔"

"اور.....؟"

"میری کلاس فیلو مبرینہ....." پہلا قدم مشکل ہوتا ہے' پھر اگلے قدم تو خود بخود اٹھنے لگ جاتے ہیں۔ جیسے برسوں کی عادت ہو۔ ساری بات سن کر زمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"پہلی بات' تمہیں اسکول میں bully کیا جا رہا ہے' بلکہ یہ ہراس منٹ ہے اور یہ جرم ہے۔ حنہ! کبھی بھی زندگی میں ظلم کے اوپر خاموش نہیں رہنا' اوکے؟"

حنین نے فوراً" اثبات میں گردن ہلائی۔

"دوسری بات' یہ مسئلہ تو میں دو دن میں حل کر سکتی ہوں۔ میرے پاس ایک ایسا پلان ہے۔ جس کے بعد وہ ٹیچر دوبارہ تمہیں دھمکانے کی جرات نہیں کر سکیں گی۔"

"واقعی؟" حنین کی آنکھوں میں حیرت' خوشی' غرض ہر مثبت جذبہ چمکنے لگا۔

"ہاں' تم دیکھتی جاؤ۔ میں کیا کرتی ہوں۔"

حنین کا چہرہ گویا دمکنے لگا۔ الفاظ دنیا بناتے ہیں۔ الفاظ دنیا بکھیرتے ہیں۔ صرف الفاظ نے ہی اسے اتنا

مطمئن کردیا تھا۔ وہ پرسکون سی ہو کر بیٹھ گئی، پھر جلدی سے سیدھی ہوئی۔

"اوہ۔ امی نے ٹرائفل بنا کر رکھا تھا فریج میں۔ آئیں نیچے چلتے ہیں، ورنہ موٹا آلو سب کھا جائے گا۔"

زمر ہلکا سا ہنس دی مگر وہ نیچے نہیں گئی۔ اس نے حنہ کے جانے کا انتظار کیا۔ ساتھ ہی چہرے کا پرسکون تاثر غائب ہوا۔ اس کی جگہ مضطرب سوچ نے لے لی۔ اس نے موبائل نکالا، فون بک اوپر نیچے کی۔ ایک نمبر پہ رکی۔

اس نے چوتھی گھنٹی پہ اٹھالیا تھا۔

"فارس! میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

وہ جم سے آرہا تھا، سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

نہیں میم! بتایئے۔"

"میری ایک فرینڈ کا کیس ہے.... مقابل ایک اسکول کی وائس پرنسپل ہیں۔" تاریک رات میں سرگوشی نما آواز میں وہ کہہ رہی تھی۔ "اور وہ خاتون ہاتھ نہیں آرہیں، تو ان کو ڈیل کرنے کا کوئی پلان ہے آپ کے پاس؟"

زمر نے گہری سانس لی۔ نیچے سے حنین اور اسامہ کے پھر کسی بات پہ لڑنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ سماعت کی حد سے دور تھے۔

"نہیں، لیکن اگر میں یہ اس فرینڈ کو ابھی کہہ دیتی تو وہ کبھی دوبارہ اپنا مسئلہ لے کر میرے پاس نہیں آئے گی۔ سچ بتاؤں تو مجھے نہیں پتا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اوکے آپ ان خاتون کا کوئی نمبر، پتا وغیرہ دے دیں ان کی بیک گراؤنڈ فائل تیار کرکے آپ کو بھجوادوں گا۔ کچھ تو مل جائے گا ان کے خلاف استعمال کرنے کو۔"

"تھینک یو سو مچ فارس! بس یہ ہمارے درمیان رہے۔"

"ٹھیک اور کوئی مسئلہ؟" وہ ذرا رکا۔ مگر زمر نے دوبارہ سے شکریہ کرکے فون رکھ دیا۔ اب وہ بہتر محسوس کررہی تھی۔

بے چارے پرانے اسٹوڈنٹس کتنی عزت کرتے ہیں۔ کاش میڈم یاسمین بھی عزت کروانا جانتی ہوتیں۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔



کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آکے رکتے ہیں قافلے سے

صبح حنین حسب عادت بھاگم بھاگ اسکول کے لیے تیار ہوئی تھی۔ زمر اور سیم بالکل تیار اس کے انتظار میں دروازے پہ کھڑے تھے۔ ادھر وہ آئی، ادھر گھنٹی بجی۔ زمر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک نوجوان باہر کھڑا تھا۔ سوٹ میں ملبوس۔ سن گلاسز لگائے ہاتھ میں لمبا سا ڈبا۔

"حنین یوسف؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ایک طرف ہوئی۔ حنین بھاہر آئی۔

"کاردار صاحب نے بھجوایا ہے۔" وہ ان کا کوئی ملازم تھا۔ پیکٹ حوالے کرکے مودب سا پلٹ گیا۔ باہر اس کی کار کھڑی تھی۔

حنین قدرے حیران، قدرے الجھی ہوئی ڈبا لے کر اندر آئی۔ گول میز پہ اسے رکھا۔ سب ارد گرد اکٹھے ہوگئے۔ اس نے ذرا تذبذب سے ڈھکن ہٹایا اور پھر .... وہ سانس لینا بھول گئی۔

نیا نکور لیپ ٹاپ، آئی پیڈ، آئی فون، آئی پوڈ۔ ہر جدید آلہ الگ الگ ڈبے میں تھا۔ اور ان کے اوپر ایک نوٹ۔

"میں کسی کا احسان نہیں بھولتا۔ اورنگ زیب۔"

زمر نے نوٹ پڑھا۔ ندرت نے آہستہ سے اسے بتایا کہ وہ کون ہیں۔ (فارس کا وہ کزن ہاشم جس کا سعدی اکثر ذکر کرتا ہے؟ اوکے!) وہ حنین کے تاثرات دیکھنے لگی۔ جو اب شاک سے نکل کر خوشی خوشی سب کھولنے لگی۔ ندرت البتہ چپ ہوگئیں۔

"اتنے مہنگے تحفے۔ یہ ہمیں نہیں رکھنے چاہئیں۔"

زمر سیم کو لے کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ان کی اتنی ذاتی سی گفتگو میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ نکلتے ہوئے اس نے حنین کی آواز سنی۔

"امی یار! کیا ہے؟ میں نے ان کا لیپ ٹاپ ٹھیک

کیا' وہ شکریہ کرنا چاہ رہے ہیں' ایسے کیسے واپس۔۔۔" وہ باہر آگئی۔

جب حنہ کار میں آکر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تو اپنی امی کا موبائل کان سے لگائے بات کر رہی تھی۔ زمر کو معلوم تھا کس کی کال ہو گی۔

"اس کی آدھی رات ہو گی حنہ!" اس نے مسکرا کر کہتے کار اسٹارٹ کی مگر وہ سنے بغیر پر جوش سی تفصیلات بتا رہی تھی۔

"لیپ ٹاپ سلور کلر کا ہے اور آئی پوڈ۔"

"میری بات سنو حنہ! تم یہ سب واپس کر دو۔" وہ نیند سے اٹھ چکا تھا اور اب مکمل الرٹ تھا۔ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ زمر نے ڈرائیو کرتے ایک نظر اس پہ ڈالی۔

"یہ سب میں تمہیں لے دوں گا۔"

"اور اگر تب میں آپ کو واپس کر دوں تو آپ کو کیا لگے گا بھائی! انہوں نے کوئی غریب رشتے دار سمجھ کر' ترس کھا کر نہیں دیا۔ میں نے ان کا کام کیا تھا' انہوں نے شکریہ ادا کیا ہے۔ اگر میں تحفوں کی لالچی ہوتی تو جب وہ کبھی کبھار پوچھتے ہیں کہ فلاں ملک جا رہا ہوں تمہیں کچھ چاہیے تو ہر دفعہ یہ کہہ کر انکار نہ کرتی کہ سوری انکل! میں بغیر وجہ کے تحفہ نہیں لیتی۔"

"اوہ اچھا۔" وہ واقعی سمجھ گیا۔ "او کے تم رکھ لو۔ اب مجھے سونے دو۔"

حنین نے فون رکھ دیا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ پھر قدرے الجھتے ہوئے زمر کو دیکھا۔

"اگر آپ کو کوئی ایسے تحفہ دے تو آپ رکھ لیں گی؟" وہ اپنے عمل کی صفائی چاہ رہی تھی۔ زمر کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ اس نے گیئر سے پچھلا خانہ کھولا اور کچھ نکال کر اس کی گود میں رکھا۔ سیاہ مخملیں ڈبی اور ایک تہہ شدہ کاغذ۔ حنین یوسف سن رہ گئی۔

"کل صبح مجھے یہ کسی نے کوریر کیا تھا۔ پڑھو۔"

حنین کا چہرہ فق ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے زمر کی شکل دیکھی۔ وہ پر سکون ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل سے کاغذ اٹھایا۔ جیولری تک ٹھیک تھا۔

ماموں سے لو لیٹر کی توقع نہیں تھی۔ کاغذ کی تہیں کھولیں۔

"پہلے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کلاس میں کبھی۔ یہ آپ پہ اس سے زیادہ سوٹ کرے گی جو آپ پہنتی ہیں۔"

(اسے لو لیٹر کہتے ہیں؟ اس سے اچھا لو لیٹر تو لنکن بروز لکھ لیتا) ماموں کی لکھائی وہ صاف پہچان گئی۔ خوف زائل ہوا' الجھن سے سر اٹھایا۔

"کیا آپ یہ نوز پن رکھیں گی؟"

زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم نے تو ابھی اسے کھولا ہی نہیں۔"

حنین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"اس میں۔۔۔ لکھا ہے کہ یہ آپ پہ سوٹ نہیں کرتا۔" ناک کو انگلی سے چھوا۔ "اگر کسی کا اتنا سینس ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ نوز پن زیادہ اچھی لگے گی۔ اب دیکھیں میرا گیس ٹھیک نکلتا ہے یا۔۔۔" کہتے ساتھ ڈبی کھولی۔ ہیرے کی لونگ سامنے تھی۔ حنین نے فاتحانہ دیکھا کہ کرشانے اچکائے۔

"کیا آپ کو معلوم ہے یہ کس نے بھیجا ہے؟" ذرا احتیاط سے پوچھا۔

"اتنے بیجز پڑھائے ہیں' سینکڑوں اسٹوڈنٹس گزرے۔ مگر بہت کم لڑکیوں کو میرے گھر کا پتا معلوم ہے۔ انہی میں سے کوئی ہو گی۔"

"ہو گی؟" حنین کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"تو۔۔۔ اب آپ کیا کریں گی؟"

"اس کوریر کمپنی جا کر واپسی کا پتا لینے کی کوشش کروں گی' آخر انہوں نے بھی کیسے ڈائمنڈ جیولری کوریر ہونے دی۔ پھر اس کو واپس کروں گی' کیونکہ میں اسٹوڈنٹس سے تحفے نہیں لیتی۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔"

"تو پھر میں بھی کاردار صاحب کو یہ سب واپس کر دیتی ہوں۔ میرے بھی کچھ اصول ہونے چاہئیں۔ بات ختم۔" حنین نے ذرا خفگی سے کاغذ ڈبی میں رکھا۔ ڈبی واپس رکھی اور باہر دیکھنے لگی۔

زمر نے گہری سانس لی۔ حنین اور اپنے درمیان تازہ تازہ تکلف کی خلیج میں آنے والی کمی کو ایک اصول کے پیچھے ۔۔۔؟ اونہوں۔ اصولوں میں ترمیم ہو سکتی ہے۔ اپنوں کے لیے سب ہو سکتا ہے۔

"اوکے 'میں اسے رکھ لیتی ہوں۔" حنین محض سر ہلا کر باہر دیکھتی رہی۔ زمر نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"تم کیوں مسکرا رہی ہو؟"

اس نے گڑبڑا کر جبڑا سیدھا کیا اور گردن دائیں بائیں گھمائی۔ "نہیں تو۔" اور مزید رخ پھیر لیا۔

اسکول میں وہ دونوں ایک ستون کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھیں۔ نگاہیں گیٹ پہ مرکوز تھیں۔ "ہمیں صرف ان کا ایڈریس چاہیے 'یا کوئی دوسری کانٹیکٹ انفارمیشن۔"

"وہ رہی سبرینہ۔" اس نے اندر آتی لڑکی کی طرف اشارہ کیا' پھر بے چینی سے زمر کو دیکھا۔

"مگر آپ اس کا نمبر پتا کیسے حاصل کریں گی؟ اس کے لیے تو آپ کو ریکارڈ روم میں جانا ہو گا' یا اسکول کے ڈیٹا بیس سسٹم ۔۔۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

وہ جو ستون کی اوٹ سے نکل کر جانے لگی تھی' حنین کے ہڑبڑانے پہ رک کر اسے دیکھا' ہلکا سا مسکرائی۔

"سبرینہ سے اس کا پتا لینے۔" اور ہکا بکا کھڑی حنین کو چھوڑ کر ذرا آگے آ گئی۔ تب تک سبرینہ برآمدے تک آ چکی تھی۔ حنین "فوراً" گھوم گئی۔ سماعت وہیں لگی تھی۔

زمر سبرینہ کے پاس سے گزرنے لگی' پھر اس کا چہرہ دیکھ کر رکی اور خوشگوار حیرت سے اسے پکارا۔

"ارے سبرینہ ۔۔۔ میڈم یاسمین کی بیٹی ہو نا آپ؟ کیسی ہو؟ میڈم کیسی ہیں؟"

سبرینہ رکی' ذرا الجھا الجھا سا مسکرائی۔

"جی میں سبرینہ ۔۔۔ آپ۔"

"ڈونٹ ٹیل می! تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ بچپن میں تم کتنی ہیلدی تھیں' مگر اب زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔ امی کدھر ہیں؟ ابھی جاب کر رہی ہیں؟"

"آ۔۔۔ جی' امی وائس پرنسپل۔"

"کتنی آؤٹ آف ٹچ ہو گئی ہوں۔ میں بھی دبئی چلی گئی تھی نا' ابھی بھتیجی کے ایڈمیشن کے لیے آئی تھی۔ ایسا کرو مجھے اپنا نمبر دے دو۔" کندھے پہ ٹنگے پرس سے جلدی جلدی نوٹ بک اور قلم نکال کر اسے تھمایا۔ "لینڈ لائن بھی دینا اور ایڈریس بھی دے سکو۔ میں میڈم سے ملنے آؤں گی کسی دن۔" سبرینہ کو سوچنے کا زیادہ وقت نہیں ملا۔ وہ کاغذ پہ الفاظ گھسیٹنے لگی۔

جب وہ دور چلی گئی تو زمر ستون تک واپس آئی۔ کاغذ حنین کے سامنے لہراتے ہوئے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ واقعی متحیر کھڑی تھی۔

"تم نے ابھی میری یہ والی سائیڈ دیکھی نہیں تھی حنہ!"

"واقعی زبردست پرفارمنس تھی۔" پھر وہ حیران پریشان اسمبلی کے لیے بھاگی' مگر ٹھہر کر مڑی۔ "یہ۔۔۔" ناک پہ انگلی رکھی۔ "آپ پہ واقعی اتنی سوٹ نہیں کرتی۔" اور بھاگ گئی۔

زمر نے کار میں واپس بیٹھتے ہوئے لمحے بھر کو آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سونے کی بالی جیسی نتھ کیا واقعی اس پہ سوٹ نہیں کرتی؟ اونہوں ۔۔۔ اس کو مایوسی ہوئی۔



وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

شام کی ٹھنڈی ہوا میں درختوں کے پتے سرسراتے ہوئے موسیقی بکھیر رہے تھے۔ سعدی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس خوب صورت گھر کے سامنے رکا' جنگلے کا چھوٹا سا گیٹ دھکیل کر کھولا اور سبزہ زار پہ آگے چلتا آیا۔

کھلا سا لان' اس طرف پورچ' وہاں سے دیوار خم دار مڑتی۔ وہ موڑ مڑ کر داخلی حصے کی طرف آیا تو ایک دم ٹھٹک کر رکا۔

ہاشم کی بیوی' شہرین وہاں کھڑی تھی۔ سعدی کی

طرف پشت، داخلی دروازے پہ نگاہ رکھے، وہ جھنجلائی ہوئی موبائل پہ بات کر رہی تھی۔

"ہاشم کو پہلے ہی مجھ پہ شک ہے اور اب تو اس کی ماں بھی ادھر ہے۔ میں روز روز تم سے ملنے نہیں آسکتی کزن ہو تو کزن بن کر رہو، میں۔"

بس چند سیکنڈ ہی تھے، سعدی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مڑے یا آگے چلتا جائے اور تب ہی شہرین کسی احساس کے تحت پلٹی۔ فرفر چلتی زبان رکی، چہرہ فق ہوا۔ ایک دم کان سے لگا ہاتھ فون سمیت پہلو میں گرا دیا۔

"السلام علیکم۔" وہ سر جھکا کر سرسری سلام کرتا دروازے کی طرف بڑھا۔

"وعلیکم ... میں بہن سے بات کر رہی تھی۔" وہ مضطرب سی بولی۔ وہ ان جانا بن کر سوری کہتا، شہرین چپ ہو گئی۔

"مسز جواہرات اندر ہیں؟"

"ہاں۔" جلدی سے آگے آئی، دروازہ کھولا اور حلق کے بل چلائی۔ "میری... میری۔"

میری اینجیو دوڑتی آئی۔ شہرین نے اشارہ کیا۔ وہ فوراً" سعدی کو اندر لے گئی۔ شہرین ڈور اسٹیپ پہ کھڑی اب بے چین سی اس کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ سیاہ فام ہاؤس کیپر نکلتے دکھائی دی تو اس نے اسے روکا۔

"سنو! یہ لڑکا کون ہے؟"

"یہ سعدی ہے۔ نوشیرواں کا دوست۔"

اوہ۔ فارس کا بھانجا۔ ہاشم ذکر کرتا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر ادھر چکر کاٹا۔ جواہرات اسٹڈی میں ہیں۔ وہ اسٹڈی میں تھی لاؤنج کے بجائے۔ یعنی اس لڑکے کو اسی نے بلوایا تھا۔ اوہ نو اگر اس نے کچھ بک دیا تو؟

وہ فکر مندی سے اسٹڈی کے دروازے تک آئی، لکڑی کا ساؤنڈ پروف دروازہ بند تھا۔ وہ دونوں اندر تھے۔ اب؟

پھر ایک خیال ذہن میں لپکا۔ وہ گھر سے باہر آئی۔ عمارت کے اطراف سے گھوم کر اسٹڈی کی کھڑکی کے ساتھ رکی۔ لبوں پہ مسکراہٹ ابھری، اندازہ درست تھا۔ جواہرات کھڑکی کھول کر بیٹھنے کی عادی تھی اور اس وقت بھی وہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سعدی اس کے مقابل کرسی پہ تھا۔ دونوں کے درمیان میز تھی جس پہ تازہ پھولوں کا گلدستہ تھا۔ جواہرات انگریزی طرز کے لباس میں ملبوس کہنی کرسی کے ہتھے پہ ٹکائے، دو انگلیوں سے لاکٹ کا ہیرا چھیڑتی، مسکرا کر اس کو سن رہی تھی۔

شہرین دیوار کے ساتھ لگی قریب سرک آئی۔ کان گفتگو پہ لگے تھے۔ اپنا نام سننے کے خوف میں۔

"ہمارے ڈپارٹمنٹس الگ ہیں، میں اس کا زیادہ دھیان نہیں رکھ پاتا، مگر پچھلے دنوں کچھ دوستوں سے یہ سب پتا لگا تو میں نے سوچا۔" ساتھ ہی شانے اچکا دیے۔

"میں آگئی ہوں۔ سب سنبھال لوں گی۔" جواہرات نے مسکرا کر سر کو خم دیا۔ "میں صرف تمہارے منہ سے سب سننا چاہتی تھی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے گھر میں بھی ڈرگز رکھی ہوں گی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید کمرے میں ہوں۔ میں یہاں کم ہی آتا ہوں۔ مگر... آپ اسے پیار سے سمجھائیے گا۔" وہ فکر مند بھی تھا۔ جواہرات نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"کہتے ہیں، خدا نے آسمانوں سے چار کتابیں اتاریں، اور پھر پانچواں ڈنڈا اتارا۔ جو ان سے نہیں مانتا وہ اس سے مانے گا۔"

"پھر بھی ... اچھا میں شیرو سے مل لوں۔" وہ اجازت چاہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے اسی تمکنت سے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم اس کا خیال رکھتے ہو۔"

شہرین قدرے حیران سی وہاں سے ہٹی۔ چہرے پہ الجھن تھی۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر سنائی دیے مگر اپنا ذکر نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی سوچتی رہی، پھر اندر واپس آگئی۔

اب شیرو کے کمرے سے آوازیں آرہی تھیں۔

دروازہ آدھا کھلا تھا۔ قریب ایک شوکیس دیوار سے لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر ایک میگزین بظاہر الٹ پلٹ کرنے لگی۔

وہ اندر کاؤچ پہ بیٹھا تھا۔ بار بار گھڑی دیکھتا' دونوں ابھی یونیورسٹی کی باتیں کر رہے تھے۔ نوشیرواں گھر کے کپڑوں میں ہمیشہ کی طرح بے نیاز سا لگ رہا تھا۔

"کیا تم ممی سے ملے؟" ازلی لاپروائی سے کہتے شیرو نے روم فریج سے سافٹ ڈرنک کے دو کین نکالے' ایک اس کی طرف اچھالا اور دوسرے میں خود دانت گاڑھ دیے۔ سعدی نے کیچ کر کے سائیڈ پہ رکھ دیا۔ اسے جلد واپس جانا تھا۔

"ہاں' انہوں نے ہی بلایا ہے۔ پچھلی دفعہ ان کے آنے پہ میں ملنے نہیں آسکا تھا تو ان کا شکوہ بنتا ہے۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

"ممی بھی نا' بڑی پوزیسیو ہیں۔" شیرو نے گردن پیچھے پھینک کر گھونٹ بھرا' پھر سیدھا ہوا۔ "لونا۔"

"او نہوں میں چلتا ہوں۔" سعدی کی نظر کمپیوٹر اسکرین پہ پڑی۔ "اوہ شیرو! تم اور حنین اس گیم کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

"ہفتے بعد لگائی ہے' سارا دن پڑھ پڑھ کر دماغ خالی ہو جاتا ہے۔"

سعدی نے مڑ کر دروازے کو دیکھا۔ یہاں سے آدھا لاؤنج نظر آتا تھا۔ شہرین نہیں دکھائی دیتی تھی۔

"یہ تمہاری بھابھی تھیں نا' بلونڈ بالوں والی؟"

باہر کھڑی شہرین کے اعصاب تن گئے۔ بھنویں بھنچ گئیں۔

"لو... کوئی بلونڈ نہیں ہے وہ۔ بال ڈائی کرواتی ہے۔ ہر تیسرے مہینے یہاں سے پانچ سو پونڈ کا ہیئر ڈو کروا کر جاتی ہے۔" وہ پھر سے ہنسا۔

"کس طرح کی ہیں تمہاری بھابھی؟" سرسری سا پوچھا۔

"صبح سویرے اتنا میک اپ کر کے کمرے سے نکلتی ہے۔ پھر سارا شہر گھومتی ہے' بھائی کا پیسہ بے تحاشا جھونکتی ہے' سونیا کا خیال بھی نہیں رکھتی' بھائی سے اکثر جھگڑا رہتا ہے۔ تمہیں کیسی لگی؟" گردن پیچھے کر کے گھونٹ بھر کے وہ کہہ رہا تھا۔

"ہوں اچھی ہیں۔" وہ جانے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ تب تک شہرین اپنے کمرے میں غائب ہو چکی تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ بستر کے کنارے آبیٹھی۔ چہرہ احساس ہتک سے سرخ پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں اضطراب' پریشانی' غصہ سب تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹتی رہی۔

پھر کافی دیر بعد باہر نکلی تو گھر میں خوب شور مچا تھا۔

"میں نے تم پہ اعتبار کیا مگر تم اس قابل نہیں تھے۔ بالکل اپنے باپ پہ گئے ہو۔ وہی مزاج' وہی غصہ' وہی عادتیں۔ ایک وہ فارس کم تھا تمہارے باپ کی کاپی' اسے گنز کا شوق ہے اور تمہیں... تمہیں اس کا۔"

شہرین حیران مگر محتاط سی قدم قدم چلتی شیرو کے کمرے کے دروازے تک آئی۔ وہ پورا کھلا تھا۔ اندر شیرو شاکڈ' شرمندہ' بوکھلایا سا کھڑا تھا اور بار بار ماں کو روک رہا تھا جو بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ایک ایک دراز کھول کر چیزیں باہر پھینک رہی تھی۔

شہرین نے بازو سینے پہ لپیٹ لیے اور ذرا سکون سے دیکھنے لگی۔

"ممی پلیز' میں....."

"میرا دل چاہ رہا ہے' ابھی پولیس کو فون کروں اور کہوں کہ اس ڈرگ ڈیلر کو آکر لے جائیں میرے گھر سے۔ یہ میرا گھر ہے' سنا تم نے؟ یہ میرا گھر ہے۔" وہ چلاتی ہوئی وارڈ روب سے کپڑے نکال نکال کر فرش پہ ڈال رہی تھی۔ دو سفید سرمئی بوٹیوں والے پیکٹ بھی باہر آگرے۔ شیرو نے سر جھکا دیا۔

"میرے بغیر تم کیا ہو؟ میرے بغیر تمہارا باپ کیا تھا؟ یہ اس کی ساری جائیداد... یہ میری عطا کی ہوئی ہے۔ یہ سب میرا باپ چھوڑ کر مرا تھا' تمہارا باپ لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور تم....." کسی دراز کی پشت پہ بازو لمبا کر کے ہاتھ ڈالا اور دو پیکٹ باہر نکال کر زور سے شیرو کے پیر پہ پھینکے۔ "تمہیں آج میں اس گھر سے باہر نکال دوں تو کہاں جاؤ گے؟ سڑکوں پہ سوؤ گے اور وہیں بھیک

مانو گے اور اگر تمہارے باپ کو یہ سب بتا دیا تو وہ تمہارا حال کیا کرے گا، معلوم ہے؟"

کمرا سارا بکھر چکا تھا۔ شیرو جز بز سا کھڑا تھا۔ غصہ، پشیمانی، بے بسی، سب جذبات مل گئے۔ ممی کو ایک دم کیسے......؟

"یہ، یہ اوقات ہے تمہاری؟" جواہرات نے جھک کر سفید پیکٹ اٹھایا اور زور سے شیرو کو دے مارا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر پیروں میں جاگرا "یہ فیوچر ہے تمہارا؟" وہ جھکی، میز سے اپنا موبائل اٹھایا، چہرے کے سامنے لائی۔ کیمرے کے کلک کلک پہ نوشیرواں نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ وہ تصویریں اتار چکی تھی۔

"ممی.... آپ کیا....."

"ممی مت کہنا مجھے۔" شیرنی غرائی۔ "اگلے آدھے گھنٹے میں بغیر کسی ملازم کی مدد کے تمہارے کمرے کی ایک ایک چیز درست جگہ پہ نہ گئی اور یہ ساری ڈرگز تم نے آتش دان میں نہ جھونکیں تو میں یہ تصویریں تمہارے باپ اور بھائی کو ای میل کر رہی ہوں۔ آدھا گھنٹہ ہے تمہارے پاس سنا تم نے؟" وہ ہیل والی سینڈل سے گری چیزوں کو ٹھوکر مار کر، شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتی دروازے کی طرف بڑھی۔ شہرین فوراً پیچھے ہو گئی۔ اور نوشیرواں چکرا کر رہ گیا۔

"کیا آدھا گھنٹہ؟ میں اتنی جلدی.....؟"

جواہرات ایڑیوں پہ واپس گھومی۔ "اب تمہارے پاس بیس منٹ ہیں۔ "ایک لفظ مزید منہ سے نکالو اور یہ دس منٹ میں بدل جائیں گے۔" سختی سے گھور کر وہ باہر نکلی اور ٹھاہ سے دروازہ بند کیا۔

نوشیرواں نے سر دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر بے اختیار چہرہ اٹھا کر گھڑی دیکھی۔ اوہ نو۔ جلدی سے وہ زمین پہ گری چیزیں اٹھانے لگا۔

مگر ممی کو کیسے شک ہوا؟ اتنے اچانک؟



یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

بڑے ابا کے لونگ روم میں خاموشی کا وقفہ بس چند لمحے کو آیا تھا۔ ندرت اپنا مدعا بیان کر کے قدرے بے بسی سے باری باری ساس، سسر کو دیکھنے لگیں۔ بڑے ابا چپ سے ہو گئے۔ پہلے فرحانہ بیگم کی طرف دیکھا جو اگلے ہی پل قطعیت سے نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔

"یہ ناممکن ہے۔ ہماری طرف سے انکار سمجھو ندرت!"

"فرحانہ!" بڑے ابا نے تنبیہی انداز میں ان کو دیکھا مگر کچھ معاملات میں ان کا زور اپنے شوہر پہ بہت چلتا تھا اور یہ انہی میں سے ایک تھا۔

"نہیں بھئی، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تمہارے بھائی کو نہیں جانتے ایسے کیسے کسی کو اپنی بیٹی دے دیں۔" وہ اپنی ناگواری ضبط کر رہی تھیں۔

"مگر بڑے ابا اس کو جانتے ہیں اور آپ وارث سے پوچھ سکتی ہیں۔ وہ....."

"لو.... وہ بھی تو تمہارا ہی بھائی ہے۔ طرف داری ہی کرے گا۔"

"ہم سوچ کر بتائیں گے ندرت!" وہ ذرا بلند آواز میں بولے تو فرحانہ خاموش ہوئیں۔ ندرت پھیکا سا مسکرائیں۔ قدرے بددلی سے ساس کی بڑبڑاہٹ دیکھی اور اپنا پرس وغیرہ سمیٹنے لگیں۔ وہ مایوس تھیں اور بڑی امی طیش میں۔ ان کے جانے کی دیر تھی کہ وہ بڑے ابا پہ برس پڑیں۔

"ندرت کی ہمت کیسے ہوئی اپنے بھائی کا رشتہ زمر کے لیے مانگنے؟"

"جیسے ہماری ہمت ہوئی تھی آپ کی بیٹی کے بھائی کا رشتہ ندرت کے لیے مانگنے کی۔" وہ بھی بڑے ابا تھے، تحمل اور سکون سے جواب دیا۔ وہ مزید تلملا گئیں۔

"تب مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ایسی نکلے گی۔ بچوں کو بھی اپنی طرح بنا دیا ہے، زبان دراز۔"

"وہ یتیم بچے ہیں فرحانہ! یتیموں کو نڈر بنانا چاہیے وہ بدتمیز نہیں ہیں۔"

"بہرحال! ہم ندرت کے بھائی کی طرف رشتہ نہیں دیں گے۔ وہ فضیلہ کے بیٹے میں آخر کیا برائی ہے۔

ادھر ہاں کر دیتے ہیں، کب سے وہ جواب مانگ رہے ہیں۔"
"فضیلہ بھی تو ندرت کی رشتے دار ہے، اس کا بیٹا فارس سے اچھا نہیں ہے۔"
"رہنے بھی دیں، فضیلہ میری امی کی طرف سے بھی رشتے دار لگتی ہے، ہاں۔" وہ مزید بگڑ گئیں۔
"آپ زمر سے پوچھ لیجئے فرحانہ! دونوں رشتے بتا دیجئے۔ جو اس کا فیصلہ ہو۔" خلاف معمول بڑی امی اس تجویز پہ خاموش ہو گئیں۔
"ٹھیک ہے، آپ کچھ مت کہیے گا، میں خود زمر سے بات کر لوں گی۔ اگر اس نے فارس کے لیے انکار کر دیا تو پھر آپ حماد کے لیے انکار نہیں کریں گے۔"
بڑے ابا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ البتہ وہ متفکر اور متذبذب تھے۔ کیوں، ان کی خود بھی نہیں سمجھ میں آرہا تھا۔



جو فرق صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے
وہ شام بہت سہانی اتر رہی تھی۔ اس کالونی میں درختوں کی ٹھنڈی چھایا تھی۔ زمر نے وسط کالونی میں کار روکی اور گردن موڑ کر حنین کو دیکھا۔
"تمہیں یقین ہے تم میرے ساتھ آنا چاہتی ہو؟"
آج زمر کے دو دن کا وقت تمام ہوا تھا اور وہ تیار تھی۔
"یا نیو!" وہ گردن اکڑا کر بولی۔ ماتھے پہ کٹے بال چھوڑ کر باقی فرنچ چوٹی میں بندھے تھے اور عینک کے پیچھے جھانکتی آنکھوں میں بلا کا اعتماد تھا اور مسکراہٹ بھی۔
"یہ لونگ اچھی لگ رہی ہے آپ پہ۔" ساتھ ہی اس نے جلدی سے جبڑا سیدھا کر لیا۔
زمر نے "تھینکس" کہہ کر ڈیش بورڈ سے پھولا خاکی لفافہ اٹھایا۔ کار بند کی اور باہر نکل آئی۔
گھنٹی بجا کر دونوں منتظر سی گیٹ پہ کھڑی تھیں۔ زمر حنین سے دراز قد تھی۔ گھنگریالے بال جوڑے میں بندھے اور سنجیدہ سے چہرے پہ وہ لونگ واقعی اچھی لگ رہی تھی۔ پرسکون، ٹھنڈے تاثرات، حنین البتہ پرجوش تھی۔
خراماں خراماں چلتے وہ صاحب گیٹ تک آئے۔
"جی؟"
"میں ڈسٹرکٹ کورٹ سے آئی ہوں زمر یوسف۔ مسز یاسمین سے ملنا ہے۔"
انہوں نے باہر جھانکا۔ "کس سلسلے میں؟"
"اگر آپ اگلے تین سیکنڈ میں مجھے عزت سے اندر نہ لے کر گئے تو میں یہ کورٹ آرڈر (خاکی لفافہ لہرایا) واپس جج کے پاس لے جاؤں گی اور کہوں گی کہ آپ نے کورٹ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ کل آپ کو جسٹس صدیقی کے پاس حاضر ہونا پڑے گا، توہین عدالت کے زمرے میں اور...... آپ دروازہ کھول رہے ہیں یا میں جاؤں؟"
صاحب کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ البتہ دروازہ انہوں نے پھر بھی قدرے تذبذب سے کھولا۔ اندر بیٹھک نما ڈرائنگ روم میں بیرونی دروازے سے لے آئے۔ انہوں نے پائیدان پہ جوتے اتارے تھے۔ اندر نرم قالین تھا۔ زمر نے پائیدان کو دیکھا اور پھر اپنے جوتوں سمیت چلتی اندر آئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر سنگل صوفے پہ بیٹھی۔ حنین بھی آنے لگی، پھر نگاہ ڈرائنگ روم کی دیوار پہ اعلا اکیڈمک شیلڈز پہ پڑی اس نے رک کر پائیدان پہ جوتے اتارے اور زمر کے قریب دوسرے صوفے پہ آٹکی۔
"میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔ مسز یاسمین کو بلائیے۔" زمر نے گھڑی دیکھتے ہوئے سپاٹ انداز میں صاحب کو مخاطب کیا۔ وہ فوراً "اندر چلے گئے۔ مسز یاسمین جلد ہی ان کے ہمراہ آئیں۔ زمر کو دیکھ کر کچھ الجھی ہوئی استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا اور بیٹھتے بیٹھتے حنین پہ نظر پڑی جو ان کی آمد پہ کھڑی ہو گئی تھی تو چونکیں۔ دوبارہ زمر کو دیکھا۔
"یہ میری بھتیجی ہے۔" وہ سرد آنکھوں کے ساتھ ان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ میڈم نے اب کے ذرا سنجیدگی سے حنین کو گھور کر دیکھا جو اب گھٹنے ملا کر بیٹھی تھی،

البتہ گردن ویسے ہی تنی ہوئی تھی۔

"آپ کس سلسلے میں....؟"

مگر زمر نے ان کو سوال پورا نہیں کرنے دیا۔ وہ صاحب واپس جارہے تھے'اس نے ان کو پکارا۔

"آپ کدھر جارہے ہیں محمود الرحمٰن جاوید صاحب! ساری بات آپ کے سامنے ہی ہوگی۔" وہ متذبذب سے واپس آبیٹھے۔ بیوی کو دیکھا۔ وہ مشتبہ نظروں سے زمر کو دیکھ رہی تھیں۔

"پاکستان پینل کوڈ پڑھا ہے کبھی آپ نے؟"

"جی؟"

"extortion ایک جرم ہے۔ آرٹیکل 384' تین سال قید یا پھر جرمانہ یا دونوں۔ بلیک میل کرنا بھی جرم ہے۔ آرٹیکل 387 'سات سال قید یا جرمانہ یا دونوں۔ اس وقت آپ یہ دونوں کررہی ہیں اور بالکل بھی مجھے درمیان میں مت ٹوکیے گا کیوں کہ میری بھتیجی کے ساتھ یہ دونوں جرائم کرنے پہ آپ پہ سزا واجب ہوئی ہے۔ آپ اس کو فورس کررہی ہیں کہ یہ آپ کی بیٹی کے لیے نوٹس بنائے ورنہ آپ اسے اسکول سے نکال دیں گی.... اوہ شاید آپ نے اپنے شوہر کو نہیں بتایا۔" محمود الرحمٰن صاحب اچنبھے سے باری باری دونوں کو دیکھتے۔

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔ آپ میرے ہی گھر میں آکر مجھ پہ ہی الزام کیسے لگاسکتی ہیں؟"

زمر نے خالی لفافہ اٹھایا۔ کاغذ نکالے' شڑپ سے سامنے رکھے۔

"محمود صاحب! آپ نے جی الیون میں ایک پلاٹ پر ناجائز قبضہ کررکھا ہے۔" مسز یاسمین جو ضبط طیش میں ابھی بہت کچھ بولنے کا ارادہ رکھتی تھیں' ایک دم سناٹے میں رہ گئیں۔ محمود صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"آپ کے خلاف فیصلہ آیا تھا اور آپ نے فیصلے پہ اسٹے آرڈر لے لیا تھا اور یہ جو دوسرے کاغذات ہیں' یہ میں کل عدالت میں جمع کرواؤں گی جس کے بعد آپ کا اسٹے آرڈر کینسل ہوجائے گا۔ آگے جو ہوگا وہ آپ جانتے ہیں۔"

"یہ بچی جھوٹ بول رہی ہے' میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ پھر سے عالم طیش میں آکر بولنے لگیں۔ محمود صاحب یکے بعد دیگرے کاغذات کو دیکھ رہے تھے اور رنگت اڑتی جارہی تھی۔

"کیا ثبوت ہے اس کے پاس کہ میں نے ایسا کہا ہے؟"

اپنے ہاتھوں کو دیکھتی حنین نے سر اٹھایا اور آئی فون کی سیاہ اسکرین ان کے سامنے کی۔

"میم.... اس دن کی ہماری اسٹاف روم کی گفتگو میں نے اس میں ریکارڈ کرلی تھی۔" بڑے ادب سے گزارش کی۔ میم کو ایک دم سانپ سونگھ گیا۔ بالکل چپ ہوگئیں۔

"آپ بالکل بھی نہیں چاہیں گی کہ ہم یہ گفتگو پرنسپل صاحبہ کو سنوائیں۔ رائٹ؟" زمر نے سادگی سے سوال کیا۔ وہ دونوں خاموش تھے۔

"چائے تو نہیں پلوائیں گے آپ؟" اگلا سوال مزید سادگی سے پوچھا۔

"دیکھیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ...." اگلے پانچ منٹ وہ ان کو ہاتھ اٹھاکر سمجھاتے رہے۔ معذرت' یقین دہانی۔ مسز یاسمین بالکل خاموش بیٹھی رہیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر' دروازہ بند کرکے زمر نے سوچتی نظروں سے حنین کو دیکھا جو سیٹ بیلٹ باندھ رہی تھی۔

"یہ فون تو تمہیں کاردار صاحب نے میم سے آخری گفتگو کے بعد نہیں دیا تھا؟"

حنین نے شرارت سے لب دبائے نظریں اٹھائیں۔

"پھپھو! میری بھی ایک سائیڈ ایسی ہے جسے آپ نہیں جانتیں۔"

وہ ہنس کر کار اسٹارٹ کرنے لگی۔

"ویسے آپ میری پرنسپل سے بھی تو بات کرسکتی تھیں' ہے نا؟" اسے ابھی خیال آیا۔

"میں نے مسئلہ حل کرنے کا وعدہ کیا تھا' مسز یاسمین کو تمہارا دشمن بنانے کا نہیں۔"

حنین کے لب "اوہ" میں گول ہوئے' پھر مسکرا دی۔ "تھینکس۔"

"تمہارے فارس ماموں کا آج شام تمہاری طرف آنا ہوگا؟ وہ عموماً" ویک اینڈز پہ آتے ہیں نا۔ مجھے ان سے کچھ بات کرنی تھی' اسی لیے سوچا' ملاقات ہوجائے تو اچھا ہے۔" حنین نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پرسکون سی ڈرائیو کررہی تھی۔

"وہ... شام میں آئیں گے' کہا تو تھا۔ آپ تھوڑا سا گھر چل کر ویٹ کرلیں گی نا۔"

"شیور!"

حنین سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ انگلیاں بھی مروڑتی رہی۔ پھر ذرا کی ذرا زمر کو دیکھا۔

"یہاں روک دیں' پودینہ لے لوں میں۔"

"پودینہ کیوں؟" وہ مارکیٹ کے قریب کار لے گئی۔

"جب چٹنی بناؤں گی تو امی کو لازمی پکوڑے بنانے پڑیں گے۔ سمجھا کریں نا۔"

وہ سبزی کی دکان کی طرف آئی اور ذرا اوٹ میں کھڑی ہوئی کہ دور پارکنگ میں موجود زمر اس کو نہ دیکھ پائے۔ جلدی سے موبائل پہ (جس میں امی کی سم تھی) کال ملائی۔

"ماموں! آپ اسی وقت ہمارے گھر آسکتے ہیں؟"

"نہیں۔" وہ مصروف تھا۔

حنین نے فون کان سے ہٹا کر اسے گھورا۔

"امی پکوڑے بنارہی ہیں۔"

"میں ڈائٹنگ پہ ہوں۔"

"افوہ! پھپھو آئی ہوئی ہیں' ان کو کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ آپ نے نہیں آنا تو نہ آئیں' میں کہہ دیتی ہوں کہ وہ آپ سے فون پہ ہی بات کرلیں۔" وہ جل کر بولی۔ امید تھی کہ اب وہ فوراً" ہامی بھرلے گا مگر...

"شیور۔ ان کے پاس میرا نمبر ہے۔ اب میں کام کرلوں؟"

"نہیں نہیں... ایک منٹ... رکیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔ "میں نے پھپھو سے کہا ہے کہ ان کا پیغام دے چکی ہوں اور آپ نے ہامی بھرلی ہے' اب مجھے جھوٹا ثابت کرنا ہے تو مرضی ہے۔ بائے۔" جلدی سے فون بند کردیا اور سبزی والے کو پیسے نکال کر دینے لگی۔



ہاں جرم وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطا کار سردار کھڑے ہیں

شہرین نے دروازہ کھٹکھٹایا پھر دھکیل دیا۔

شیرو کاؤچ پہ آڑا ترچھا لیٹا تھا۔ نگاہیں پھیر کر بگڑے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا جو چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ باب کٹ سنہرے بال چونچ کی طرح دونوں اطراف میں آگے کو آتے۔ آنکھوں میں ہمدردی تھی۔

"مجھے افسوس ہے' جو تمہارے ساتھ ہوا۔"

"بہت شکریہ۔" اس نے تلخی سے کہہ کر چہرہ پھیر لیا' پھر چونک کر واپس دیکھا۔ "بھائی کو تو نہیں پتا؟"

"میں بالکل بھی ان لوگوں میں سے نہیں ہوں' جو کسی کی پشت پہ اس کی شکایت لگاتے ہیں۔ مسز کاردار نے بتا دیا ہو تو وہ الگ بات ہے۔ ویسے..." وہ انگلیاں بالوں میں اوپر سے نیچے لاتے ہوئے سوچ کر کہنے لگی۔ "ان کو ایک دم سے کیسے پتا چل گیا کہ ڈرگز تمہارے کمرے میں ہی ہوں گی۔"

"تو... ممی کے لیے چہرے پڑھنا کیا مشکل ہے۔"

"تمہارا چہرہ تو آتے ساتھ ہی پڑھ چکی تھیں کئی دفعہ۔ میں تو یہ سوچ کر حیران ہوں کہ وہ ٹھیک بیٹھی تھیں اسٹڈی میں' پھر اچانک..." ذرا وقفہ دیا۔ "تمہارے دوست کے جاتے ہی ان کو کیا ہوگیا۔"

نوشیرواں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "سعدی کے جاتے ہی؟"

"ہاں' وہی تمہارا دوست۔ کافی دیر بیٹھا رہا ممی کے ساتھ۔ اچھی گپ شپ ہے اس کی تمہاری ممی سے۔ وہاں بھی اس کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ممی کا تو آنے کا پروگرام بھی نہیں تھا' یہ تو ہم شام کی چائے پی رہے

تھے' جب ممی کو کوئی میسج آیا' شاید اسی کا تھا تو انہوں نے فوراً" آنے کا پلان بنالیا۔ شاید کوئی ضروری بات ہوگی جس سے ممی کو مطلع کرنا ضروری ہوگا۔" بہت سمجھنے والے انداز میں سرہلاتی وہ واپس پلٹی' پھر ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھیں سکیڑ کر کافی ہمدردی سے۔ "شیرو! تمہیں نہیں لگتا کہ تمہیں اپنے جیسوں سے دوستی کرنی چاہیے۔ کہاں تم' کہاں وہ!" اور باہر چلی گئی۔

نوشیرواں الجھا الجھا سا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم اٹھا۔

شہرین نے کچن سے جھانک کر دیکھا' وہ ممی کے کمرے کی طرف جارہا تھا۔ وہ پرسکون سا مسکرادی۔ شیرو کے دوست کا داخلہ تو اس گھر میں بند ہوا کہ ہوا۔

نوشیرواں اندر آیا۔ جواہرات باتھ روم میں تھی' موبائل بیڈ سائیڈ پہ پڑا تھا۔ اس نے احتیاط سے باتھ روم کے دروازے کو دیکھتے موبائل اٹھایا اور پیغامات کھولے۔ سعدی کے نام سے اکا دکا پیغام تھے۔ وہ سر جھٹکتا فون رکھنے لگا پھر کسی خیال کے تحت رکا۔

باتھ روم کا دروازہ اب بھی بند تھا۔ وہ فون ہاتھ میں لیے چمکتی اسکرین پہ چند بٹن اور دبانے لگا۔ جی میل کھولی۔ جواہرات کی میلز سامنے تھیں۔ ذرا سا صفحہ اوپر کیا اور یہ رہا سعدی کی میلز کا تھریڈ۔ اوپر نیچے تمام گفتگو۔ گویا مکالمہ تھا۔

"شیرو کیا کررہا ہے آج کل' ڈرگز تو نہیں لے رہا؟ کس سے دوستی ہے' ڈرگز تو نہیں لے رہا؟ پڑھائی کیسی جارہی ہے اس کی' ڈرگز تو نہیں لے رہا؟"

جواہرات کے طویل سوال اور سعدی کے مختصر جواب۔ مگر جواب بہرحال جواب ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے پرانے پیغام کھلتے گئے' اس کا سارا خون سمٹ کر چہرے پہ آتا گیا۔ لب بھنچ گئے۔

وہ تولیے سے بال تھپتھپاتی باہر نکلی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ شیرو کا لال بھبھوکا چہرہ موبائل کی لائٹ میں دہک رہا تھا۔ وہ تولیہ پھینک کر قریب آئی' نرمی سے اسے پکارا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس نے شعلہ بار نگاہیں اٹھائیں' اسکرین سامنے لہرائی۔ جواہرات نے اسکرین کو نہیں دیکھا' وہ بے چینی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"وہ میری جاسوسی کرتا تھا آپ کے لیے؟"

"شیرو! تم دوبارہ ڈرگز نہیں لوگے' تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے شیرو کا بازو تھاما۔

"نہیں لوں گا' نہیں لوں گا' کتنی دفعہ بتاؤں؟ مگر اسے میں نہیں چھوڑوں گا۔" موبائل بیڈ پہ پھینکا اور بازو غصے سے چھڑاتا باہر نکل گیا۔

جواہرات نے فوراً" فون اٹھایا اور سعدی کا نمبر نکالا۔ کال بٹن پہ ہاتھ رکھا' پھر رک گئی۔ وہ ڈرگز نہیں لے گا' یہ تسلی تھی تو دوستوں کے آپس کے معاملے میں اسے پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ اونہوں۔

شانے ذرا اچکا کر اس نے فون پرے ڈال دیا اور تولیہ اٹھالیا۔



اب نہ وہ میں ہوں' نہ تو ہے' نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں

گرماگرم پکوڑے کی مہک سارے میں پھیلی تھی۔ زمر اپنے مخصوص صوفے پہ بیٹھی تھی' سیم اس کے پیروں کے قریب کارپٹ پہ بلاکس جوڑتوڑ رہا تھا۔ حنین کافی پرجوش سی برتن لگارہی تھی' زمر کو دیکھتی تو شرما کر مسکرادیتی۔ وہ بھی مسکرادیتی۔

فارس ابھی ابھی آیا تھا اور سوائے سلام کے کچھ نہیں بولا تھا۔ سلام میں بھی وقفہ دیا کہ زمر کی لونگ دیکھ کر وہ ذرا سا رکا تھا' پھر ریموٹ اٹھا کر چینل بدلنے لگا۔ آفس سے آیا تھا' کوٹ ٹائی سب ہٹ تھا۔

"یہ... اچھی لگ رہی ہے۔" ندرت کچن سے ادھر آئیں تو صوفے سے کچھ اٹھاتے ہوئے زمر کی بدلی ہوئی لونگ دیکھی۔ حنین نے ذرا بلند آواز میں تبصرہ کرتے پلیٹیں لگائیں۔

"یہ پھپھو کو ان "کی" کسی پرانی اسٹوڈنٹ نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گفٹ کی ہے۔ ساتھ میں ایک نوٹ بھی تھا' میں نے بھی پڑھا وہ نوٹ۔ ویسے۔۔۔ پھپھو! آپ نے اس کی لکھائی نہیں پہچانی؟ ماموں لیں نا۔" ساتھ ہی ماموں کو پلیٹ پکڑائی۔ اس نے بنا کسی تاثر کے سنجیدگی سے پلیٹ لے کر سائیڈ پہ رکھ دی۔ پکوڑے ابھی کڑاہی میں تھے۔

"نہیں' اتنا پیپر ورک ہوتا ہے' پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔" زمر سادگی سے ندرت کو قدرے آہستہ آواز میں بتا رہی تھی۔ ندرت دوبارہ کچن میں آئیں تو حنین ساتھ چلی آئی اور کچن کا لاؤنج میں کھلتا دروازہ بند کردیا۔ کڑاہی میں پکوڑا ڈالتی ندرت نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"دروازہ کیوں بند کیا؟"

(تاکہ ہیرو ہیروئن سے اپنے پروپوزل پہ تبادلہ خیال کرلے اور آپ درمیان میں انٹری نہ دیں۔)

"دھواں لاؤنج میں جارہا تھا۔" ایگزاسٹ چلا کر آستین موڑتی وہ چٹنی بنانے کھڑی ہوگئی۔

"آج تم اس موئے کمپیوٹر اور علیشا کو چھوڑ کر کچن میں گھسی ہو' حیرت ہے۔" امی کی شکایت کو نظر انداز کرکے وہ سر جھکائے مسکراتے ہوئے چٹنی کوٹنے لگی۔

لاؤنج میں ٹی وی کا شور تھا یا سیم کی خود سے کی جانے والی باتیں۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی فارس!" قدرے تذبذب سے اس نے آغاز کیا۔ ریموٹ رکھ کر رخ اس کی طرف کیا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"ایک کیس کے سلسلے میں۔"

وہ ذرا چونکا۔ اس نے سمجھا تھا شاید۔۔۔ اونہوں۔ یہ کوئی اور معاملہ تھا۔

"آپ کو تو پتا ہے' بعض دفعہ ایک وکیل استغاثہ میں ہوتا ہے اور جج ایسا فیصلہ سنا دیتا ہے جو دوسرے فریق کے لیے خوش گوار نہیں ہوتا۔" رک رک کر الفاظ ادا کیے۔ فارس نے سرہلا کر ساری بات ڈی کوڈ کی۔

"یعنی آپ کی وجہ سے کسی کو سزا ہوجاتی ہے۔ ہوں' پھر؟"

وہ ذرا دیر کو چپ ہوئی۔ "میرے ایک کیس کا فیصلہ اسی طرح ہوا تھا۔ مجرم کا بھائی اس سے خوش نہیں تھا اور وہ اس کا اظہار بھی کرچکا ہے۔"

"یعنی اس نے آپ کو دھمکیاں وغیرہ دی ہیں۔ ہوں' آگے؟"

"آ۔۔۔ جی۔۔۔ آپ جانتے ہیں' ہمارے خاندان میں۔۔۔"

"آپ معاملہ گھر تک نہیں لے جانا چاہتیں' باہر ہی باہر حل کرنا چاہتی ہیں۔" اس دفعہ فقرہ ہی نہیں پورا ہونے دیا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"میں چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ میں۔۔۔" وہ رک گئی۔ بات لپیٹ کر کرنے کا فائدہ نہ تھا۔ وہ شخص اسکول کی ٹیچر نہیں تھا جسے وہ پر اعتماد دھونس سے پیچھا چھڑا سکتی تھی۔

"اگر میں آپ کے ڈیپارٹمنٹ میں اس کی شکایت درج کرواؤں' تو اس شخص کی ہراس منٹ روکنے کا طریقہ کار کیا ہوگا؟"

"کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ پیچھے ہو کر بیٹھا' کان کی لو رگڑتے ہوئے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "میں ڈائریکٹر سے بات کرلوں گا' ہماری وین اسے پک کرلے گی' دو چار ہاتھ لگیں گے تو دماغ درست ہوجائے گا اس کا۔"

زمر کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔ فوراً" نفی میں سرہلایا۔

"نہیں پلیز میں تشدد پہ یقین نہیں رکھتی۔ یہ مسئلہ بات چیت سے حل ہوسکتا ہے' سب کے اندر اچھائی کا عنصر ہوتا ہے' ہمیں صرف اسے باہر لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"آپ دو گھنٹے کے لیے اسے میرے لڑکوں کے حوالے کردیں' ساری اندر کی اچھائی باہر آجائے گی۔" پھر اس کے تاثرات دیکھ کر ٹھہر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ

اسے یہ ذکر ہی بھول جانے کا کہہ دیتی' وہ قدرے نرمی سے بولا۔

"ٹھیک ہے' بات کر لیتے ہیں پھر۔ میں مل لوں گا اس سے' مرد کا بات کرنا اور ہوتا ہے۔"

"او کے!" اس نے سر ہلایا ذرا تسلی ہوئی۔ "وہ آدمی آج کل کورٹ آتا ہے روز' اپیل کے چکر میں۔ اگر آپ صبح آجائیں تو میں دکھا دوں گی۔"

"شیور۔" قدرے ٹھہر کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "کوئی اور مسئلہ؟"

"نہیں' بس یہی تھا۔ تھینکس۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ فارس نے گھڑی دیکھی اور آواز دی۔

"حنین! لارہی ہو یا میں جاؤں۔"

"نہیں لارہی' آپ جائیں۔" وہ ڈش اٹھا کر آتی ہوئی بڑے موڈ میں بولی۔ آج وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔



خالی ہاتھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
کس طرح لوگ لکیروں سے نکل جاتے ہیں

پکوڑے ختم ہوگئے۔ زمر چلی گئی۔ امی نماز پڑھنے کمرے میں گئیں تو فارس ان کے پاس چلا گیا۔ اب حنین تھی اور آن لائن ہوئی علیشا۔

"میرا مسئلہ حل ہوگیا۔" اس نے چہکتے ہوئے اطلاع دی۔ علیشا عادتاً" ہنسی۔

"ہمت کی یا زیادہ ہمت والا ڈھونڈا؟"

"زیادہ ہمت والی کو ڈھونڈ کر کچھ ہمت کرلی۔" پھر خیال آنے پہ سیل فون اٹھا کر دکھایا۔

"یہ دیکھو... مجھے گفٹ ملا۔"

"واؤ۔ برانڈ نیو؟" وہ بھی پرجوش سی آگے ہو کر دیکھنے لگی۔

"ہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ ایک امیر سے انکل ہیں ہمارے احباب میں۔" وہ کالر جھاڑ کر بولی۔

"واقعی اور وہ کون ہیں؟"

"میرے انکل کے انکل۔ یہ پیچیدہ رشتے داریاں تم نہیں سمجھو گی۔ اچھا مجھے ایک بات بتاؤ' تم نے اس جیولز والی گیم میں..." لینڈ لائن فون کی گھنٹی پہ وہ بد مزا ہوئی۔ آگے بڑھ کر نمبر دیکھا۔ بڑے ابا کے گھر سے تھا۔ دوسری گھنٹی پہ فون خاموش ہوگیا۔ امی نے اندر سے اٹھا لیا ہوگا۔ وہ مطمئن سی ہو کر بات کرنے لگی' پھر ایک دم رکی۔ جلدی سے علیشا کو بائے کہا اور آہستہ سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

حسب توقع بڑی امی ہی تھیں۔ وہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ سننے لگی۔

"میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا' زمر نہیں مانے گی۔ اس نے تو صاف انکار کر دیا ہے۔"

"مگر... میں خود بات کر کے دیکھوں' شاید..." ندرت کو اب بھی آس تھی۔

"بھئی۔ جب اس نے انکار کر دیا تو کیا گنجائش رہ گئی۔ دیکھو برا نہ ماننا' مگر وہ اسے جانتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مزاج کا بہت سخت اور غصے والا ہے وائلڈ سا۔ اس کے ساتھ کیسے گزارہ کرے گی وہ؟"

حنین نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ بارہ بج گئے تھے اور سنڈریلا کی سواری جس پہ وہ اڑتی جارہی تھی' بدصورت کدو میں بدل کر زمین بوس ہوئی تھی۔ وہ بے دم سی ہو کر وہیں بیٹھی رہی۔

ندرت کو عموماً" ایکسٹینشن سے دوسرا فون اٹھائے جانے کا پتا چل جاتا تھا کہ آواز ہلکی ہو جاتی' مگر آج نہیں چل سکا۔ انہوں نے بے بسی سے سامنے بیٹھے فارس کو دیکھا جو بغور ان کے تاثرات پڑھ رہا تھا اور ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔

"انکار کر دیا؟"

"میں زمر سے خود بات کروں گی' وہ اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتی' وہ..."

"کس طرح کی بات؟ کہہ دیں' میں برا نہیں مانوں گا۔"

"یہی' غصہ اور مزاج کی سختی' مگر تم اس بات کو اتنا کا مسئلہ نہ بنانا' مجھے ایک دفعہ مزید..."

"نہیں' کوئی ضرورت نہیں۔ انکار ہوگیا' بات

ختم۔"

"فارس! صرف ایک دفعہ مجھے۔۔۔" وہ نفی میں سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپا' بندہ عزت سے رشتہ مانگتا ہے اور عزت سے نہ ملے تو قصہ تمام۔ میں دس سال کا تھا جب میرا باپ فوت ہوا تھا۔ عمر گزر چکی ہے رشتہ داروں کی سیاستیں دیکھتے دیکھتے۔ یہ سوتیلے کا لفظ تب آکر ختم ہوا' جب ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنا شروع کیا' شاید دس بارہ سال پہلے' ورنہ اس سے قبل وارث ہو' آپ ہوں یا آپ لوگوں کے رشتے دار' میں سب کے لیے دوسری بیوی سے ہونے والا سوتیلا بیٹا ہی تھا اور آپ میں سے کوئی مجھے پسند نہیں کرتا تھا۔ میں یہ سب' آپ کا دل دکھانے کو نہیں کہہ رہا' ان باتوں کی اب کوئی اہمیت نہیں۔ بس اتنا بتانا ہے کہ میں آپ کے رشتے داروں میں اگر شادی کرتا تو عزت سے کرتا' ورنہ نہیں اس لیے اب دوبارہ ان سے بات مت کیجئے گا۔"

ندرت نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ اس کو سمجھ سکتی تھیں۔



ستم گر تم سے امید کرم ہوگی' جنہیں ہوگی ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

اے سی کی ہوا نے آفس میں خنک سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ زمر نے بات کا آغاز کرنے سے پہلے تمام فائلز اوپر تلے کر کے ایک طرف رکھیں' پھر کرسی پہ پیچھے ہو کر بیٹھی اور گہری سانس لے کر میز کی دوسری جانب موجود اس ہینڈسم آدمی کو دیکھا جو ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا تھا' گردن ذرا جھکائے' ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ کچھ ٹائپ کرتا جیل لگے بال پیچھے کو سیٹ کیے۔ تنے ابرو۔ سعدی نے جو اس کا ذکر کر کے تاثر دیا تھا' وہ کسی بہت خوش اخلاق اور عاجز آدمی کا تھا۔ یہ آدمی اس سے مختلف لگا تھا زمر کو۔

"تو آپ سعدی کی پھپھو ہیں؟" بنا جذبات' سرد سپاٹ سا پوچھا۔ ابھی تک ٹائپ کر رہا تھا۔

"جی کاردار صاحب۔" اس نے سر کو ہلکا سا خم دیا۔ "اس لحاظ سے میں یہ سمجھتی ہوں کہ آپ کچھ پروفیشنل کرٹسی کا مظاہرہ کریں گے۔"

"آپ کے کلائنٹ نے میرے ڈرائیور کو لوٹنے کی کوشش کی' پھر اسے گولی مار دی۔۔۔"

"گولی چل گئی!" اس نے ضبط سے تصحیح کی۔

"اور پھر اس نے پولیس کے سامنے اعتراف بھی کر لیا۔"

"جی' جب اس نے خود پولیس کو بلایا تاکہ وہ زخمی ڈرائیور کو اسپتال لے جاسکیں' تب اس نے اعتراف کر لیا۔"

"آپ ایک چور اور قاتل کی حمایت کر رہی ہیں؟" ہنوز گردن جھکائے تیز تیز ٹائپ کر رہا تھا۔

"میں اپنے کلائنٹ کی حمایت کر رہی ہوں۔" ذرا دیر کو رکی۔ "کیا ہم اس معاملے کو سیٹل کر سکتے ہیں؟"

"ایک دفعہ غور سے مجھے دیکھیں اور بتائیں' کیا مجھے آپ کی دیت چاہیے ہوگی؟"

زمر نے سر سے پاؤں تک اس کو دیکھا۔ ہزاروں روپے کا ہیر کٹ' ڈھائی تین لاکھ کا سوٹ' اتنے ہی مالیت کے جوتے' اوہ اور یہ گھڑی۔

"پروفیشنل کرٹسی' کاردار صاحب!" اس نے یاد دلایا۔ ہاشم نے موبائل رکھا اور نظر اٹھا کر بے تاثر آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"بی بی! میں آپ کو ایک فیور دوں گا' آپ اپنے کلائنٹ کو کٹہرے میں لے آئیں۔"

"کبھی بھی نہیں۔"

"آپ اس کو کٹہرے میں لا کر جج کے سامنے testify کرنے دیں' مجھے اس کی دیت نہیں چاہیے' مجھے اس کی شرمندگی چاہیے۔ آپ ایسا کر دیں' میں کم سے کم سزا کا مطالبہ کروں گا۔"

وہ چند لمحے پر سوچ نظروں سے اسے دیکھتی رہی' وہ سنجیدہ تھا۔

"کتنے سال؟" ہاشم کے سنائے گئے سال اسے قبول تھے۔

"اوکے!" اس نے ہامی بھرلی۔ وہ اٹھا' کوٹ کا بٹن بند کیا' ہلکا سا مسکرایا' سر کو خم دیا اور باہر نکل گیا۔

اس نے موبائل چیک کیا۔ فارس کی کوئی کال' کوئی پیغام نہ تھا۔ وہ قدرے متذبذب سی بیٹھی رہی۔ پھر اسے فون کیا۔

"آپ نے کہا تھا کہ آپ صبح آئیں گے۔ میں انتظار کررہی تھی۔"

وہ ایک لمحے کو بالکل خاموش ہوگیا۔ "میں آرہا تھا۔" زمر کو تسلی ہوئی۔ اس آدمی کو ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اس نے کاریڈور کے دوسرے سرے پہ واقع ایڈووکیٹ مشہود کے چیمبرز میں گم ہوتے دیکھا تھا۔ روز ہی وہ آتا' ہر دفعہ اسے گزرتے گزرتے کوئی سخت بات کہہ جاتا' کوئی معنی خیز اشارہ۔ اف' وہ تنگ آگئی تھی۔

باہر جانے کے لیے دروازہ کھولا تو اسی وقت فارس نے اسے کھولنے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کا ہاتھ ہوا میں رہ گیا' پھر اس نے پیچھے کرلیا۔ ایک پرسوچ نظر زمر پہ ڈالی۔ اس کے چہرے پہ اسے آتے دیکھ کر اطمینان آیا تھا' لونگ مزید دمکنے لگی۔

"رانا صاحب میرا انتظار کررہے ہوں گے مجھے دیر ہوجائے گی' آپ خود اس سے بات کرلیں گے نا؟" وہ تسلی کرنا چاہ رہی تھی۔ وکلا کے چیمبرز کے آگے یہ راہداری تھی' بالکونی نما' جس کے دوسری طرف سے نیچے موجود مارکیٹ' گاڑیوں کا شور' نانبائی کا ٹھیلا' سب نظر آتا تھا۔ وہ دونوں وہیں کھڑے تھے۔

"ہوں۔ کدھر ہے وہ؟" جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے فارس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ آج وہ جینز پہ راؤنڈ نیک والی شرٹ میں ملبوس تھا جس کی آستین کلائی سے بالشت بھر پیچھے تک آتی تھی۔ وہ اپنے کزن سے بہت مختلف تھا۔

"یہ ارشد فیاض مونچھوں والا۔" زمر نے ابرو سے اشارہ کیا۔ وہ شخص اب چیمبر سے نکل رہا تھا' فارس نے چند لمحے غور سے اسے دیکھا' پھر بہت سکون سے زمر کی طرف گھوما۔

"آپ جائیں۔ میں نرمی سے سمجھادوں گا' وہ صبح آکر آپ سے معافی مانگے گا۔"

اس کی آنکھوں میں حیرت اتری' پھر فکرمندی۔ "مگر۔۔۔ فارس آپ اسے۔۔۔"

"ڈونٹ وری' میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔" ہاتھ جیبوں سے نکال کر اٹھادیے۔ وہ ذرا مسکرا کر سر ہلاتی آگے بڑھ گئی۔ فارس وہیں کھڑا رہا' جب تک کہ وہ چلی نہ گئی۔ پھر وہ ارشد نامی اس شخص کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ دو پلازوں کے درمیان رش سے بھری جگہ میں آگے بڑھتا جارہا تھا۔ فارس فاصلہ رکھ کر اس کے عقب میں تھا۔ جب سڑک قریب آنے لگی تو وہ اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے' منہ میں کچھ چباتا' تیز چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے سر پہ پہنچ گیا۔

"کیا حال ہیں ارشد صاحب! گھر میں سب ٹھیک ہے؟"

ارشد نے چونک کر گردن موڑی۔ وہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

"کون؟"

"مجھے پہچان جاؤ گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ آؤ' اس طرف۔" سڑک کنارے کھڑی وین کی طرف اشارہ کیا۔ ارشد نے بگڑے تیور سے اسے دیکھا۔

"او کون ہو تم؟"

"آرام سے بھائی صاحب۔ اس طرف آیئے' آپ سے کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔" وہ وین کے قریب تھے۔ ارشد نے وہیں سے گزر کر آگے جانا تھا اور وہ ابھی کچھ سخت کہنے کو منہ کھول ہی رہا تھا کہ وین کا دروازہ سلائیڈ ہو کر کھلا' دو نوجوان باہر نکلے' ایک نے قریب آکر اس کے کندھے پر بڑے جوش سے "السلام علیکم" کہتے ہاتھ رکھا۔ سرنج ہاتھ میں ہی تھی۔ سوئی اندر گئی۔ ارشد جو اس افتاد پہ غصے میں اگلے کو ہٹانے لگا تھا' بالکل ساکت ہوتا گیا' دونوں نے بازوؤں سے پکڑ کر اس بے جان ہوتے وجود کو وین میں ڈالا۔ دروازہ بند کیا سب کچھ اتنی پھرتی سے ہوا کہ آس پاس کسی نے نوٹس نہیں لیا۔

فارس گھوم کر فرنٹ سیٹ پہ آبیٹھا اور جھک کر ایک خانہ کھولا۔

"غازی' چلیں؟" ڈرائیور نوجوان نے پوچھا۔

"ہوں!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے دیکھا۔ وہ اس خانے سے دستانے نکال رہا تھا۔

"یہ کیوں؟"

فارس نے چیونگم چباتے پتلا سا وہ دستانہ ہاتھ پہ چڑھایا اور پیچھے کو کھینچا۔

"زبان کا پکا ہوں۔ وعدہ کیا تھا' اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔" اب وہ دوسرا دستانہ پہن رہا تھا' ڈرائیور نوجوان نے ہنس کر سر جھٹکا اور اسٹیئرنگ گھمانے لگا۔

قریباً" چار گھنٹے بعد ایک نسبتاً" سنسان سڑک پہ وہی وین رکی' دروازہ سلائیڈ ہو کر کھلا' ارشد کو نیچے اتارا گیا۔ اس کے چہرے پہ کسی چوٹ کا نشان نہ تھا البتہ وہ سفید' نقاہت زدہ سا تھا۔

فارس نے اترے بغیر' ذرا جھک کر اس کا کالر پکڑا' اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چبا چبا کر بولا۔

"تمہارا چہرہ اس لیے چھوڑا ہے تاکہ جس کو تم اذیت دے رہے تھے' اسے علم نہ ہو سکے۔ صبح جا کر تم اس سے معافی مانگو گے' اور دوبارہ اس کو شکل مت دکھانا اپنی۔ اور ہاں' اگر ہمارے ڈرائنگ روم کی سیر کا سفرنامہ اسے بتایا یا دوبارہ اس کو ہراس کرنے کی کوشش کی' تو طالبان کا ٹھپہ لگا دوں گا تمہارے اوپر' امریکی اگلی فلائٹ سے لے جائیں گے' اور ساری عمر تمہارا خاندان تمہاری شکل کو ترسے گا۔ بات آئی ہے کھوپڑی میں یا نہیں۔" کالر کو جھٹکے سے چھوڑا۔

ارشد نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گہرے سانس لیے' سر بار بار اثبات میں ہلایا۔ ابھی وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ فارس نے ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی' پیچھے ہوا' دروازہ زور سے بند کیا اور وین زن سے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

کوئی آج تک نہ سمجھ سکا یہ اصول گلشن زیست کا
وہی پھول نذر خزاں ہوا جسے اعتبار بہار تھا

آج بھی دروازہ میری نے کھولا' وہ مسکرائی بھی' مگر پھر بھی' نوشیرواں کے گھر میں عجیب فضا چھائی تھی' یا شاید سعدی کو ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ بہر حال' اس نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا' اور اندر آیا۔ مسز کاردار کا پوچھا۔ وہ گھر پہ نہیں تھیں۔ چلو اچھا ہے' اس کا کل ایگزام تھا' شیرو نے جس بھی کام کے لیے بلایا ہے وہ نپٹا کر وہ جلدی سے واپس پہنچنے کی کرے گا۔

شیرو کے کمرے کا دروازہ کھولنے سے قبل اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ شہرین شاہانہ انداز میں لونگ روم میں صوفے پہ آتش دان کے قریب بیٹھی تھی۔ سنہری لٹ انگلی پہ لپیٹتی' وہ مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ فضا میں گھات لگائے جانے کا احساس بڑھ گیا۔

سعدی نے دروازہ کھولا۔ نوشیرواں کرسی پر بیٹھا تھا سر اٹھا کر دیکھا۔ آنکھیں گلابی تھیں۔ ڈر گزر سے نہیں غصے سے۔

"خیریت؟ تم نے اتنی جلدی میں بلایا؟" سعدی نے سرسری سا پوچھا۔ وہ کھڑا ہوا۔ کڑے تیوروں سے اسے گھورتا سامنے آیا۔

"کب سے جاسوسی کر رہے ہو میری؟" سعدی نے گہری سانس باہر کو خارج کی۔

"اگر تمہارا اشارہ میرے......"

"بکواس مت کرو۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بلایا کہ تمہاری سنوں۔"

"ہاں' تم نے مجھے اس لیے بلایا ہے تاکہ مجھے بے عزت کر کے گھر سے نکال سکو!"

"تم ہوتے کون ہو میری ماں کے لیے میری جاسوسی کرنے والے؟ تم ہو کون جو ان کو میرے ڈر گز لینے کے بارے میں بتاتے ہو؟" غصے سے اس کے چہرے کے نقش بگڑ گئے۔

"میں تمہارا دوست ہوتا ہوں۔"

"تم نے مجھے میری ماں کی نظروں سے گرانا چاہا' تم نے......"

"اگر گرانا ہوتا تو میں ان کو تمہارے چالان کے

بارے میں بھی بتاتا جو گاڑی غلط ڈرائیو کرنے پہ ہوا تھا۔ میں ان کو تمہارے اس لڑکی کے منگیتر سے مار کھانے کا بھی بتاتا جس کو تم مسلسل کالز کررہے تھے۔ اور بھی بہت کچھ بتاسکتا تھا' مگر میں نے تمہارا بھلا چاہا۔"

"اوہ شٹ اپ۔" وہ غصے سے چلایا۔ "تم مت چاہو میرا بھلا۔ جو تمہارا احسان تھا میرے اوپر' آج وہ بھی ختم ہوا۔ آئندہ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کروں گا۔"

"میں جارہا ہوں تو شیرواں' کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ہم ایک دوسرے کو ایسی باتیں کہہ دیں جن پہ ہمیں پچھتانا پڑے۔" وہ مزید بے عزت نہیں ہوسکتا تھا' شیرو کو چیختا چلاتا چھوڑ کر دروازہ بند کرتا باہر نکلا' پھر ٹھٹک کر رکا۔

شہرین اسی تمکنت سے بیٹھی اس کو دیکھ رہی تھی۔

"تم اس دن میرے برادران لاء سے پوچھ رہے تھے کہ میں کیسی عورت ہوں۔ اب پتا چل گیا' میں کیسی عورت ہوں؟" ہاتھ بالوں میں اوپر سے نیچے لے جاتے معصومیت سے پوچھا۔

سعدی تلخی سے مسکرایا' نفی میں گردن ہلائی' سامنے آیا' اور اس کے مقابل پڑی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے' رکا۔

"میں نے یہ سوال اس لیے نہیں پوچھا تھا کہ میں نے آپ کو پورچ میں ایسی باتیں کرتے سنا تھا جن کے کھلنے کا آپ کو ڈر تھا' میں نے یہ سوال اس لیے پوچھا تھا کیونکہ میں نے آپ کو اسٹڈی کی کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر اپنی اور مسز کاردار کی وہ باتیں سنتے دیکھا تھا جن کے کھلنے کا مجھے کوئی ڈر نہیں تھا۔" چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔ شہرین کی مسکراہٹ غائب ہوئی گردن میں ابھر کر معدوم ہوتی گلٹی دکھائی دی۔

"دوستی میری نزدیک ایک ہی چیز ہے۔ وفاداری اور صرف غیر مشروط وفاداری' مسز ہاشم کاردار! وہ دوبارہ ڈرگز لے گا' میں دوبارہ اس کی ماں کو بتاؤں گا' کیونکہ میری آپ کے خاندان میں آمدورفت کی وجہ صرف شیرو سے دوستی نہیں ہے یقیناً" اب آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں کیسا دوست ہوں!" وہ کہہ کر مڑ گیا۔ شہرین تلملا کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔

"ایڈیٹ۔"



ہاشم ایک ہاتھ میں بریف کیس تھامے' دوسرے میں موبائل پہ کچھ ٹائپ کرتا راہداری میں چلتا جارہا تھا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ' بپھری ہوئی سی تیز تیز پیچھے آئی۔ دائیں طرف سے نکل کر' گھوم کر سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ رکا۔ نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ کیا کیا آپ نے؟" زمر دبا دبا سا غرائی تھی۔ اس کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔

"کیا کیا میں نے؟" اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کم سے کم سزا کا مطالبہ کریں گے' اور ابھی آپ نے سزائے موت کا مطالبہ کردیا؟"

"میں نے وعدہ کیا تھا؟ کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟ کوئی کاغذ' کوئی دستخط؟" زمر کے اندر جوار بھاٹا پکنے لگا۔ بمشکل ضبط کرکے نفرت سے اس کو دیکھا۔

"آپ نے مجھے زبان دی تھی۔"

"نہیں' میں نے آپ کو سبق دیا تھا۔ کہ کبھی استغاثہ کے ساتھ بغیر تحریری کاغذ کے ڈیل نہیں کیا کرتے۔" وہ پرسکون تھا' دوبارہ سے فون پہ ٹائپ کرنے لگا۔

"میں۔ میں آپ کے کہنے پہ...... میں اس کو کٹہرے میں لے آئی اور آپ نے کیا کیا میرے ساتھ؟ آپ کو اندازہ ہے یہ کیس راناصاحب کے لیے کتنا اہم تھا؟ ان کی ریپوٹیشن کا سوال تھا۔"

"اور شاید آپ کی ملازمت کا بھی۔ اس بے وقوفی کے بعد آپ یقیناً" ان کے چیمبر میں دوبارہ داخل ہونے کی ہمت نہیں کریں گی۔ اگر جاب recommendation کا خط چاہیے ہو تو میں

لکھنے کو تیار ہوں۔" وہ محظوظ ہوا تھا۔
زمر نے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا۔
"میں سمجھی تھی' آپ سعدی کے رشتہ دار ہیں۔ تو...."
"میں جب صبح سات بجے گھر سے نکلتا ہوں تو ساری رشتے داریاں پیچھے چھوڑ کر آتا ہوں۔ بزنس از بزنس۔ اس کا فون بجنے لگا۔ وہ کان سے لگاتا' ہیلو کہتا' آگے بڑھ گیا۔ زمر وہیں کھڑی رہ گئی۔ ہاشم نے دور جاتے ہوئے' فون کان سے ہٹا کر' مڑ کر اسے دیکھا' اور ذرا بلند آواز دی۔
"اگلی دفعہ میرے ساتھ ڈیل کرتے وقت اپنا دماغ حاضر رکھیے گا۔" اور پلٹ گیا۔ وہ بے بسی بھرے غصے میں کھولتی مخالف سمت میں آگے بڑھ گئی۔ وہ کسی کے سامنے نہیں رویا کرتی تھی' سوائے سعدی کے۔ البتہ اس وقت دل کر رہا تھا کہ بھری کچہری میں زمین پہ بیٹھ کر رونا شروع کردے۔
فارس ادھر آیا تو وہ باہر سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ بظاہر لگتا وہ کسی کی منتظر ہے' مگر اس کا چہرہ.... زرد' یاسیت بھرا سا تھا۔ وہ آخری سیڑھی کے سامنے کھڑا' گردن ترچھی کر کے اسے دیکھنے لگا۔
"میں گزر رہا تھا تو.... آپ ٹھیک ہیں؟"
زمر نے نگاہیں اٹھائیں' پھر دھوپ کے باعث پلکیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ آس پاس ابھی بھی خاصا رش تھا۔
"کیا وہ صبح آیا تھا؟" ذرا احتیاط سے پوچھا۔ وہ پھیکا سا مسکرا دی۔
"جی' آپ نے اسے کیسے سمجھایا' وہ بہت دھیما ہو گیا تھا۔ معافی بھی مانگی' اور یہ بھی کہا کہ واپس دبئی جا رہا ہے' دوبارہ ہراساں نہیں کرے گا۔" وہ ابھی تک اس کا یا پلٹ پہ حیران تھی۔
"اور بھی کچھ کہا؟" وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔
"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سب کا شکریہ فارس!" پھیکی مسکراہٹ بالکل غائب ہو گئی۔

بجھا بجھا سا چہرہ جھک گیا۔
"کوئی اور مسئلہ ہے؟"
"میری جاب چلی گئی۔ چھوڑنی تو ویسے بھی تھی' کہیں اور اپلائی کر رکھا تھا' مگر اس طرح چھوڑنے کا نہیں سوچا تھا۔" نہ اس نے ہاشم کا ذکر کیا' نہ فارس نے وجہ پوچھی۔ دونوں کو یہی مناسب لگا۔
"کیا آپ کی امی نے آپ سے میرا ذکر کیا تھا پچھلے ہفتے؟" ذرا ٹھہر کر بولا۔ زمر نے چونک کر اسے دیکھا پھر ناسمجھی سے نفی میں گردن ہلائی۔
"نہیں.... کیوں؟" اور فارس بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔
"یونہی۔ آپ کے ابو سے ملنا تھا تو۔ میرا خیال ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتیں' خیر جانے دیں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔" فارس نے اس بات کو جانے دیا' اور زمر نے اسے۔ وہ مڑ گیا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے' سر جھکائے' دور ہوتا گیا۔ وہ نیچے سر جھکائے' خالی خالی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔



ایک نگاہ بے فیلی' ایک بول پتھر سا
آدمی نہیں مرتا' صرف خون بہنے سے

کھانے کی میز پہ روٹی کا ڈبہ' ڈونگے' سلاد' سب حسب معمول سجا تھا' اور وہ لقمہ توڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"میں یقین نہیں کر سکتی ابا کہ سعدی جس آدمی کی اتنی تعریفیں کرتا تھا' وہ اتنی چھوٹی حرکت کر سکتا ہے۔" لقمہ چبا کر گلاس لبوں سے لگایا' پھر باری باری دونوں کو دیکھا۔ "میں نے سعدی کو بھی فون کر کے کہہ دیا' دوبارہ اپنے ہاشم بھائی کا ذکر بھی مت کرنا میرے سامنے۔"
"اس نے کیا کہا آگے سے؟" بڑے ابا سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔
"وہ تو خود حیران تھا مگر اسے لگا کہ یہ کوئی غلط فہمی ہے' میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا' اس کا دل کیوں

خراب کروں اپنے ہاشم بھائی کے لیے۔"

فرحانہ نے گہری سانس لے کر سلاد کی پلیٹ اٹھائی۔

"فارس کا کزن جو ہوا۔"

بڑے ابا نے ایک ملامتی نظر ان پہ ڈالی' اور ایسی ہی دوسری نظر زمر پہ اور سر جھٹک کر کھانے لگے۔ زمر نوالہ سالن میں ڈبو رہی تھی' نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں امی' فارس تو بہت اچھا ہے۔ بہت ڈیسنٹ اور مینوڈ۔ ہمیشہ ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کا' کبھی آپ کو نقصان پہنچانے والی حرکت نہیں کرے گا۔"

بڑے ابا کا نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ چونک کر زمر کو دیکھا' پھر فرحانہ کو۔ ان کی رنگت ذرا پھیکی پڑی' فوراً ڈبہ کھول کر روٹیاں گننے لگیں۔

"یہ پوری ہو جائیں گی' یا مزید بنا دوں؟"

"یو نو واٹ ابا۔" زمر کا ہاشم پہ غصہ کم ہو چکا تھا' اور اسے فارس اور اس کا فرق واضح نظر آ رہا تھا۔ "صرف اس لیے کہ میں فارس کی ٹیچر رہی ہوں' اس نے پچھلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں مجھے دو تین فیورز اکھٹے دیے' اور ایک دفعہ بھی نہیں جتایا۔ یہ سعدی لوگ اکثر کہتے ہیں' ہمارے ماموں بہت غصے والے ہیں' مگر میرا خیال ہے وہ بہت سوبر ہے۔ اور ہاشم..... اف۔" جھرجھری لے کر سر جھٹکتے اس نے اگلا نوالہ توڑا۔

بڑے ابا کا کھانا حرام ہو چکا تھا۔ وہ نیپکن سے ہاتھ رگڑ کر صاف کرنے لگے۔ زمر نے کھانا ختم کیا اور پلیٹیں اکٹھی کر کے کچن میں لے گئی تو فرحانہ بھی ساتھ ہی آ گئیں۔ اس نے فریج کھولا تو مٹھائی کا ٹوکرا اندر رکھا تھا۔

"یہ کہاں سے آیا امی؟" اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاب جامن اٹھایا اور منہ سے توڑا۔

"حماد کے گھر سے۔ وہ لوگ آج آئے تھے۔ ہم نے ان کو ہاں کر دی ہے۔ بتایا تھا نا۔" وہ سالن ڈبوں میں ڈالتی فریج میں رکھ رہی تھیں۔

"ہوں۔ اچھی ہے۔" گلاب جامن اندر تک گھل گئی۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر' ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ' اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

فرحانہ باقی برتن اٹھانے واپس آئیں تو بڑے ابا ہنوز سربراہی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ افسوس' ملامت' وہ بہت ہرٹ ہوئے تھے۔

"آپ نے زمر سے نہیں پوچھا تھا؟" وہ آہستہ سے بولے۔

"پوچھ بھی لیتی اور وہ مان جاتی تب بھی میں ندرت کے بھائی کو اپنی بیٹی کا رشتہ نہ دیتی یوسف صاحب۔ کبھی بھی نہیں۔ ندرت یہ چاہتی ہے کہ میں جھک کر رہوں تو ایسا نہیں ہو گا۔" تیز لہجے میں کہتیں' برتن اٹھا پٹخ کرنے لگیں۔

"آپ نے زمر سے نہیں پوچھا تھا؟" وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرحانہ نے فکرمندی سے انہیں جاتے دیکھا۔ وہ زمر کی طرف نہیں گئے تھے' اپنے کمرے میں گئے تھے۔ ان کو یک گونہ اطمینان ہوا۔ شکر' یہ معاملہ تو ختم ہوا۔ جیسے بھی سہی۔



رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہو گی
میں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

وارث نے لاؤنج میں قدم رکھا' دوپہر کا اندھیرا چھایا تھا۔ پنکھا بند۔ صوفے پہ اکڑوں بیٹھی حنین' جو ناراضی سے خلا میں گھور رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "گرمی میں کیوں بیٹھی ہو؟" احتیاط سے پکارتا قریب آیا' گردن ٹیڑھی کر کے اس کے تاثرات دیکھے۔ اس نے خفگی سے آنکھیں اٹھائیں۔

"بجلی نہیں ہے۔ ایک سے دو جاتی ہے' پھر شام کو چار سے پانچ جائے گی۔" وارث ہنس پڑا۔

"پاکستان کا کوئی دماغ ایسا نہیں ہے جس میں بجلی کی آمد و رفت کا حساب نہ ہو۔" حنین نہیں ہنسی' اسی طرح سامنے دیکھتی رہی۔ وہ مقابل صوفے پہ بیٹھا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"آج بھی پھپھو آئی تھیں' ٹیلر سے امی کے کچھ

کپڑے پیک کیے تھے' وہی دینے۔ میں نے بھی آج ان کو کوئی موڈ نہیں دیا۔ سوچتی تو ہوں گی کہ یہ ناراض ہے' ان کی مسکراہٹ بھی سمٹ گئی' شاید حیران تھیں۔ واٹ ایور۔"

اور وہ حیران نہیں تھی' بس ذرا پھیکی پڑ گئی تھی۔ آج "بھول" کر جانے والی چابیاں حنین اٹھا تو لائی' مسکرائی بھی' مگر وہ پچھلے دنوں کی بے تکلفی والا شگاف بھر چکا تھا۔ فاصلہ پھر سے آگیا تھا۔

"اور تم نے یہ کیوں کیا؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟ انہوں نے ماموں کے رشتے سے انکار کر دیا۔"

"تو؟"

"تو؟" حنین نے تعجب سے اسے دیکھا۔ "آپ کو افسوس نہیں ہوا؟"

"میرے افسوس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ ہر انسان کا حق ہے۔ انہوں نے کچھ سوچ کر فیصلہ کیا ہوگا۔"

"آپ جو بھی کہیں' میں ان سے بالکل' بالکل بھی اب محبت نہیں کرتی۔ نہ کبھی کروں گی۔" وہ بے بسی بھرے طیش سے وارث کو دیکھ کر بولی۔ وہ لبوں پہ مٹھی رکھے' خاموشی سے سنتا گیا۔

"مجھے ابو سے بھی محبت نہیں ہے۔ مجھے ان پر غصہ ہے۔ وہ ہمیں اس وقت چھوڑ کر چلے گئے جب ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ ان کو چاہیے تھا' وہ سڑک پہ احتیاط سے چلیں۔ ان کو ہمارا سوچنا چاہیے تھا۔" وہ سر جھکا کر کہہ رہی تھی اور اس کی آواز میں نمی تھی۔ "میں پھپھو کو جب بھی دیکھتی تھی مجھے ان میں ابو نظر آتے تھے۔ مجھے لگتا تھا ہم کبھی دوست نہیں بن سکتے۔ میں اور پھپھو۔ کبھی بھی نہیں۔ اگر ہم قریب آئے تو وہ مجھ سے چھن جائیں گی' مگر پچھلے کچھ دنوں میں مجھے لگنے لگا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ پھر ایسا ہی ہو گیا۔ اب میرا کوئی بھی فرینڈ نہیں ہے۔ میں دوبارہ کبھی ان کے پاس کوئی بھی مسئلہ لے کر نہیں جاؤں گی۔" سر جھکائے اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"فارس کے رشتے کو انکار کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تم سے کم محبت کرنے لگی ہیں۔"

"آپ جو بھی کہیں۔ ہم کبھی دوست نہیں بن سکتے۔"

"اچھا۔ کہیں باہر چل کر کچھ کھاتے ہیں۔" وہ چابی اٹھاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے نہیں کھانا کچھ۔" غصے سے سر جھٹکا۔ ہنوز ناراض تھی۔ شاید ساری دنیا سے۔

"چلو۔ خیر میں تو چاہ رہا تھا کہ اس بولان ریسٹورنٹ میں جا کر مٹن کڑاہی بنواتے ہیں (حنین نے جھٹکے سے گیلا چہرہ اٹھایا) ساتھ میں تندور والی روٹی' سلاد۔ مگر.... خیر' چھوڑو' تم نے تو کچھ نہیں کھانا۔"

"مٹن کڑاہی کچھ میں نہیں آتی' اچھا!" جلدی جلدی چہرہ رگڑتی' وہ پیروں میں چپل گھسیٹتی اٹھ کر اندر بھاگی۔ ساتھ ہی آوازیں بھی دے رہی تھی۔

"امی.... امی.... ماموں کہہ رہے ہیں' ہم کھانے پہ باہر...."

وہ مسکرا کر کار اسٹارٹ کرنے باہر نکل گیا۔



یہ سانپوں کی بستی ہے ذرا دیکھ کر چل وصی
یہاں کا ہر شخص بڑے پیار سے ڈستا ہے

ایئرپورٹ سے گھر تک' سارا راستہ دونوں مسز کاردار خاموش رہی تھیں۔ جب کار کاردار قصر کے سامنے رکی تو جواہرات نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

"تم باہر جاؤ۔"

شہرین جو اترنے کی تیاری میں تھی' چونک کر اسے دیکھا۔ سن گلاسز اوپر کر کے بالوں پہ ٹکائے۔ ڈرائیور اتر گیا تو جواہرات نے مسکرا کر گردن اس کی طرف موڑی۔

"اگلی دفعہ نوشیرواں کو مجھ پہ شک کروانے یا میرے کانٹیکٹس کے خلاف بھرنے سے پہلے ایک سو ایک دفعہ سوچنا۔ کیونکہ یہ آخری موقع ہے جب میں نے نظر انداز کیا ہے' وہ بھی صرف اس لیے کہ تم دو ایک سال سے زیادہ اس گھر میں ٹکتی مجھے نظر نہیں آ رہی

ہو۔ سو یہ مختصر وقت میں تمہارے لیے ناخوشگوار نہیں بناؤں گی، نہ تم میرے لیے بنانا۔ میں چاہتی تو ہاشم کو بتادیتی کہ تم اپنی خالہ کے گھر اتنا کیوں جاتی ہو، مگر میں اپنے بیٹے کی مختصر سی شادی شدہ زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی' اس لیے نہیں بتاؤں گی کہ تمہاری خالہ کے بیٹے کے ذکر پہ تمہارا رنگ کس طرح سفید پڑتا ہے، جیسے ابھی پڑ رہا ہے۔ کلیئر۔"

مسکرا کر ٹھنڈے برف لہجے میں کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑی۔ شہرین نے تھوک نگلا' پھر گردن تان کر کہنے کی کوشش کی۔

"ہاشم جانتا ہے' وہ میرا دوست تھا۔"

"بالکل' ہاشم یہی جانتا ہے کہ وہ تمہارا دوست ... تھا۔ شہری!" مسکرا کر کہتی وہ باہر نکل گئی۔ شہرین نے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ (بوٹوکس کی ماری بڑھیا) اور خود بھی مسکراہٹ چہرے پہ لاتی باہر آ گئی۔

☆ ☆ ☆

بے اعتبار شخص تھا وہ وار کر گیا
لیکن میرے شعور کو بیدار کر گیا

کچہری میں معمول کی چہل پہل تھی۔ ہاشم نے موبائل پہ بات کرتے ہوئے اس آفس کا دروازہ کھولا' اور اندر آیا۔ آس پاس کی میزوں کو نظر انداز کرتا' آخری ڈیسک کی طرف بڑھ گیا۔

"ہاں تم مجھے کام ختم کر کے اطلاع کرو۔ دو گھنٹے تک۔ لازمی۔" موبائل بند کر کے کرسی کھینچی' سامنے دیکھا۔ اور...... رک گیا۔

وہ کرسی پہ ٹیک لگائے بیٹھی' مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ گھنگھریالے بال جوڑے میں بندھے تھے' صرف ایک لٹ گال کو چھو رہی تھی۔ ہاشم کی نظریں بے اختیار میز پہ رکھی نیم پلیٹ پہ جھکیں۔

"میں تعارف خود ہی کروا دیتی ہوں۔ پبلک ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر زمر یوسف خان۔ دو ہفتے پہلے میری تقرری ہوئی ہے۔ اور شاید ایک ماہ قبل آپ سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ بھولے تو نہیں ہوں گے

آپ مجھے۔"

ہاشم بے اختیار ہنس دیا ہنستے ہنستے نفی میں سرہلایا۔ اور بہت محظوظ ہونے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"یعنی میری وجہ سے آپ کو نئی جاب مل گئی۔ گڈ!"

"تو پھر کس کیس کے سلسلے میں آپ آئے ہیں کاردار صاحب؟" وہ مسکرا کر کہتی ہاتھ ملا کر میز پہ رکھے آگے ہوئی۔

"میرا خیال ہے مستقبل میں ہمیں بہت سے کیسز یہیں بیٹھ کر طے کرنے ہوں گے۔ اس لیے..... کیوں نہ پہلے آپ مجھے اچھی سی چائے پلوائیں۔ بغیر شوگر کے۔" وہ ابھی تک لطف اندوز ہو رہا تھا۔ زمر سرد سا مسکرائی۔

"شیور۔ میرے ڈیسک پہ چائے کا سامان ہر وقت موجود ہوتا ہے آپ کو اب یہاں خود چائے بنانے کی عادت ڈالنی ہوگی مگر آئندہ کے لیے کیونکہ پہلی چائے میں آپ کے لیے بنا دوں گی۔ بغیر شوگر کے۔" کہہ کر وہ اٹھی اور کیتلی اٹھالی۔ ہاشم کہنی کرسی کے ہتھے پہ رکھے گردن اٹھا کر اسے چائے بناتے دیکھتا رہا۔

"اب کیس پہ بات کر لیتے ہیں کاردار صاحب۔"

کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے زمر نے چینی دان سے دو چمچ نکالے اس کو دکھا کر چائے میں انڈیلے اور چمچ پرچ پہ رکھ دیا پھر کرسی پہ آکر بیٹھی اور بولی۔ "یقین کیجئے میرا دماغ آج بالکل حاضر ہے۔"

ہاشم پھر سے ہنس دیا۔ دل ہی دل میں تلملاتے ہوئے۔

پانچ سال بعد بھی وہ اسی طرح بوفے ٹیبلز کے ساتھ کھڑا ہنس کر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اور بے خیالی میں اس کو دیکھتی زمر ذرا چونکی۔ اردگرد شادی کا فنکشن جو ماضی کی دھول میں دھندلا ہو گیا تھا اب واضح ہونے لگا۔

اس نے ایک ہاتھ سے کنپٹی مسلی اور کرب سے آنکھیں بند کیں۔ حنین میٹھا لینے جا چکی تھی مگر جو کڑوا وہ کہہ کر گئی تھی اس کا اثر اب بھی باقی تھا۔ یہ رشتہ کب مانگا گیا کب انکار ہوا اسے یہ نہیں معلوم تھا مگر ایک بات صاف نظر آنے لگی تھی۔

وہ جو چار سال سے یہ سوچتی رہی کہ فارس نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا تو اس کا جواب مل گیا تھا۔ اس نے انتقام لیا تھا۔ ٹھکرائے جانے کا انتقام۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا دل میں..... یہی کہا تھا نا اس نے۔ اسے سب یاد تھا۔ انتقام تھا تو انتقام سہی۔ (میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا زمر صرف ایک گولی)

ایک بج پہ پہنچ کر اس نے موبائل پہ کال ملا کر اسے کان سے لگایا۔

"بصیرت صاحب سوری میں آپ کو غلط وقت پہ تنگ کر رہی ہوں۔ مجھے ایک کیس فائل چاہیے۔ جی..... پبلک ریکارڈز کے علاوہ بھی جو کچھ آپ کے پاس ہو اس کیس سے متعلق جی سارا باکس بھجوا دیجئے۔ میں اپنے ملازم کو بھیجتی ہوں آپ کی طرف۔"

وہ پوچھ رہے تھے کہ اسے کون سا کیس چاہیے۔ زمر نے گہری سانس لی دور کھڑے کرن اور حماد کو اپنے جڑواں بچوں اور دلہا دلہن کے ساتھ مسکرا کر فوٹو اترواتے دیکھا اور بولی تو آواز یخ ٹھنڈی تھی۔

"سرکار بنام فارس غازی"

اس نے فون بند کیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ چہرہ اب سپاٹ تھا اور ذہن قدرے مجتمع تھا۔

دور حنین سوئیٹ ڈش ٹیبل پہ پلیٹ میں کچھ نکال رہی تھی۔ کن انکھیوں سے وہ قریب کھڑے ہاشم کو کسی سے بات کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نکالتی رہی یہاں تک کہ ہاشم کا مخاطب مڑ گیا تو وہ اس تک آئی۔ وہ اسے دیکھ کے بس ہلکا سا مسکرایا۔

"مجھے..... آپ سے یہ کہنا تھا کہ....." اپنے پیالے میں چمچ ہلاتے اور چمچ کو دیکھتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "کہ مجھے بھی بہت افسوس ہے۔ آپ کے فادر کی ڈیتھ کا۔ مجھے ان کے جنازے پہ آنا چاہیے تھا مگر میں نہیں آسکی۔ آئی ایم سوری ہاشم بھائی۔" نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس نے سر کے خم سے تعزیت وصول کی۔

''اٹس او کے مگر تمہیں آنا چاہیے تھا۔ حنین! سعدی تو آیا تھا۔ اس وقت نہ سہی بعد میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے بعد تم لوگوں نے ہماری طرف.... آنا چھوڑ دیا بالکل۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہاشم کے حلق میں کچھ اٹکا تھا۔ گردن میں ابھر کر معدوم ہوتی گلٹی، آنکھوں میں چونک جانے کا احساس۔ حنین اگر متوجہ ہوتی تو محسوس کر لیتی۔

''آئی ایم سوری!'' وہ سر جھکائے کہہ کر مڑ گئی۔ واپس میٹھے کی جگہ پہ آئی تو سعدی وہاں کھڑا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ ''ہاشم بھائی کیا کہہ رہے تھے؟''

اس نے اداس آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ''میں ان سے معذرت کر رہی تھی کہ میں ان کے والد کی وفات پہ نہیں آسکی۔ مجھے آنا چاہیے تھا۔ اور اس سے پہلے انہوں نے بھی معذرت کی۔ انہوں نے کہا کہ انہیں افسوس ہے۔''

سعدی نے پیالے میں سوفلے کا چمچ الٹتے ہوئے تلخی سے سر جھٹکا۔

''کتنا آسان ہے حنین، ڈیڑھ سال بعد ایک شادی کی تقریب میں آکر کہہ دینا کہ مجھے افسوس ہے۔ ہونہہ۔'' حنین نے یاسیت سے اسے دیکھا۔

''نہیں افسوس ہے۔ واقعی ہے۔''

''اگلی دفعہ جب وہ تمہیں کہیں کہ ان کو افسوس ہے، تو ان سے کہنا، افسوس کافی نہیں ہوتا۔'' وہ سنجیدگی سے کہتا پلٹ گیا۔ وہ اب زمر کی ٹیبل کی طرف جا رہا تھا۔ حنین دل مسوس کر وہیں کھڑی رہ گئی۔ کیا وہ ساری زندگی اسی نقطے پر کھڑی رہے گی؟ کیا وہ بھی پھپھو کی طرح کبھی آگے نہیں بڑھ سکے گی؟

اس کا ذہن پل بھر کو اپنے اردگرد سے ہٹتا گیا۔ دل و دماغ پر کوئی دھند سی چھا رہی تھی۔ سیاہ رات میں سنہری دھند.... اس کا ذہن اس دھند میں ڈوبتا گیا.... ڈوبتا گیا۔



موجودہ دن سے چار سال پہلے
(وارث غازی قتل سے تین دن قبل)

ذوالفقار یوسف کے گھر کے چھوٹے سے کچن میں شرارت بھری خاموشی چھائی تھی۔ کاؤنٹر پہ دو ڈشز رکھی تھیں۔ اک خالی۔ ایک میں تازہ بیک شدہ کیک جس کی لیرز کاٹ کر اندر کریم بھری گئی تھی۔ اب اس کیک کو دوسری، صاف ڈش میں ڈالنا تھا۔ سعدی نے نچلا لب دبائے مسکراتے ہوئے حنین کو دیکھا جو آستین چڑھا کر کیک کے قریب ہاتھ لے جاتی، پھر واپس کھینچ لیتی۔

''میں ڈال دوں، حنہ؟''

''خبردار۔ یہ نرم ہے، ٹوٹ جائے گا اور اسے ہاتھ بھی مت لگائیے گا۔'' وہ غصے سے بولی۔

''انگلی لگاؤں۔'' سعدی نے انگلی اس طرف بڑھائی۔ حنہ نے زور سے اس کی انگلی پہ ہاتھ مار کر پیچھے ہٹایا۔

''میں چھت سے نیچے پھینک دوں گی آپ کو۔ پھپھو کی شادی میں پلستر چڑھا ہو گا۔'' آج کل حنین کی ہربات میں دو ہفتے بعد ہونے والی پھپھو کی شادی کا تذکرہ ضرور ہوتا تھا۔

''اول فول نہ بولا کرو۔'' ہر وقت۔ ندرت نے اسے گھورتے ہوئے کفگیر دکھایا۔ سعدی دل کھول کر ہنسا۔

''یار حنہ، امی کو ابھی تک ہمارے خلاف کفگیر، جوتے اور ہینگر کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں ملا؟''

ندرت نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیں اور چولہے کی طرف مڑ گئیں۔ حنہ کا کیک ابھی تک ویسے ہی پڑا تھا اور وہ ڈرتے ڈرتے ہاتھ اس کی طرف بڑھا رہی تھی، تب ہی فون کی گھنٹی بجی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

کیسے جانوں کہ جہاں خواب نما ہوتا ہے
جبکہ ہر شخص یہاں آبلہ پا ہوتا ہے

دیکھنے والوں کی آنکھوں میں نمی تیرتی ہے
سوچنے والوں کے سینے میں خلا ہوتا ہے

لوگ اس شہر کو خوشحال سمجھ لیتے ہیں
رات کے وقت بھی جو جاگ رہا ہوتا ہے

گھر کے بارے میں یہی جان سکا ہوں اب تک
جب بھی لوٹو، کوئی دروازہ کھلا ہوتا ہے

فاصلے اس طرح سمٹے ہیں نئی دنیا میں
اپنے لوگوں سے ہر اک شخص جدا ہوتا ہے

میرے محتاج نہیں ہیں یہ بدلتے موسم
مان لیتا ہوں مگر دل بھی برا ہوتا ہے

چاندنی رات نے احساس دلایا ہے ملال
آدمی کتنے سرابوں میں گھرا ہوتا ہے

صغیر ملال

کراچی میں رہنے والے دوست کے نام خط

تمہارا شہر کیسا ہے؟
وہ سورج جو تمہارے پاس آکر جگمگاتا ہے
وہ کیسا ہے؟
وہ چندا! جو تمہاری سیج پر تارے سجاتا ہے
وہ کیسا ہے؟
وہ رستہ! جو تمہارے گھر کو جاتا ہے
وہ کیسا ہے؟
تمہارا شہر کیسا ہے؟
وہ کرنیں جو تمہارا آنگن سجاتی ہیں
وہ کیسی ہیں؟
ہوائیں! جو تمہیں چھو کر ستاتی ہیں
وہ کیسی ہیں؟
وہ راتیں! جو تمہیں لوری سناتی ہیں
وہ کیسی ہیں؟
تمہارا شہر کیسا ہے
تمہارے شہر کی جتنی فضائیں، جتنے رستے ہیں
وہ کیسے ہیں؟
تمہارے شہر میں جتنے سجیلے لوگ بستے ہیں
وہ کیسے ہیں؟
تمہارا شہر کیسا ہے؟

سنا ہے پھول بھی اس شہر میں مرجھائے رہتے ہیں
ستارے سہمے رہتے ہیں، چمن کملائے رہتے ہیں
سنا ہے اب تو چندا کی بھی لو تھرائی رہتی ہے
سنا ہے اب تو سورج کے لہو سے باس آتی ہے
سب ہی چہروں کو نفرت اور ڈر نے یوں سجایا ہے
کہ سارے شہر پر جیسے کوئی آسیب چھایا ہے

نیلما سرور



کسے ہے لوحِ وقت پر دوام سوچتے رہے
لکھے ہوئے تھے کیسے کیسے نام سوچتے رہے

رہِ حیات میں رُکا ہے کون کتنی دیر کو؟
مسافروں کا وقفۂ قیام سوچتے رہے

اُجڑ کے دل بسا نہیں، بچھڑ کے وہ ملا نہیں
عذاب ہے کہ ہجر، صبح و شام سوچتے رہے

جو ملا تھا راستے میں، کیا بتائیں کون تھا؛
وہ یاد آگیا تو اس کا نام سوچتے رہے

کچھ ایسے بے خبر نہ تھے شکاریوں کی چال سے
جب آگئے طیور زیرِ دام، سوچتے رہے

رشید ساری عمر اسی خیال میں گزر گئی
کہ ظالموں سے لیں گے انتقام، سوچتے رہے

رشید کامل

ناؤ کاغذ کی سہی کچھ تو نظر سے گزرے
اس سے پہلے کہ یہ پانی مرے سر سے گزرے

کوئی دستک نہ صدا، کوئی تمنّا نہ طلب
ہم کہ درویش تھے، یوں بھی ترے در سے گزرے

غیرتِ عشق تو کہتی ہے کہ اب آنکھ نہ کھول
اس کے بعد اب نہ کوئی اور ادھر سے گزرے

میں تو چاہوں وہ سرِ دشت ٹھہر ہی جائے
پر وہ ساون کی گھٹا جیسا ہے برسے، گزرے

مجھ کو محفوظ رکھا ہے مرے چھوٹے قد نے
جتنے پتھر اِدھر آئے مرے سر سے گزرے

سعد اللہ کلیم

شگفتہ جاہ



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"معراج کی رات میں نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا۔"صدقے کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔" میں نے کہا "اے جبرئیل کیا وجہ ہے کہ قرض صدقے سے بھی زیادہ فضیلت کا حامل ہے؟"

انہوں نے کہا۔" اس لیے کہ سائل (بعض اوقات) سوال کرتا ہے حالانکہ اس کے پاس (اس کی ضرورت کا مال) موجود ہوتا ہے جبکہ قرض لینے والا ضرورت اور مجبوری کی حالت میں ہی قرض لیتا ہے۔ کیونکہ قرض کی واپسی تو ضروری ہے اس لیے مجبوری کے وقت ہی لیا جاتا ہے۔

(ابن ماجہ)

مستقل مزاجی،

کارلائل کہتا ہے کہ یکسو طبیعت سے کام شروع کر کے کمزور سے کمزور انسان بھی کچھ کر کے دکھا سکتا ہے مگر منتشر طبع شخص مضبوط اور طاقت ور ہونے کے باوجود بھی بہت سے اطراف میں اپنا دھیان بٹانے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا۔

پانی کا ایک قطرہ کسی جگہ لگاتار ٹپکتا رہے تو وہ آخر کار ایک مضبوط چٹان میں بھی سوراخ کر دیتا ہے۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

خدا اور بندہ،

- خدا رازق اور بندہ "قزاق" ہے۔

(فیثاغورث)

حرا قریشی۔ ملتان

امید،

"بڑا ہونے کے لیے بڑا حوصلہ بھی چاہیے"

سکندر اعظم نے ایران کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے مقدونیہ میں اپنے محل کا قیمتی ساز و سامان اپنے سپاہیوں کو بخش دیا تھا۔ اس کے دوست کلیٹرس نے پوچھا۔

"سکندر! تم نے اپنے لیے کیا رکھا؟"

تو اس اولوالعزم انسان نے جو عظیم جرنیل ہونے کے علاوہ عظیم انسان بھی تھا، بڑے اعتماد سے کہا۔

"امید۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

بات تو ہے سچ مگر...،

- تین آدمیوں میں "راز" راز رہ سکتا ہے بشرطیکہ ان میں سے دو مر چکے ہوں۔
- ایک مرتبہ شادی کرنا فرض ہے، دوسری مرتبہ حماقت اور تیسری مرتبہ پاگل پن۔
- مہمان چلے جانے کے بعد اکثر بہت اچھے لگتے ہیں۔
- جو منانے سے بھی نہ مانے، وہ شیطان ہے۔
- بے وقوف ہونے میں بڑی آسانی ہے۔ آپ کسی بھی محفل میں تنہا نہیں ہوتے۔
- وقت بچانے کا بہترین طریقہ پہلی نظر میں محبت۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

فوری ردعمل،

عطاء الحق قاسمی نے ایک محفل میں بیٹھے ہوئے جب نصف گھنٹے میں پانچواں، چھٹا سگریٹ سلگایا تو بیرون ملک سے آئے ہوئے ایک دوست نے ان سے کہا۔

"یار عطا! تم سگریٹ زیادہ پینے لگے ہو، یہ کوئی اچھی بات نہیں، تم سگریٹ کم کیوں نہیں کر دیتے؟"
عطا نے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔
"میں بھی یہی سوچتا ہوں، اب ان شاء اللہ کم کر دوں گا۔"

اس دوست نے فوراً کہا۔
"کم کر دوں گا نہیں، ابھی کم کر دو ان کو... لاؤ ایک سگریٹ مجھے دو۔"

فرق

ارسطو کے ایک شاگرد نے ارسطو سے پوچھا۔
"جناب! رشک اور حسد میں کیا فرق ہے؟"
ارسطو نے کہا۔ "جو تم سے حسد کرتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ تم تباہ و برباد ہو جاؤ اور جو تم پر رشک کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ تمہارے جیسا بن جائے۔"
حنا ارشد فیض۔ کراچی

ملازمت

ایک شخص پولیس میں ملازمت کا امیدوار تھا۔ ممتحن نے پوچھا۔
"ابراہام لنکن کو کس نے قتل کیا؟"
وہ کچھ دیر سوچ کر بولا۔ "مجھے اس کا جواب دینے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔"
"ضرور۔ آپ جائیں اور کل صحیح صحیح جواب لے کر آئیں۔"

وہ گھر آیا تو بیوی نے پوچھا۔
"کیا رہا۔ ملازمت مل گئی؟"
وہ بولا۔ "معلوم تو یہی ہوتا ہے، فوراً ہی انہوں نے ایک قتل کا کیس دے دیا اور قاتل کی تلاش پر مامور کر دیا ہے۔"
آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

عبادت

اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انسان کی حفاظت نہیں ہوتی
مخلوقِ خدا جب کسی مشکل میں پھنسی ہو
سجدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی
شہید علی اصغر تنولی

ہندوؤں کا تعصب

ایک صحافی نے قائداعظم سے کہا۔
"آج تو آپ حد درجہ خوش ہوں گے۔ آخر آپ نے پاکستان حاصل کر ہی لیا۔"

انہوں نے فرمایا۔
"میں نے پاکستان اکیلے حاصل نہیں کیا۔ اس کے حصول میں میرا حصہ روپے میں صرف دو آنے ہے۔ چھ آنے کے برابر دس کروڑ مسلمانوں کا ہے اور روپے میں آٹھ آنے ہندوؤں کا حصہ ہے۔"
ان کی یہ بات سن کر تمام غیر ملکی نامہ نگار حیران رہ گئے۔ قائداعظم نے ان کی حیرانی دور کرنے کے لیے کہا۔
"اگر ہندو قوم متعصب اور تنگ دل نہ ہوتی تو ہمیں پاکستان مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یہ ہندو قوم کا تعصب اور ہٹ دھرمی تھی جو ہمارے عزم راسخ اور بالآخر کامیابی کا سبب بنی۔"

یک نہ شد

راہ گیر نے ایک لڑکے سے کہا۔
"کیوں میاں... کیا آپ ابھی تک اپنا کھویا ہوا نوٹ تلاش کر رہے ہیں؟"
لڑکے نے کہا۔ "جی نہیں! نوٹ تو چھوٹے بھائی کو مل گیا تھا۔"
راہ گیر نے حیرت سے پوچھا۔
"پھر اب کیا تلاش کر رہے ہو؟"
"چھوٹے بھائی کو۔" لڑکے نے جواب دیا۔
عائشہ۔ گوجرہ

جھوٹے

کتنے جھوٹے تھے ہم محبت میں
وہ بھی زندہ ہے میں بھی زندہ ہوں
نوال افضل گھمن۔ لاہور

اللہ کا فضل

جب دُنیا ظلمت ہے... اور آخرت نور...
ظلمات فنا ہے... نور بقا ہے... فنا سے بقا کا راستہ لینے کے لیے اللہ پاک کا فضل مانگیں...
اللہ پاک کا فضل اللہ پاک کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔

(واصف علی واصف)

بدلہ

'نقوش' کے مدیر محمد طفیل نے ایک بار اپنے معاصر مرزا ادیب کو اپنی کتاب دی اور داد کے طالب ہوئے۔ مرزا صاحب نے کہا۔

"ٹائٹل اچھا ہے!"

محمد طفیل اس خاموش طنز کو پی گئے۔

کئی سال بعد مرزا صاحب نے اپنی کتاب 'نقوش' میں تبصرہ کے لیے دی۔ محمد طفیل نے کسی رائے کا اظہار کیے بغیر کتاب ایک طرف رکھ دی۔ مرزا صاحب نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

"طفیل صاحب! کیا خیال ہے، کتاب پسند آئی؟"

طفیل صاحب نے سادگی سے جواب دیا۔

"اس کا تو ٹائٹل بھی اچھا نہیں۔"

ایک شعر

کب لوٹا ہے بہتا پانی، بچھڑا ساجن، روٹھا دوست
ہم نے اس کو اپنا جانا، جب تک ہاتھ میں داماں تھا

(انشا جی)

ذرا سوچیے

ایک روز ہم اکیلے رہ جائیں گے یہ سوچ کر کہ اگر وہ میرا خیال نہیں رکھتا تو میں کیوں یاد رکھوں۔

(اشفاق احمد۔ زاویہ 3)

نوال افضل۔ لاہور

قوت ارادی

دو دوستوں کی کافی عرصہ بعد ملاقات ہوئی تو ایک نے دوسرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"دراصل میں نے شراب، جوا اور عورتوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیا ہے۔" دوسرے دوست نے بتایا۔

"اوہ... یہ تو بہت اچھی بات ہے، اس کا مطلب ہے کہ تم زبردست قوت ارادی کے مالک ہو، یہ حرکتیں چھوڑنے کے لیے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے۔" پہلے دوست نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"قوت ارادی کا تو مجھے پتا نہیں... مجھے تو یہ حرکتیں اس لیے چھوڑنا پڑیں کہ میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔" دوسرے دوست نے سادگی سے جواب دیا۔

یہ کیسے حکمران تھے؟

سلطان صلاح الدین ایوبی نے فلسطین، شام، اردن، لبنان اور مصر پر حکومت کی۔ بیت المقدس بھی فتح کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی ذاتی وراثت کا حساب کیا گیا تو ایک گھوڑا، ایک تلوار، ایک زرہ ایک دینار اور چھتیس درہم کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ قرض لے کر ان کے کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔ وہ شدید خواہش کے باوجود حج نہ کر سکے۔ یہ کیسے حکمران تھے۔

قدر شناس

ایک صاحب اپنے پڑوسی کو بتا رہے تھے۔

"کل میرے ایک بہترین دوست نے مجھے خود پیشکش کی کہ میں چاہوں تو اس سے جتنی چاہے رقم ادھار لے سکتا ہوں۔"

"تو پھر کیا آپ نے رقم لے لی...؟"

پڑوسی نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں... میں نے سوچا کہ آج کل کے زمانے میں اچھے دوست کہاں ملتے ہیں۔ میں نے ایسے اچھے دوست کو ہاتھ سے کھونا مناسب نہیں سمجھا۔" ان صاحب نے جواب دیا۔

صائمہ سلیم۔ اسلام آباد



خالدہ جیلانی



ناہید نور الٰہی ———— کراچی

عید کے دن تیری راحت کی دُعا مانگوں گی
میں ہر اک سانس میں نصرت کی دُعا مانگوں گی

سیماب رسول ———— اسلام آباد

یہ کس نے دل کے کاغذ پر نہایت ہی صفائی سے
محبت لفظ لکھ ڈالا، وفا کی روشنائی سے

ارم باجوہ ———— اسلام آباد

مجھ سے نظریں وہ کیا ملائیں گے
آئینوں سے جو بچتے پھرتے ہیں

نازیہ خالد ———— راولپنڈی

صبر کا پیمانہ یوں لبریز نہ کر اے ہمسفر
کچی ڈوری ٹوٹتے دیر نہیں لگتی

اقرأ ملک ———— گوجرانوالہ

شک تو تھا محبت میں خسارے ہوں گے
یقین نہ تھا کہ سارے ہمارے ہوں گے

عائشہ حسین ———— گوجرانوالہ

شب کٹ گئی طواف میں شمع رہی خموش
اظہارِ سوزِ عشق بھی کرنا ضرور تھا
جب مل سکی نہ داد تو پھر جل کے مر گیا
پروانہ اس لحاظ سے کتنا غیور تھا

ارم کمال ———— فیصل آباد

دل تو کیا روح بھی لرزتی ہے
اس قدر محوِ یاس رہتا ہوں
تم کہاں تک کرو گے دلجوئی
میں تو اکثر اُداس رہتا ہوں

نمرہ، اقرأ ———— کراچی

کچھ اور بڑھ گئی ہے اندھیروں کی زندگی
یوں بھی ہوا ہے جشنِ چراغاں کبھی کبھی

حنا سلیم اعوان ———— آخون باندی

بہت دِنوں تک یہ موسمِ گل نہیں رہے گا
جو شاخِ جاں پر گلاب آئیں تو لوٹ آنا
جو ضد یہ آجائے دل تو اس کی بھی مان لینا
پرانی یادیں بہت ستائیں تو لوٹ آنا

شائستہ اکبر ———— گڈو کالونی

اک ہم ہی ناواقف ٹھہرے روپ نگر کی گلیوں سے
بھیس بدل کر ملنے والے سب جانے پہچانے لوگ

مدیحہ نورین مہک ———— برنالی

آؤ بادہ کشوں کی بستی سے
کوئی انسان ڈھونڈ کر لائیں
میں فسانے تلاش کرتا ہوں
آپ عنوان ڈھونڈ کر لائیں

نوال افضل گھمن ———— لاہور

رنج ہے یا بے بسی ہے
جو بھی ہے مسلسل ہے

ایم بی ———— گاؤں ہڈالی

سرِ راہ حال پوچھنے والے
حالِ دل اتنا مختصر بھی نہیں

صائمہ سلیم ———— اسلام آباد

وہ موم میرے عشق کی تاثیر سے ہوا
لیکن یہ واقعہ بڑی تاخیر سے ہوا

فریحہ شبیر ———— شاہ نکڈر

کیا بتاؤں کتنا مشکل ہے
جس کے لیے جینا اس کے بغیر جینا

حرا قریشی ———— ملتان

میں کسی کام کا نہیں ورنہ
وہ کسی کام سے ہی آ جاتا

نمرہ، اقرأ ـــــــــ کراچی

در پہ کوئی دستک نہ کوئی خواب نہ سایہ
یہ دن بھی تو گزری ہوئی راتوں کی طرح ہیں
سنتے ہیں سبھی لوگ سمجھتا نہیں کوئی
جذبے کسی معصوم کی باتوں کی طرح ہیں

ارم کمال ـــــــــ فیصل آباد

عید آئی کیسے دل مضطر کو سنبھالیں
دو اشک بھی آنکھوں میں نہیں ہیں جو بہالیں
تم سب سے گلے بھی ملے اور عید بھی کر لی
ہم کس سے گلے ملنے کے ارمان نکالیں

صائمہ سلیم ـــــــــ اسلام آباد

عید بھی آئے گی اور آکے گزر جائے گی
مندمل زخم مگر پھر سے لگیں گے رسنے
یاد بے ساختہ آئے گا کوئی جان حیات
اک اداسی میرے ماحول پہ چھا جائے گی

اسماء جمیل ـــــــــ لاہور

دیکھ ہماری دید کے کارن کیسا قابل دید ہوا
ایک ستارا بیٹھے بیٹھے تابش میں خورشید ہوا

عائشہ جمیل ـــــــــ لاہور

دنیا بھر کی بچھڑی یادیں مجھ سے ملنے آتی ہیں
شام سمے اس سونے گھر میں میلہ سا لگ جاتا ہے

حرا قریشی ـــــــــ ملتان

سامنے سب کے کرے کس طرح اقرار بتول
یوں سر عام تو اس سے یہ تقاضا نہ کرو

بنفشہ گلشاد کبیر م ـــــــــ کنگن پور

یہ جو ہم ہیں نا احساس میں جلتے ہوئے لوگ
ہم زمین زاد نہ ہوتے تو ستارے ہوتے

ارم احمد ـــــــــ لاوہ

عجب موڑ پہ ٹھہرا ہے قافلہ دل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تو وحشتیں بھی گئیں
یہ کیسی نیند میں ڈوبے ہیں آدمی امجد
کہ ہار تھک کے گھروں سے قیامتیں بھی گئیں

ارم، آمنہ، سائرہ ـــــــــ کنگن پور

بیٹھ جائیں سایۂ دامان احمد میں منیر
اور پھر سوچیں وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

ثمرہ احمد بٹ ـــــــــ پتوکی

زندگی خاک نہ تھی خاک اڑاتے گزری
تجھ سے کیا کہتے ! تیرے پاس جو آتے گزری

وردہ بٹ ـــــــــ ڈسکہ

تیری محبت کے ستائے ہوئے ہیں
دیکھ پھر بھی تیری محفل میں آئے ہوئے ہیں

عائشہ حسین ـــــــــ قلعہ دیدار سنگھ

غم آرزو میری جستجو میں سمٹ کے آگیا روبرو!
یہ سکوت مرگ ہے کس لیے، میں جواب دوں تو سوال کر
میرے درد کا، میرے ضبط کا، میری بے بسی، میرے صبر کا
جو یقین نہ آئے تو دیکھ لے تو ہوا میں پھول اچھال کر

ثمینہ کوثر عطاری ـــــــــ گجرات

نہ سوال سود و زیاں کا کر، ہے وہ کیا جو مجھ کو ملا نہیں
میرے ہمسفر تو یقین کر، مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں
ہیں تیرے کرم کی ہی بارشیں جو سدا ہیں میرے حال پر
کروں تجھ سے کوئی گلہ کبھی، یہ محبتوں کا صلہ نہیں

الیشہ رفیق ـــــــــ ہارون آباد

خاموش پلکوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں
آپ کیا جانیں کہ آپ کتنا یاد آتے ہیں
ہم تو آج بھی کھڑے ہیں اسی موڑ پر
جہاں آپ نے کہا تھا ٹھہرو ہم ابھی آتے ہیں

رخسانہ عبدالغفار ـــــــــ شاہ نکدر

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

گڑیا شاہ ـــــــــ کہروڑ پکا

اب تک وہی خواب ہیں وہی ہیں
وہی میرے گلاب ہیں وہی ہیں
کہتی ہے زبان خموشیوں کی !
وہی درد کے باب ہیں وہی ہیں

سیدہ نسبت زہرا ـــــــــ کہروڑ پکا

مجھ میں کبھی آہٹ کی طرح سے کوئی آئے
ایک بند گلی کی طرح سنسان بہت ہوں
الجھیں گے کئی بار لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

امۃ الصبور

خواتین کی ڈائری

حرا قریشی کی ڈائری سے

نہایت ہی دلکش اور حسین پیرائے میں رقم اس غزل نے دل میں طلسماتی اثر پیدا کیا۔ میری ڈائری میں تحریر کیف بھوپالی کی یہ غزل سب قارئین بہنوں کے لیے۔

دیدہ و دانستہ ان کے سامنے
لغزشیں، ناکامیاں، پسپائیاں

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں

زندگی شاید اسی کا نام ہے
دوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں

کیا یہی ہوتی ہے شام انتظار
آہٹیں، گھبراہٹیں، پرچھائیاں

میرے دل کی دھڑکنوں میں رہ گئیں
چوڑیاں، موسیقیاں، شہنائیاں

زخم دل کے پھر ہرے کرنے لگیں
بدلیاں، برکھا رتیں، پروائیاں

پیدا کر سمندر کی طرح کیف
وسعتیں، خاموشیاں، گہرائیاں

گڑیا شاہ کی ڈائری سے

درد بس درد ہوتا ہے۔ یہ کبھی کم یا زیادہ نہیں ہوتا اس غزل میں محبت کو اتنے اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔ پڑھیے اور بتائیے کہ ایسا کیا ہے اس غزل میں جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

آنکھوں سے میری اس لیے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی

اب عمر نہ وہ رتے نہ وہ موسم کہ پلٹے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی

ہمراہ تیرے جو پھول کھلاتی تھی دل میں
اب وہی شام درد سے خالی نہیں جاتی

کوئی آکے تیرے یہ دکھ درد سنبھالے
ہم سے تو یہ جاگیر سنبھالی نہیں جاتی

مانگے اگر تو جان بھی تو ہنس کے تجھے دیں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی

ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

ملیحہ تابش صدیقی کی ڈائری سے

یہ غزل پڑھ کر میرے شوہر نے کہا کہ اس کا پہلا شعر تمہارے لیے ہے تو بس پھر مجھے تو یہ پوری کی پوری غزل ہی پسند آگئی۔ احمد ضیاء کی یہ غزل آپ بھی پڑھیے۔

زمین پر ہے مگر آسمان جیسی ہے
وہ نرم نرم سی لڑکی چٹان جیسی ہے

میرے حروف بھی چھوٹے ہیں میرے جذبے بھی
میری کہانی بھی سارے جہان جیسی ہے

یہ شام مل کے بچھڑنے کا استعارہ ہے
یہ رات ہجر کے کالے نشان جیسی ہے

ہوائیں روز بجھاتی ہیں خواہشوں کے دیے
یہ زندگی بھی اندھیرے مکان جیسی ہے

میں اپنے ساتھ ہوں یا کوئی دوسرا ہے ضیاء
یقین کی یہ گھڑی بھی گمان جیسی ہے

حمیرا عروش کی ڈائری سے

انتظار کی جان لیوا کیفیت، زندگی کے سراب اور چارہ گر کی تلاش ۔ کسی نامعلوم شاعر کی یہ غزل مجھے میری بہن نے بھیجی تھی۔ قارئین کی نذر۔

مجھے آرزوئے سحر رہی یونہی رات بڑی دیر تک
نہ بکھر سکا، نہ سمٹ سکا یونہی رات بڑی دیر تک

ہیں بہت عذاب اور اکیلے ہم، شب غم بھی میری طویل تر
رہی زندگی بھی سراب اور رہی آنکھ تر بڑی دیر تک

یہاں ہر طرف ہے عجب سماں، سب ہی خودپسند، سب ہی خودنما
دل بے قرار کو نہ ملا کوئی چارہ گر، بڑی دیر تک

مجھے زندگی ہے عزیز تر، اسی واسطے میرے ہم سفر
مجھے قطرہ قطرہ پلا زہر جو کرے اثر بڑی دیر تک

طیبہ نواز کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل اپنوں کی بے اعتنائی بے رخی اور حالات و واقعات کے بارے میں ہے۔ آپ بھی پڑھیں۔

معیار گرتا نہ اپنوں کا، نہ ہم بھی دشمن کی ڈھال ہوتے
ضعیف دشمن پہ وار کرتے تو وقت کے ہم دجال ہوتے

نہیں تھا اپنا مزاج ایسا کہ ظرف کھو کر انا بچاتے
وگرنہ ایسے جواب دیتے کہ پھر نہ پیدا سوال ہوتے

ہماری فطرت کو جانتا ہے تبھی تو دشمن یہ کہہ رہا ہے
ہے دشمنی میں بھی ظرف اتنا، جو دوست ہوتے کمال ہوتے

جو آ کے تم حال پوچھ لیتے تو اتنی لمبی نہ عمر لگتی
کہ وصل لگتی اک گھڑی میں سارے گزرے ماہ و سال ہوتے

نوشابہ منظور کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

تھکن تو اگلے سفر کے لیے بہانا تھا
اسے تو یوں بھی کسی اور سمت جانا تھا

وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی
اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا

متاع جاں کا بدل ایک پل کی سرشاری
سلوک خواب کا آنکھوں سے تاجرانہ تھا

ہوا کی کاٹ شگوفوں نے جذب کر لی تھی
تبھی تو لہجۂ خوشبو بھی جارحانہ تھا

وہی فراق کی باتیں، وہی حکایت وصل
نئی کتاب کا اک اک ورق پرانا تھا

قبائے زرنگار خزاں پہ سجتی تھی
تبھی تو چال کا انداز خسروانہ تھا

نائلہ۔۔۔ ملتان

"یارم" کی یہ قسط بھی بہت اچھی تھی۔ عہد الست کا تلفظ اور مطلب ابھی تک پتا نہیں چلا۔ پلیز مشکل الفاظ پر زیر' زبر لگادیا کریں اور ساتھ مطلب بھی بتادیا کریں۔

ج :۔ عہد الست کے معنی ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ عہد الست وہ عہد ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے ہماری پیدائش سے بھی پہلے ہم سے لیا اور جسمانی طور پر اللہ کی پیدا کردہ۔ ہر روح اس بات کا اقرار کرچکی ہے کہ اللہ رب العالمین کے علاوہ اور کوئی ذات اس لائق نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔ جس کی فرماں برداری کی جائے اور جس کو معبود ٹھہرایا جائے۔ اس کو اس طرح پڑھا جائے گا عہدِ الست۔

ناہید نور الہی۔۔۔ کراچی

انتہائی دکھی دل کے ساتھ خط لکھ رہی ہوں۔ آپی کیا بات ہے کہ پانچ' چھ ماہ سے ہمارے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا جارہا ہے۔ خط لکھنے سے پوسٹ کرنے تک جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے' ہم ہی جان سکتے ہیں کہ بچے کتنی مشکل سے خط وغیرہ پوسٹ کرکے آتے ہیں کہ ان کی اپنی پڑھنے لکھنے کی مصروفیات ہیں۔ میری پیاری ماں ہمیں روتا بلکتا چھوڑ کر اس دنیا فانی سے کوچ کر گئیں۔ 10 جون کو ان کی وفات ہوئی۔ امی کی وفات کے بعد میں نے اپنی آنکھ کا آپریشن کروایا کہ آنکھ میں موتیا اتر آیا تھا۔ "بن مانگی دعا" پڑھا ہے۔ اچھا جارہا ہے۔ دلچسپی موجود ہے۔ میں نے بھی ایک عدد افسانہ ارسال کیا تھا۔ پلیز یہ بتادیں کہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں۔

ج :۔ پیاری ناہید! آپ کی والدہ کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر اور صحت عطا فرمائے۔ آپ کے خط شائع نہیں ہوئے' اس کے لیے معذرت' آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ پڑھ کر ہی رائے دے سکتے ہیں۔
امید ہے کہ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

دعا خان۔۔۔ لاہور

اس دفعہ ستمبر کے شمارے میں سمیرا احمد کی تحریر نے پہلے



نادرۂ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

دل کو مضطرب کیا' پھر قلم کو مجبور کیا کہ اس کے بارے میں کچھ لکھا جائے۔ موضوع' جذبات' الفاظ کا چناؤ بہت ہی بہترین تھا۔ اس کہانی کے اختتامی جملے بہت شان دار تھے۔ انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر باقی رسالے کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے۔ تمام افسانے' ناول' ناولٹ ہمیشہ کی طرح شان دار تھے۔ کرن کرن روشنی میں تہمت لگانا' بددعا دینا وغیرہ موضوع منتخب کرنے کا بہت شکریہ۔

ج :۔ پیاری دعا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید' آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ سمیرا حمید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

اس بار ناولٹ کچھ خاص متاثر نہیں کرسکے۔ البتہ مکمل ناولز نے اس بار بھی ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ جس دن خواتین آیا' اسی دن اللہ کے فضل و کرم سے میری امی

ڈسچارج ہو کر گھر آئیں۔ ایک ہفتہ پہلے میری امی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ایک ہفتے تک امی ہاسپٹلائزڈ رہیں۔ اب مہمانوں کا آنا ان کو کمپنی دینا' ساتھ ساتھ امی کو ٹائم پر میڈیسن دینا' ان کی کیئر کرنا اتنی ٹف روٹین میں خواتین بھی پڑھنا اور خط لکھنے کے لیے ٹائم نکالنا میری ہمت ہے۔ عنیزہ سید اب اس گتھی کو سلجھا ہی دیں کہ شہناز کا قاتل کون ہے۔ "بن مانگی دعا" عون اور ثانیہ کی گیدرنگ لاجواب ہے۔ "یہ نہ تھی ہماری قسمت" تحریر کا ہر جملہ مزاح سے بھرپور تھا' ملک قیصر اور شیرف کی نوک جھونک پسند آئی۔

ج :۔ پیاری مسرت! آپ کی امی کی کامل صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں اور ساتھ آپ کی خوشیوں اور کامیابیوں کے لیے بھی۔ اتنی مصروفیات کے باوجود ہمیں خط لکھا' بہت شکریہ' آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

شیریں ظفر۔۔۔ ملتان

اس ماہ کے خواتین ڈائجسٹ کو میں سال نمبر قرار دوں گی۔ ہر تحریر نے دل موہ لیا۔ خط لکھنے کا سبب "نمل" نمرہ احمد کا بنا۔ تو "عہد الست" کی تنزیلہ ریاض نے بھی چاروں شانے چت کر دیا۔ خلیل الرحمٰن قمر کے انٹرویو نے بھی ایمپریس کیا۔ میں خود بھی خلیل صاحب کی فین ہوں۔ مزے کی بات یہ کہ خلیل صاحب جتنے اکھڑ' بد مزاج' مغرور اور سادہ ہیں' اتنے ہی ان کے کردار اکھڑ' سادہ دل' بد مزاج' صاف گو اور منہ پھٹ ہوتے ہیں۔ نمل کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ایک ایک کردار اچھا لگ رہا ہے۔ نمرہ تو اپنے کرداروں کے نام بھی چن چن کے رکھتی ہیں' جیسے کوئی اپنے بچوں کے نام شوق سے رکھے۔ نمرہ نے کچھ کرداروں کے بچپن کا ذکر کیا تو مجھے بھی اپنا بچپن یاد آگیا۔ "ڈک ہنٹ کھیلنا" کونا کونا کھو کھو Kho Kho بھی مگر نمرہ جیسی ہوشیار لڑکی سے دو چار غلطیاں بھی ہو گئیں۔ جب حنین 13 سال کی بچی ہے اور ماضی میں اورنگ زیب کاردار ان کے گھر ملاقات کرتے ہیں' تب وہ حسن فلموں کے نام گنواتی ہے۔ ان میں سے کچھ فلمیں انداز ا" اس وقت کے بعد کی ہیں اور جب ہم چھوٹے تھے اس وقت Ono کارڈز کی گیم نہیں تھی۔ یہ کافی بعد میں آئی تھی۔ کیونکہ ہم بھی نمرہ جی کے ہیرو' ہیروئن کی عمر کے ہیں۔ (آہم) ہاہاہا۔

تنزیلہ ریاض کے "عہد الست" نے اپنے ٹرانس میں گرفتار ہی رکھا۔ کیا لکھتی ہیں تنزیلہ۔ مجھے سائرہ رضا کے الفاظ یاد آ گئے کہ واقعی چونکنا ہو کر پڑھنا پڑتا ہے ان کو۔ کتنے شفاف خیالات ہیں آپ کے۔ اللہ پاک آپ کو بری نظر سے بچائے۔ سمیرا حمید میری موسٹ فیورٹ رائٹر۔ آپ نے بھرا میلہ لوٹ لیا۔ سمیرا حمید میں تو اشفاق احمد کی روح حلول کر گئی ہو جیسے۔ واقعی ہمارے گھروں کا حال بھی پنڈہا ساں جیسا ہی ہو گیا ہے۔ کیا ہم بھی مہر ثبت ہیں۔ مصباح علی کا "میں بنت جنوں" عدین شاہ کا "پشیمان" اور عتیقہ ایوب کا نوید سحر بھی اچھی تحریریں تھیں۔ مستقل سلسلے بھی تمام زبردست تھے۔

ج :۔ پیاری شیریں! اتنا جامع اور خوب صورت تفصیلی تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ صفحات کی گنجائش ہوتی تو پورا تبصرہ شائع کرتے۔ پچھلے دو ماہ سے آپ کے خط شائع نہیں ہو سکے۔ اس کے لیے معذرت۔ آپ تو ہماری مجبوری جانتی ہیں۔

ام رباب۔۔۔ ملک وال

بہت عرصہ خاموشی سے بیت گیا۔ زندگی کی الجھنیں ہی اتنی تھیں۔ آج یہ' کل وہ۔ کام ختم نہ ہوئے۔ البتہ زندگی بہت آگے نکل گئی۔ عمر چڑھی اور اب ڈھلنے لگی۔ کبھی اس پرچے سے ایسا رشتہ تھا کہ لکھے بغیر اور خاص طور پر تبصرہ کیے بغیر وقت نہ گزرتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب رفعت سراج' میمونہ خورشید' اقبال بانو' بشریٰ رحمٰن لکھا کرتی تھیں۔ پھر سب مصروفیت کی نذر ہوتے ہوئے خواب ہو گیا۔ پڑھتی تو اب بھی تینوں پرچے ہوں' مگر خواتین سے ایک الگ سا احساس ہے۔ بہرحال کامیابی کی اتنی منزلیں بہت بہت مبارک ہوں۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح شان دار چلے آ رہے ہیں اور خاص کر ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی کہانیاں۔ تمام قلم کار ہی داد کے مستحق ہیں۔ عنیزہ کی تعریف کیا کروں۔ نام ہی بہت ہے۔ اور یقین مانو تنزیلہ کی "عہد الست" کیا لکھوں اس کے بارے میں یہ تصوف کی کون سی منزل ہے؟ شاباش! بیٹا زبردست۔۔۔ اس قسط کے پہلے پیرے کا ایک ایک لفظ نقش

ہوگیا۔ نمرہ احمد بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہاں البتہ تنقید معاف کہ ایک پایہ کی رائٹر جس میں اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کا فن ہو' اسے ان صلاحیتوں کو منوانے کے لیے آخر انگریزی لٹریچر کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ نمرہ! آپ میں بے پناہ صلاحیت موجود ہے' مگر اسے اس معاشرے کے طرز زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے باہر نکالیں۔ سمیرا حمید کی "مہر ثبت" واقعی ثبت ہوئی' بہت اچھی کاوش۔ عدن شاہ کا "پشیمان" بس ٹھیک تھا۔ افسانوں میں مصباح علی کا بنت جنون یقین مانیے انتہائی کم صفحات میں بہترین لفظوں کا تال میل اور خاص کر ان کا "قلب جنوں" بھی زبردست تحریر تھی۔ ان سے کوئی بڑی چیز کیوں نہیں لکھواتیں۔ نزہت شبانہ کے "وفا ہر عشق کی بنیاد" ایک درس کی طرح لگی۔ آخری پیراگراف بہت اچھا لگا۔

ج :۔ ام رباب! آپ نے درست لکھا ہے کہ ایک تحریر سے ہی صلاحیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مصباح علی واقعی باصلاحیت ہیں اور ہمیں ان کی پہلی تحریر پڑھ کر ہی اس کا اندازہ ہوگیا تھا۔ نمرہ احمد کے کردار اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عام لوگ نہیں ہوتے غیر معمولی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔

اقرا ملک۔۔۔ گوجرانوالہ

ٹائٹل گرل دیکھ کر خوش ہوگیا دل۔ سب سے پہلے بیوٹی بکس گئی اور ٹوٹکے بھی آزمائے۔ خلیل الرحمن قمر سے ملاقات اچھی نہیں' بہت اچھی رہی۔ نمل تو میں نے پہلی قسط سے نہیں پڑھا۔ تعریف سن کر لگتا ہے پڑھنا پڑے گا۔ مجھے شبانہ شوکت کا تبصرہ اچھا لگا اور دعا کہ اللہ ان کی اولاد کو اچھی صحت عطا فرمائے۔ دوسرا تبصرہ نوشین فیاض کا' میں ان کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ ہر ماں ایسی نہیں ہوتی' بہت سی مائیں اپنی اولاد کے لیے میکے کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ قربانی دیتی ہیں میری ماما نے بھی دی۔ وٹہ سٹہ کی بنا پر سزا کے طور پر سب خاندان والے کہتے تھے کہ اب واپس نہ آنا' لیکن آٹھ ماہ کا انتظار اور ہماری دعائیں رنگ لائیں کہ ماما خود آئیں وہاڑی سے گوجرانوالہ۔ وہ اس لیے کہ میری جوان اولاد ہے' یہ رل جائے گی' آج میں اپنی ماں کو خراج تحسین پیش کرتی ہوں کہ آٹھ سال ہوگئے۔ کبھی میکے کی طرف مڑ کر نہ دیکھا اور نہ کبھی خیر خبر لی' اس دوران نانی' نانا بھی اللہ کو پیارے ہوئے' اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ (آمین) نوشین! آپ دل چھوٹا مت کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیاں دے گا۔

ج :۔ آپ کی ماں نے واقعی بہت سمجھ داری سے کام لیا۔ شادی کے بعد عورت کے لیے اس کی اولاد اور اس کا شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی کتنی مثالیں ہیں کہ عورتوں نے اپنا گھر بچانے کے لیے اپنا دل اور جذبات قربان کردیے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کائنات اصغر بوزدار۔۔۔ ڈہرکی سندھ

ٹائٹل زبردست تھا' کہنی سننی پاکستان اس بحران سے تو نکلا ہے۔ مگر جو نقصانات سیلاب کی وجہ سے ہوئے اور شاید ہوں گے' اس کے لیے سوچنا چاہیے۔ خطوط بیسٹ تھے اور ہوتے ہیں۔ بہت ساری قارئین بہنیں کہتی ہیں کہ انہیں سلسلہ وار ناولز پسند نہیں' مگر مجھے سلسلے وار ناول پسند ہیں جو سالوں تک اپنا اثر رکھتے ہیں۔ ایک ہی قسط کے ناول جتنے بھی طویل کیوں نہ ہوں' پھر بھی مزہ نہیں دیتے۔ ادھر شروع کیا' ادھر ختم' سب واضح' مجھے الجھے ہوئے پُراسراریت لیے ناول پسند ہیں۔ "کوہ گراں تھے ہم" شکر ہے 'ابھی ایک قسط اور بھی ہے۔ یہ وہ ناول ہے جو میں خواتین لیٹ ملنے کی وجہ سے' سب سے پہلے انٹرنیٹ پر پڑھ لیتی ہوں۔ مکمل اور جامع تبصرہ آخری قسط کے لیے۔ "عہد الست" وہ چھوٹا بچہ آگے جا کر نور محمد ہوگا۔ مجھے پہلے سے پتا تھا امائمہ نور محمد کی بہن ہوگی۔ یہ نہیں پتا تھا۔ تنزیلہ آپی! زارا کا ہیرو شہروز کو ہی رہنے دیں۔ میں نے اس سے پہلے آپ کے ناولز کا مجموعہ صراط مستقیم پڑھا ہوا ہے۔ "صد برگ" پڑھنے کی کوشش کروں گی' اگر کہیں سے مل گئی تو پلیز یہ بتادیں کہ نمل کہاں کی کہانی ہے۔

ج :۔ کائنات! نمرہ کی کہانی ترکی یا کسی دوسرے ملک کی نہیں پاکستان کی ہے۔ تنزیلہ ریاض کے ناول کا نام مرگ برگ تھا۔ صد برگ پروین شاکر کا مجموعہ کلام ہے۔ آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

ثمرین زاہرہ۔۔۔ملتان

میں نے آپ کا شعاع اور خواتین اس وقت پڑھنا شروع کیا جب میں آٹھویں میں پڑھتی تھی' اب میری بیٹی نویں کلاس میں پڑھتی ہے۔ اس سے اندازہ لگالیں کہ کتنے سال ہو گئے ہوں گے۔ جب میں "میری خاموشی کو بیاں ملے" والا حصہ پڑھتی ہوں۔ تو قاری بہنوں نے لکھا ہوتا ہے کہ ہم دو یا تین سال سے خواتین یا شعاع پڑھ رہے ہیں' مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ پرانی قاری بہنوں کے لیے تو جگہ نہیں' لیکن نئی بہنوں کے لیے جگہ ہی جگہ ہے۔ نمرہ احمد کا "نمل" اور تنزیلہ ریاض کا "عہد الست" بے حد اچھے اور بہت منفرد ہیں۔ "عہد الست" کے کردار اب واضح ہونا شروع ہو گئے۔ بہت زبردست ان دونوں کی تعریف کے لیے الفاظ کم ہیں۔ تنزیلہ ریاض اب پلیز دوبارہ گم مت ہو جائے گا۔ آپ پلیز تنزیلہ سے بھی کوئی ناول ضرور لکھوائیں۔ اس رسالے نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ خاص کر صبر کرنا اور دوسروں کی باتوں کو برداشت کرنا میں نے ان۔ رسالوں کی کہانیوں سے ہی سیکھا ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ میری بیٹی بھی ان ہی رسالوں سے سیکھے۔

ج:۔ پیاری ثمرین! خواتین کے سلسلے قارئین کی شمولیت کے لیے ہی ہیں۔ ہمیں اپنی تمام قارئین بے حد عزیز ہیں' آپ کا سلسلہ اب تک شامل نہ ہو سکا تو وجہ صفحات کی مجبوری ہو سکتی ہے' یہ بھی ممکن ہے' ہمیں ملا ہی نہ ہو' اگر موصول ہوا ہے تو جلد شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ارم احمد۔۔۔لاوہ

"نمل" کی پہلی قسط سے ہی خط لکھنے کی جستجو میں ہوں' مگر ہائے یہ بیماری اور آپریشن۔ فرصت ملتی ہے تو ہمت دغا دے جاتی ہے۔ آج میں نے ہمت کر ہی ڈالی ہے۔ نمرہ احمد کے قلم سے ایک اور شاہکار ابھر رہا ہے اور یہ سات سال پہلے کی کہانی تو ڈبل مزہ دے رہی ہے۔ یعنی "کبھی ہم میں تم میں قرار تھا" سارے کردار بھی اس قدر خوش اسلوبی سے رہتے ہوں گے' یہ تو پہلی قسط میں سوچا ہی نہ تھا۔ مگر اس بار سسپنس کم ہے اور شکر ہے کہ کم ہے۔ تنزیلہ ریاض جی کی کیا ہی بات ہے۔ نور محمد مجھے آپ پہ ترس آتا ہے اور یہ کیا مومن کی اتنی اعلا پہچان دی بلی کو۔ بل گرانٹ عرف بلی احمد معروف ہے؟ حیرت انگیز ہے اور بہت اچھا بھی ہے۔ مجھے "عہد الست" بہت پسند آرہا ہے۔ میں نے "کوہ گراں" کے آغاز میں بولا تھا نا کہ بعد میں دیکھ لیجئے گا' سعد ہی شہناز کا بیٹا ہے اور آپ نے کہا تھا کہ شہناز تو مراثن ہے۔ سعد کہاں اس کا بیٹا' اب دیکھ لیجئے۔ میں نے درست تجزیہ کیا تھا۔ انعام ملنا بنتا ہے نا؟ سمیرا حمید جی کہاں سے لاتی ہیں ایسے منفرد موضوع آپ؟ کتنا زرخیز دماغ ہے آپ کا' ماشاءاللہ سے۔ مہر ثبت ایک بے مثال تحریر تھی۔ اس تحریر پر آپ کو ایک شیاما تو ملنی بنتی ہے اور ایک عدد ایوارڈ بھی جو کہ بہترین لکھاری کا ہو۔ "وفا ہے عشق" بھی بہت ہی منفرد انداز میں لکھی گئی تحریر تھی' مگر شکر ہے آخر میں رونا نہیں آیا سب اچھا ہو گیا۔ اس قدر پریشانیاں ہیں نا ہر طرف کہ جب کتاب اٹھاؤ اور وہاں بھی پریشانیوں سے لبریز تحریر ہو تو دل بوجھل ہو جاتا ہے۔ دل ہی نہیں ہوتا پڑھنے کا۔ اس دور کے قاری کو جدت اور تنوع کے ساتھ ساتھ مزاح کی بھی شدت سے ضرورت ہے' ہے نا؟ صوفیہ جی آپ کی لکھی کہانی اچھی تھی' ہلکی پھلکی ناولٹ میں امید سحر اچھا تھا۔ باقی تمام سلسلے بھی پسند آئے۔

ج:۔ پیاری ارم! آپ کے آپریشن کا جان کر افسوس ہوا' اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے' آپ نے بیماری کی حالت میں ہمیں خط لکھا' یہ آپ کی محبت ہے۔ اس محبت کی ہمارے دل میں بڑی قدر ہے۔
جہاں تک ہمیں یاد ہے آپ نے خط میں لکھا تھا کہ سعد آپا رابعہ کا بیٹا ہے' رابعہ میراثن ہے جبکہ شہناز تو خدیجہ کی کزن ہے جو بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ شہناز کو میراثن کیسے کہہ سکتے ہیں ہم۔
جی ہاں آپ کی اس بات سے ہم بھی متفق ہیں کہ کہانیاں ہلکی پھلکی ہونا چاہئیں' دکھی کہانیاں نہ صرف دل بوجھل کر دیتی ہیں بلکہ ناامیدی بھی دیتی ہیں جو کفر ہے۔ کیونکہ ناامید اور مایوس ہو کر انسان کوشش ترک کر دیتا ہے۔

رضوانہ صنوبر۔۔۔ جڑانوالہ فیصل آباد

پلیز کوئی ایسا سلسلہ بھی شروع کریں جس میں یادگار واقعات اور سفرنامے ہم لکھ کر بھیجا کریں۔ اب آتی ہوں ناولز کی طرف "کوہ گراں تھے ہم" اور "بن مانگی دعا" بہت

زبردست ہیں اور مکمل ناولز میں "عہد الست" اور نمل بھی بہت اچھے جارہے ہیں۔ مجھے ایک سفرنامہ بذریعہ ڈاک منگوانا ہے۔ "نگری نگری پھرا مسافر" انشاء جی کا' اس کی قیمت آپ نے 225 روپے لکھی ہے اور ڈاک خرچ کتنا بھیجنا ہوگا اور روپے رجسٹری کے ذریعے بھیجنے ہیں یا کوریر کے ذریعہ' ضرور بتایئے گا اور قصص الانبیا اور ایک ناول بھی منگوانا ہے' اس کا خرچ بھی بتادیجئے گا۔ ناول کا نام ہے "اک موسم دل کی بستی کا" رفعت ناہید سجاد کا۔

ج :۔ دس سال بعد آپ کی دوبارہ آمد بہت اچھی لگی۔ شادی کے بعد زندگی نہ صرف مصروف ہوجاتی ہے' بلکہ یکسر بدل بھی جاتی ہے۔ بہت سی چیزیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ آپ کے والد کی وفات کا دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین) انشاء جی کا سفرنامہ اور دیگر کتابیں منگوانے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کرکے قیمت اور منگوانے کا طریقہ معلوم کرسکتی ہیں۔
021-32216361

ماریہ۔۔۔لاہور

حسب معمول آپ کے رسالے مل گئے ہیں۔ شعاع' خواتین' کرن سخت بورنگ کہانیاں۔ آپ کے معیار کو کیا ہوگیا ہے۔ بور ہوگئے ہیں آپ کے افسانے۔ نادیہ امین اور مریم عزیز جیسی رائٹر جن کے ناول اچھے ہوتے ہیں خاص طور پر نادیہ جی۔ پلیز نمرہ جی شروع میں اچھا لکھتی تھیں۔ آپ اب جانے کس طرف نکل پڑی ہیں کہ ان کا ناول ایک صفحہ سے زیادہ نہیں پڑھا جاتا اور وہ قسط وار کہانی ہونے کی وجہ سے ہمارے پیسے ضائع ہوتے ہیں' یہ ہی حال سمیرا حمید کا ہے۔ ہمارے پیسے نہ ضائع کروائیں اور ضرورت سے زیادہ نیکی کا درس دینے والی رائٹر سے بچائیں' کیونکہ اس کے لیے دوسری کتب کثیر تعداد میں ہیں ہمارے پاس۔ آپ کا رسالہ ٹینشن ریلیز کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔

ج :۔ ماریہ! ہمیں بے حد افسوس ہے اور معذرت خواہ بھی ہیں کہ آپ کو ہمارے پرچے پسند نہیں آرہے۔ ہم انہیں مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ پچھلے رسالوں کی بات تو جانے دیں۔ ستمبر کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں تین ناولٹ ہیں' تینوں کا بنیادی موضوع ہلکا پھلکا رومانس ہے اور اس میں کہیں بھی کوئی نیکی کا درس یا نصیحت نہیں ہے۔ نمل میں ابھی تک کوئی نصیحت نہیں آئی یہ ایک معاشرتی کہانی ہے۔ جس میں رشتوں کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ "عہد الست" میں شہروز زارا اور عمر امائمہ کا رومانس ہی ہے۔ آپ کو یہ تحریریں پسند نہیں ہیں' یہ علیحدہ بات ہے۔

نگہت نورین۔۔۔سیالکوٹ

خواتین ملا ٹائٹل دیکھ کر پارہ ہی چڑھ گیا۔ شعاع میں کچھ اور تھا اور اصل میں کچھ اور۔۔۔۔ "پیارے افضل" کے رائٹر اتنے پیارے تو نہ تھے۔ مگر جو بھی تھے' اچھے ہی تھے۔ "جو رکے تو کوہ گراں" مگر پلیز کہانی ختم ہو تو عنیزہ سے کہیے گا کہ ایک دفعہ یہ بلال سلطان اور طیفے کی کہانی پوری ۔۔ سنادیں۔ یا پھر آپ خود ہی۔۔۔۔ باقی آپ پر منحصر ہے۔ "عہد الست" بہت ہی اچھا۔ تنزیلہ کا نظریہ بہت ہی بہترین ویل ڈن۔ نمرہ کا ناول ٹھیک ہے۔ پلیز بتادیں یہ قسط کے شروع میں یہ عہد نامہ کیا ہے؟ ہماری کند ذہنی پر آپ کو ضرور شک ہوگا۔ "بن مانگی دعا" میں اب ابیہا کم اور ثانیہ زیادہ آتی جارہی ہے۔ پلیز ناول کا ان سے کیا تعلق ہے۔ دو اور قسطوں میں ختم کریں۔ عفت جی برا نہ مانیے گا۔ پہلے مزے کا تھا' مگر اب نہیں۔ "یہ نہ تھی ہماری قسمت" سیرف کا انتظار اور وہ بھی شادی کی رات مزہ دینے والا تھا۔ سمیرا حمید کی تصویر دکھادیں اور پلیز دوسری بھی مصنفین کی۔ نوید سحر' روشن صبح بھی اچھے تھے۔ صوفیہ سرور کا بھی اچھا تھا' بہت جی! کیا کہنے مزہ آگیا۔

ج :۔ ٹائٹل دیکھ کر آپ کا غصہ سمجھ میں نہیں آیا۔ شعاع کے اشتہار میں سہوا" وہ دوسری تصویر لگ گئی۔ انسان ہونے کے ناتے۔ کبھی کبھی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ خواتین پر جو ٹائٹل تھا وہ بھی اپنی جگہ بہت دلکش تھا۔ اگر سمیرا حمید نے اپنی تصویر شائع کرنے کی اجازت دی تو ضرور شائع کریں گے۔ عہد نامہ انجیل کا ایک باب ہے۔

سمیعہ' مدیحہ' عمارہ' اقصیٰ' نمرہ اور پھوپھو جانی۔۔۔۔ کراچی

شعاع اور خواتین کی سب رائٹرز بہت عمدہ اور اعلا پائے کی تحریریں پیش کررہی ہیں' لیکن اس دفعہ خط لکھنے کی

وجہ ذرا مختلف ہے۔ جناب ہوا کچھ یوں کہ ہماری پھوپھو حضور جب ہمارے ہاں تشریف لائیں وہ بھی شعاع اور خواتین کی دیوانی ہیں۔ ہم سے ڈائجسٹ لے کر بیٹھ گئیں۔ (اپنے بچے ہمارے حوالے کرکے) جب سارا پرچہ ختم کرکے اٹھیں تو بہت حیرت سے کہنے لگیں "بھئی یہ تمہاری رائٹرز کو کیا ہوگیا' ٹھیک ہے بہت سی سبق آموز کہانیاں ہیں 'لیکن جانے کیوں کچھ کمی سی ہے۔ ایسا ہی ہے ہم بھی اس کمی کو بری طرح سے محسوس کرتے ہیں۔ ہماری رائٹرز بہت ریزرو ہو کر لکھتی ہیں۔ پہلے اسٹوری کا اینڈ تھوڑا لمبا رومانس دکھا کر یا خوش گوار یادوں کو یاد کرکے ہوتا تھا' کچھ آنٹیاں اس طرح کے رومانس یا کچھ اس طرح کے سین کی وجہ سے فورا" تنقید کرنے لگتی ہیں۔ میرے خیال میں سب لڑکیاں بہت میچور ہو چکی ہیں اور انٹرنیٹ' ٹی وی' موبائل کی وجہ سے اب کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہا۔ ایسے میں اگر اسٹوری کا اینڈ تھوڑے رومانس کے ساتھ کردیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ تمام رائٹرز سے ہماری گزارش ہے کہ پلیز پرانا انداز ہمیں لوٹائیے' ہمیں جو کمی محسوس ہوئی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ بہت اچھا لکھا جارہا ہے' لیکن پلیز کہانیوں کا رومانس لوٹائیے' بہت عرصہ ہوا کوئی رومانٹک کہانی پڑھے ہوئے۔

ج :۔ سمیعہ' مدیحہ' اقصیٰ' نمرہ اور آپ سب کی پیاری پھوپھو جانی! آپ کا شکوہ ہم مصنفین تک پہنچا رہے ہیں' لیکن اگر آپ غور کریں تو زیادہ تر کہانیاں رومانٹک ہی ہوتی ہیں۔ ستمبر کے شمارے میں تین ناولٹ اور دو مکمل ناول رومانس پر ہی مبنی ہیں۔

اسماء کرن۔۔۔ بھکر

اس ماہ قسط وار کے علاوہ جو سب سے اچھا ناولٹ لگا وہ عتیقہ ایوب کا نوید سحر تھا۔ واقعی ماں' باپ کی لڑائیاں بچوں میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور چھوڑ دیتی ہیں۔ عنبرین اعجاز کا روشن صبح افسانہ بھی بہت پسند آیا۔ نزہت شبانہ حیدر کا ناولٹ "وفا ہے عشق کی بنیاد" اس کا موضوع تو اچھا تھا' لیکن معذرت کے ساتھ اس کو پڑھتے وقت میں بور بھی ہوئی۔ راؤ سمیرا ایاز کا ناولٹ "یہ نہ تھی ہماری قسمت" اچھا تھا۔ عدن شاہ کا پشیمان بھی بہت اچھا تھا اور مصباح علی کا ۔"بنت جنوں" بھی ہمیں بہت کچھ سکھا گیا۔ صوفیہ سرور کا شکایت عرض ہے' بہت دلچسپ تھا۔ آلو کے پکوان میں کباب پسند ہیں۔ پلیز مجھے کوفتے بنانا سکھادیں۔

ج :۔ اسماء خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ کوفتوں کی ترکیب دی جارہی ہے۔

فریحہ شبیر۔۔۔ شاہ نکڑد

دیر سے آنے کی وجہ یونیورسٹی کی نف پڑھائی اور ہاسٹل کی مصروفیات' بات کروں گی صرف نئی رائٹرز کی تو بہت سی نئی رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ خصوصا" حیا بخاری' ثمیرا حمید' قرۃ العین ہاشمی تو میری ٹاپ لسٹ میں شامل ہو گئی ہیں۔ سائرہ رضا' ان کی جو بھی تحریر پڑھی' دل پر نقش ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ "اب کر میری رفوگری" اس تحریر کو پڑھ کر دو ہفتے مسلسل کرب میں مبتلا رہی اور اب ایک اور تحریر "محبت داغ کی صورت" نے جکڑ لیا۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کی ہر تحریر دریا کو کوزے میں بند کرنے والی مثال۔ ثمیرا حمید کی ہر تحریر' پراثر' پرسوز' سبق آموز' دلفریب تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ جائیں' مگر حق ادا نہ ہو۔

ج :۔ پیاری فریحہ! آپ نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ نئی مصنفین بلاشبہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ آگے چل کر مزید اچھا لکھیں گی۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بریرہ راجپوت۔۔۔ نوکوٹ سندھ

مجھے خواتین ڈائجسٹ چاہئیں جنوری 2014ء سے مئی 2014ء تک کے' مجھے مل سکتے ہیں کیا؟ اور پرائس (قیمت) بتا دیں۔ ہاف ہوگی یا فل۔ ستمبر کا خواتین اچھا تھا۔ میں ایک بات کہنا چاہوں گی کہ خواتین میں مکمل ناول زیادہ ہونے چاہئیں۔ افسانے کم۔ نزہت شبانہ حیدر کی کہانی سمجھ میں نہیں آئی۔ کہانی میں راہ میر کی شادی کس سے ہوتی ہے' باقی ساری کہانیاں اچھی تھیں۔

ج :۔ پیاری بریرہ! آپ 300 روپے منی آرڈر کردیں۔ آپ کو خواتین 14 جنوری سے مئی 14 تک کے شمارے بھجوا دیے جائیں گے۔ منی آرڈر فارم پر اپنا درست پتا لکھیں اور اس پر یہ بھی تحریر کریں کہ آپ کو کون سے شمارے درکار ہیں۔ منی آرڈر اس پتے پر بھجوائیں ۔خواتین ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی۔ خط آپ نے بالکل درست لکھا ہے۔ تعارف شائع ہو جائے گا' لیکن غزل کے لیے معذرت' آپ کی غزل قابل اشاعت نہیں ہے۔

غزالہ غفور۔۔۔ گجرات (گاؤں جوڑا)

ٹائٹل پر معصوم سی ماڈل پھولوں کے ساتھ بہت اچھی لگی۔ آٹھ سال سے آپ کی خاموش قاری ہوں۔ سلسلے وار ناول "بن مانگی دعا" پلیز عفت سحر جی ناول کو لمبا مت کیجئے گا۔ نمرہ احمد کا "نمل" تو اس پرچے کی جان ہے' پلیز آپی سعدی یوسف کے ساتھ کچھ برا مت ہو' ورنہ ہمارا دل رو پڑے گا۔ "عہد الست" میں آخر سارے راز کھل ہی گئے۔ نور محمد اور امائمہ بہن' بھائی نکلے اور نور محمد کا دوست احمد معروف وہ تو بلی نکلا۔ ہاہاہاہا واہ مزہ آگیا۔

ج :۔ پیاری غزالہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ آٹھ سال سے قاری ہیں اور خط اب لکھا۔ اتنی تاخیر کیوں؟

سنبل ملک۔۔۔ لاہور

مجھے نفسیاتی ازدواجی الجھنیں جو عدنان انکل بہت ہی عمدہ اور خوب صورتی سے حل کرتے ہیں۔ مگر میرے دل کی ایک آواز جو کہ میں دبا نہیں سکی' مجھے ساری رات ڈسٹرب کرتی رہی کہ۔۔۔۔ ع۔ ص کراچی جنہوں نے خط لکھا اور عدنان بھائی نے اسے ایدھی سینٹر یا پھر انصار برنی ٹرسٹ میں پناہ لینے کی ہدایت کی ہے تو میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر حلفاً" کہہ رہی ہوں کہ وہ میرے پاس میرے گھر آجائیں۔ میرے گھر میں صرف میری مما ہوتی ہیں۔ بڑا بھائی سسرال' چھوٹا بھائی بیوی کے ساتھ علیحدہ رہتا ہے۔ میرے پاپا بھی میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ شفٹ ہو گئے ہیں۔ میری مما کی کمپنی میں وہ بہت سکون محسوس کریں گی۔ کوئی ان کو طعنے نہیں دے گا۔ گھر سے نہیں نکالے گا۔ یہ گھر میری مما کے نام ہے۔ (کرایہ کا نہیں) وہ بہت محبت' پیار دیں گی۔ بے شک میں غریب ہوں' مگر میں ان کی ہر ضرورت پوری کروں گی' عزت و احترام کے ساتھ۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ہم صرف دکھ سننے والے نہ بنیں۔ اگر ہوسکے تو مداوا بھی کریں۔ وہ لاہور ریلوے اسٹیشن تک آجائیں' میں خود ان کو اسٹیشن سے لے لوں گی۔

ج :۔ سنبل! آپ کا جذبہ قابل قدر ہے۔ آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے بہن ع۔ ص تک پہنچا رہے ہیں۔

صالحہ محبوب۔۔۔ خانیوال

خواتین کے معیار اور ادبی گہرائی کی معترف بھی دل سے ہوں۔ کئی مرتبہ عمیرہ احمد' سائرہ رضا' تنزیلہ ریاض کی تحریروں نے تعریف کرنے پر مجبور کیا۔ مگر وہی سستی اور کاہلی' جو شاید ہمارا قومی مزاج بھی ہے اور تعریف میں کنجوسی۔ ستمبر کا خواتین ڈائجسٹ اس مرتبہ خاص ہے۔ پہلے تو تنزیلہ ریاض کے "عہد الست" میں بن یافع کے کردار اور ناول نگاری کے گر ہمیں متاثر کرتے رہے۔ اس کیفیت سے نکلنے کے بعد سمیرا حمید کا افسانہ "مہر ثبت" ہمارے سامنے آیا۔ جس کی تعریف کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی ہوں۔ بیس سال پہلے ایم اے انگلش کرتے وقت ایک ڈراما " Waitiug For Godot " پڑھا تھا۔ ہمارے پروفیسر صاحب نے تعارف میں بتایا کہ جب یہ ڈراما تھیٹر میں پیش کیا گیا تو ناظرین دم بخود ہو کر اسے دیکھتے رہے اور جب یہ ختم ہوا تو لوگ چیخیں مارتے ہوئے باہر نکلے۔ یقین مانیں سمیرا حمید! کل رات سے آپ کا افسانہ پڑھا ہے اور چیخیں ہیں کہ دل سے بھی نکل رہی ہیں' احساسات سے بھی اور جذبات سے بھی۔

یہاں پنڈ باساں کو اگر پاکستان سے تشبیہ دی جائے' شیاما کو اس کی نعمتوں سے دریا' پہاڑ' معدنیات' تیل' کوئلہ گیس' زرخیزی' موسم' میووں سے' اس کے دودھ سے ان نعمتوں کا عوام الناس پر اثر تو وہاں کے لوگوں کے رویے خود بخود ہماری سمجھ میں آجاتے ہیں۔ یہ چنگیریں ہماری خواہشات اور حسرتیں ہیں۔ ہم انہیں بھر بھر کر بھی سیر

سانحہ ارتحال

اشفاق حسین زرگر صاحب کی والدہ محترمہ طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

نہیں ہو رہے۔ بے برکتی، بے حسی، معاشرے کے ہر طبقے میں رچ بس چکی ہے اور لالچ اور طمع میں ہم نے سہولتیں تو پالیں، مگر خود پر مہر بھی لگوالی ہے۔ کہانی کا پہلا پیرا گراف آخر میں سمجھ میں آیا اور بالکل وہی رد عمل ہوا جو انیسویں صدی کے ڈرامے Waitiug For Godot کے بعد ہوا تھا۔

یہ شمارہ ادبی دنیا میں ڈائجسٹ کی کہانی نگاری کے قدم مضبوط ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ یہ یقیناً" آپ کے ادارے اور کہانی نگار کی بہترین کامیابی ہے۔

ج :۔ پیاری صالحہ! آپ نے کہانی کی اتنے خوب صورت انداز میں تعریف کی اور اتنی گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا۔ ہمیں اپنی قارئین پر فخر ہے۔ ہماری قارئین اعلا تعلیم یافتہ ہوں یا کسی چھوٹے شہر یا گاؤں میں رہنے والی معمولی پڑھی لکھی بہت ذہین اور باشعور ہیں۔ پاکستان سے تشبیہہ بھی بہت عمدہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے پاکستان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ لیکن ہم شکر نہیں ادا کرتے، پاکستان کی برائیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، علیحدگی کی باتیں کرتے ہیں، نفرتیں پھیلاتے ہیں، کبھی زبان کے نام پر، کبھی فرقوں کے نام پر اور کبھی مذہب کے نام پر..... سچ تو یہ ہے کہ ہم سب کو اجتماعی استغفار کی ضرورت ہے۔

عائشہ نواز..... نیا لاہور

واہ مزہ ہی آگیا۔ کیا زبردست ناول لکھا ہے نمل۔ نمرہ جی آگے والی قسط آنے کا شدت سے انتظار ہے، بہت افسوس سے کہنا پڑھ رہا ہے کہ قیمت اتنی زیادہ ہے میں تو غریب ہوں بھئی میں تو نہیں لے سکتی میری آپی اقصیٰ ہیں جو میری استاد بھی ہیں وہی خریدتی ہیں اور پڑھ کر ہمیں دے دیتی ہیں، میں اتنا کہوں گی کہ شعاع اور خواتین کے بغیر زندگی ادھوری ہے ہم پانچ بہن بھائی ہیں میں سب سے بڑی ہوں اس لیے سارا گھر کا کام بھی کرنا پڑتا ہے اور سلائی بھی سیکھتی ہوں، کیونکہ محتاجی بری چیز ہے، میں نے میٹرک کیا ہے، باقی سب بہن بھائی پڑھتے ہیں۔ میرے ابو بہرے ہیں اور بولتے بھی نہیں وہ بہت اچھے کسان بھی ہیں۔ اب ہم سب بہن بھائی کام کرتے ہیں اور اپنا خرچا خود اٹھاتے ہیں۔ اب مجھے آگے کوئی نہیں پڑھنے دیتا۔ امی بھی بیمار رہتی ہیں مگر انسان کرے بھی تو کیا ہم غریب لوگ دکھوں میں ہی رہ گئے، ہماری پھوپھو اور دادا جان ہماری سپورٹ کرتے ہیں پہلے میں بہت ٹینشن لیتی تھی، مگر شعاع اور خواتین نے مجھے باشعور بنایا اب میں پریشان نہیں ہوتی بلکہ صبر کر لیتی ہوں۔

ج :۔ پیاری عائشہ! آپ کے حالات جان کر افسوس ہوا، لیکن خوشی کی بات یہ ہے آپ لوگ محنت کر کے اپنے حالات بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں، آپ کے بہن بھائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپ سلائی سیکھ رہی ہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد اچھا وقت آئے گا۔ آپ کوشش جاری رکھیں، ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حنا ارشد فیض..... کراچی

آپی میرے میاں صاحب کہتے ہیں کہ آج تک کبھی تمہارا کوئی ایک خط یا کوئی انتخاب بھی شائع ہوا؟ (مذاقاً") پچھلے سال امی داغ مفارقت دے گئیں۔ اس سانحے کو بھی میں نے تین ماہ پہلے آپ سے ایک طویل خط لکھ کر رو رو کر شیئر کیا تھا۔ (کوئی مداوا نہیں غم کا۔ سنے کون قصہ درد دل۔ میرا غمگسار چلا گیا)۔ شادی کے بعد شوہر کی تعریفیں لکھیں کہ اتنے اچھے ہیں سچی۔ مجھے خود ڈائجسٹ لا کر دیتے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے اولاد کا بتایا۔ کسی نے مبارک باد نہیں دی۔ دو بیٹیوں کے بعد بیٹا آیا۔ اس وقت ہم سفر کی آخری قسط پڑھی تھی، یہ بھی یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ تب بھی قلم کے رشتے داروں (قلمی رشتوں) کی طرف سے کسی نے.....؟ "خواتین" سے صرف اور صرف پڑھنے کا رشتہ ہے یہ بھی بہت ہے۔

خطوط میں نوشین فیاض نہ جانے کیوں بہت اپنی اپنی سی لگیں۔ ثناء رحمن کی باتوں سے ایک دم ہنسی چھوٹ گئی۔ سرمہ لگانے اور مسکارا لگانے والی بات پر۔ ہاں ایک چیز نے بہت تکلیف دی۔ "نفسیاتی الجھنیں" میں پہلے خط کو پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا جس ذات کو، اسلام نے معتبر کیا اس کی اپنوں کے ہاتھوں ایسی تحقیر ایسی ناقدری۔ نمل کے بارے میں کہنا چاہوں گی ویسے میں تمام قسط وار ناولوں کو چھ ماہ تک جمع کر کے پھر آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کرتی ہوں۔ یہ میرا اپنا طریقہ ہے مگر نمرہ کے تمام ناولز میں پہلی قسط سے پڑھتی ہوں۔ انٹرویو پسند آیا اور عاصمہ جہانگیر سے ملاقات بھی اچھی لگی۔ پکوان زبردست تھے، آلو پسند نہیں مگر پھر

بھی اچھے لگے۔

ج :۔ ہماری طرف سے دلی معذرت قبول کریں۔ آپ کی خوشیوں کو شیئر کرسکے نہ آپ کے غم میں شامل ہوسکے۔ آپ کے خط ہمیں موصول نہیں ہوئے صرف ایک خط ملا جو تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہوسکا۔

ماں جیسی نعمت کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر اور آپ کی والدہ کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین۔

شادی پر آپ کو مبارک باد نہ دے سکے، لیکن آپ کو اس بات کی مبارک باد ضرور دیں گے کہ آپ کے شریک سفر بہت اچھے ہیں، آپ کا خیال رکھتے ہیں، آپ کے مشاغل میں دلچسپی لیتے ہیں، یہ بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ آپ کے بچوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بچوں کو کامیابیوں سے نوازے۔ آمین۔

بائیس سال سے آپ ہماری ساتھی ہیں اس ساتھ کو نبھانے کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

ثنا عبدالقیوم..... بنگہ جیمہ

اس ماہ کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ پیارے افضل کے رائٹر کا صاف گو انداز بہت پسند آیا۔ نمرہ آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے..... تنزیلہ ریاض کا ناول بھی بہت اچھا جارہا ہے۔

نجبہ اکرم..... گاؤں گولیکی

اس دفعہ تنزیلہ ریاض نے کمال کا لکھ دیا۔ سارے کردار سمجھ میں آگئے۔ سمیرا حمید کی کہانی بھی زبردست رہی، نفسیاتی الجھنوں میں عدنان بھائی کے مشورے بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

نادیہ عابد..... بھوماں باٹھ

میں پندرہ سال سے خواتین، شعاع اور کرن پڑھ رہی ہوں لیکن ہمارے گاؤں میں ڈاک کی سہولت نہیں ہے۔ خواتین کے سارے سلسلے بہت اچھے ہیں۔ خاص کر کرن کرن روشنی اور عفت سحر کا بن مانگی دعا بہت پسند ہیں۔

ج : بہت شکریہ نادیہ! آپ کی رائے جان کر بہت خوشی

رخسانہ کلسھو ٹو..... لاڑکانہ

میں پندرہ سال سے خواتین اور شعاع پڑھ رہی ہوں۔ آپ لوگوں سے دل کا رشتہ ہے۔

ج : رخسانہ جی ہمارا بھی آپ سے دل کا رشتہ ہے۔ تب ہی ہماری انتخاب کردہ تحریریں آپ کو پسند آتی ہیں۔



قارئین متوجہ ہوں!

1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہر گز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔

خبریں وبریں

واصفہ سہیل



سامنے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔

خطرہ

ایک نئی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ خواتین جو کہ پچاس سال یا اس سے زیادہ عمر کو پہنچ گئی ہیں' وہ کیلے کھاکر فالج کے خطرے کو گھٹا سکتی ہیں۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جن غذاؤں میں پوٹاشیم کی مقدار زیادہ ہوتی ہے' وہ فالج کے اسٹروک کا امکان ایک چوتھائی حد تک کم کردیتی ہیں۔ اس لیے خواتین کو چاہیے کہ ان غذاؤں پر زیادہ توجہ دیں'جن میں پوٹاشیم کی مقدار زیادہ ہو۔ جیسے آلو' شکرقندی' کیلے اور سفید پھلیاں' لیکن یاد رہے کہ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ پوٹاشیم کی بہت زیادہ مقدار لینے سے دل کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

متاثر

میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمان اور یوون شنکر راجا کے بعد مونیکا (رحیمہ) اسلام لائیں اور اب تامل فلموں کے نوجوان اداکار "جے" کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ بھی مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں۔ جے جو یوون شنکر کے دوست ہیں۔ ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد قرآن پاک کا مطالعہ کرنے پر اس کی تعلیمات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کر بیٹھے۔ لیکن "جے" معاشرے اور خاندان کے خوف سے اس بات کو میڈیا کے سامنے نہیں لا رہے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ مناسب وقت کا انتظار کررہے ہیں۔ دیکھنے والوں نے پچھلے دنوں جے کو چنائے کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور گزشتہ رمضان میں جے نے پورے روزے بھی رکھے ہیں۔ دیکھتے ہیں مونیکا (رحیمہ) کی طرح وہ کب میڈیا کے

ضد



پچھلا مہینہ اس لحاظ سے خاص رہا کہ ہماری بہت سی فنکارائیں ماں کے عہدے پر فائز ہوئیں تو لوگوں نے لگے ہاتھوں ریما کو بھی اس لائن میں کھڑا کر دیا کہ

ریما کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے۔ اس پر ریما نے کہا کہ ان لوگوں کے منہ میں گھی شکر جنہوں نے یہ خبر اڑائی ہے، لیکن فی الحال ایسی بات نہیں ہے۔ فلموں کے بارے میں ریما نے بتایا کہ وہ دو، تین پروجیکٹ پر کام کر رہی ہیں۔ ایک فلم کے لیے انہوں نے خلیل الرحمٰن قمر (پیارے افضل والے) سے فلم کے ڈائیلاگ لکھوانے کی بات کی تھی، لیکن خلیل الرحمٰن قمر نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ وہ ہمایوں سعید کے علاوہ بھی کچھ پروجیکٹس پر کام کر رہے ہیں۔ اس لیے وقت نکالنا مشکل ہوگا۔ اس پر ریما کہتی ہیں کہ "اگر کوئی میری فلم لکھے گا تو وہ خلیل الرحمٰن قمر ہی ہوں گے۔ اگر وہ فلم نہیں لکھیں گے تو میں فلم ہی نہیں بناؤں گی۔" (ریما! خلیل الرحمٰن قمر کا مزاج جانتی ہیں آپ؟) میرا ان سے صرف ڈائریکٹر، رائٹر کا ہی رشتہ نہیں۔ ان کے ساتھ میرا بہت مضبوط رشتہ ہے۔



(ہائیں! کیا اس کے علاوہ بھی کوئی رشتہ ہے) میں ان کے گھر اپنی دعوت میں پکے آلو گوشت اور تندوری روٹی کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں کام کروں گی تو خلیل الرحمٰن کے ساتھ ہی کروں گی۔ ہمایوں کی فلم لکھنے کے بعد وہ میری فلم لکھیں گے۔"

زیرو یا ہیرو

اداکار فواد خان (ہم سفر فیم) پاکستان میں تو بڑے اکڑے اکڑے نظر آتے ہیں۔ (بھئی اپنے گھر میں سب ہی شیر ہوتے ہیں۔) یوں جیسے گردن میں سریا لگا ہو۔ اپنی اداکاری اور پُراعتماد پرسنالٹی کے باعث وہ بھارتی فلم انڈسٹری کی نظروں میں بھی آگئے اور پھر ان کو فلم بھی مل گئی۔ لیکن اس فلم کی پبلسٹی کے لیے جب فواد خان بھارتی ٹی وی چینلز پر نظر آئے تو بہت جھینپے جھینپے ـــــ سے لگ رہے تھے۔ (شاید ان سے متاثر ہو گئے ہوں۔گے نا) فواد کا کہنا ہے کہ "وہ بولی ووڈ میں بہت احتیاط سے قدم رکھ رہے ہیں۔ انہیں بولی ووڈ میں کام کرنے کی کوئی جلدی نہیں، بلکہ وہ اپنی فلم پر شائقین کا ردعمل دیکھ رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔" کرینہ کپور کے ساتھ فلم کے بارے میں انہوں نے کہا، "کہ مجھے ایسی کوئی آفر نہیں



آئی ہے۔" (افوہ فواد! اور لوگوں کو کون سا آتی ہے کہنے ڈس کیا جاتا ہے۔)

احسان

نعیم عباس روفی کا کہنا ہے کہ کراچی کے اچھے حالات کے لیے ہر شخص دعا گو ہے۔ ایک دور تھا کہ ہم ایک رات میں کئی کئی شوز میں پرفارم کرتے تھے اور صبح ہو جاتی تھی اور آج یہ حالات ہو چکے ہیں کہ فنکار شوز کے انتظار میں بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ ان حالات کے باوجود میں کراچی چھوڑ کر جانے کا تصور نہیں کر سکتا۔ البتہ ملک کے دوسرے شہروں میں شوز کرنے کے لیے جاتا رہتا ہوں۔ کراچی میرا اصل گھر ہے۔ اس نے مجھے عروج دیا۔ (عروج تو اس شہر کا امن خراب کرنے والوں کو بھی اس شہر نے ہی دیا مگر.....؟) اس شہر کا احسان میں بھی نہیں اتار سکتا۔ (کوئی بھی نہیں اتار سکتا جناب!)

کچھ اِدھر اُدھر سے

مرے نشیمن کے چار تنکے بھی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں
کئی بار برق گر چکی ہے، کئی بار جلا چکا ہوں

ہم جب بھی یہ شعر پڑھتے ہیں تو پاکستان کی پوری تاریخ یاد آجاتی ہے۔ وہ تاریخ جس میں بدلا ہوا جغرافیہ بھی شامل ہے۔

(علی خان..... جسارت)

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ 63 سال میں ماڈل ٹاؤن سے بڑا ظلم نہیں ہوا۔ ظاہر ہے مولوی صاحب کی نظر میں 12 مئی کو کراچی میں مرنے والے 60 افراد انسان تھے، نہ لال مسجد میں زندہ جلائی جانے والی تین ہزار بچیاں انسان تھیں، نہ وہ سو سے زیادہ افراد انسان تھے، جو بلوچستان میں اکبر بگٹی شہید کے ہمراہ بمباری کر کے شہید کر دیے گئے۔

(عبداللہ طارق سہیل..... نئی بات)

اسکول ہمارے گھر سے آٹھ کلومیٹر دور تھا۔ ایک دن اسکول جانے کے لیے جوتے پاس نہیں تھے۔ پیسے مانگنے کے لیے ماں کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا، رو رہی ہے۔ ننگے پاؤں اسکول روانہ ہوا۔ اسکول میں دوستوں کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لیے کہا کہ کسی میں اتنی ہمت ہے، جو آٹھ کلومیٹر ننگے پاؤں چل سکے؟

(امیر جماعت اسلامی سراج الحق صاحب)

شاہ محمود قریشی کے بھائی مخدوم مرید حسین قریشی نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی سے بڑا جھوٹا شخص نہیں دیکھا۔

(عبداللہ طارق سہیل..... نئی بات)

کراچی کے جلسے پر سب سے دلچسپ تبصرہ شیر شاہ سے آنے والے ایک پٹھان جمعہ گل نے کیا۔ امت کے رپورٹر نے اس سے سوال کیا۔ "عمران خان کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے؟" وہ بولا۔
"رونق میلے کے لیے ٹھیک ہے، مگر ووٹ ہم مولوی صیب کو دے گا۔" (روزنامہ..... امت)

محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے آخری چند سال میں درویش بن گئی تھیں۔

(جاوید ہاشمی کا بیان)

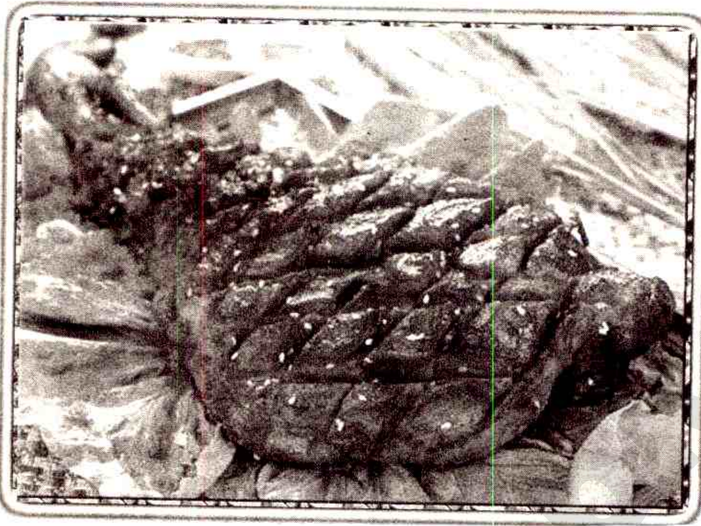
جب بھی کیانی صاحب سے ملاقات ہوتی، زرداری صاحب ایک ہی سوال کرتے۔ فرمایئے بھائیوں کے "کاروبار" کیسے جا رہے ہیں۔ کیانی صاحب ہر بار ایک سرنگوں مسکراہٹ پر اکتفا کرتے۔ کہا جاتا ہے۔ یہ کاروبار زرداری کے 30 برسوں کے کاروبار پر بھاری تھا۔

(عبداللہ طارق سہیل..... نئی بات)

☆ عمران اور طاہر القادری الردن میں ایک سے زیادہ بار تقریر کریں تو ہر بار ان کو براہ راست دکھایا جاتا ہے۔ گویا پورا ملک ان کی شعلہ بیانی کا گواہ ہے۔ پتا نہیں پاکستان کے علاوہ کتنے دوسرے ملک ہیں جہاں کا میڈیا اس نوعیت کی خطرناک بمباری کر سکتا ہے۔

(غازی صلاح الدین..... خواب اور عذاب)





دسترخوان سجائیں ہمارے ساتھ

صبا سحر

اسپیشل ران

ضروری اجزا :

مٹن ران	ایک عدد
دہی	ایک کپ
سرکہ	چار کھانے کے چمچے
سرخ و سیاہ مرچ	ایک ایک کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	چھ کھانے کے چمچے
پکھری پاؤڈر ہلدی	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

مٹن لیگ کو اچھی طرح دھو کر کانٹے کی مدد سے گود لیں۔ دہی میں تمام مسالا جات اچھی طرح مکس کرلیں۔ پیاز بھی پیس کر شامل کردیں۔ لیگ پیس پر اچھی طرح آمیزہ لپیٹ کر تقریباً" آٹھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں' پھر تیل گرم کرکے مسالا لگی ران کو ہلکی آنچ پر دو گھنٹے پکائیں۔ پھر پلٹ کر دوسری سائیڈ پکائیں۔ آنچ کا خاص خیال رکھیں۔ بالکل دھیمی آنچ پر بغیر پانی شامل کیے پکانا ہے۔ دونوں طرف سے پک جائے تو کوئلے کا دھواں دیں۔ لیموں کا رس چھڑک کر رائتے اور نان یا چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

بہاری بریانی

ضروری اجزا :

گوشت	ایک کلو
چاول	ایک کلو
پسا گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
لیموں	ایک عدد
دہی	آدھا کپ
پیاز، ٹماٹر	دو، دو عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

گوشت کی چھوٹی چھوٹی (تقریباً" ایک انچ کی) بوٹیاں کرلیں۔ دہی میں لہسن ادرک پیسٹ، کچری پاؤڈر، سرخ مرچ، پسا گرم مسالا اور نمک ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں پھر گوشت میں ملا کر تقریباً" تین گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ دیگچی میں تیل گرم کرکے مسالا لگے گوشت کو ڈال دیں۔ ساتھ ہی آدھا کپ پانی شامل کرکے پکنے کے لیے ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو بھون لیں۔ الگ دیگچی میں چاول کو ثابت گرم مسالا، نمک اور ایک چمچہ تیل ڈال کر ابال لیں۔ ایک کنی رہ جائے تو نتھار لیں۔ اب ایک بڑی دیگچی میں سالن اور چاول کی تہہ لگائیں۔ درمیانی تہہ میں ٹماٹر اور لیموں کے پتلے سلائس کاٹ کر کتری ہوئی ادرک، لچھے دار پیاز، کترا ہوا دھنیا، پودینہ اور مرچ بچھا دیں۔ چاول کے اوپر ایک چھوٹا روٹی کا ٹکڑا لے کر اس کے اوپر ایک دہکتا ہوا کوئلہ رکھ دیں۔ کوئلے پر تھوڑا سا گھی بھی ڈال دیں تاکہ دھواں نکلے پھر فوراً" ڈھکن بند کرکے دم پر لگا دیں۔ پہلے تیز آنچ رکھیں پھر دس منٹ کے بعد ہلکی آنچ پر دم دیں۔ مزے دار بہاری بریانی تیار ہے۔

پسندہ کڑاہی

ضروری اجزا :

گوشت	ایک کلو
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	ڈیڑھ پاؤ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

گوشت کے پسندے بنوا لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے لہسن ادرک پیسٹ اور پسندے ڈال کر فرائی کریں۔ نمک، سرخ کٹی مرچ، ثابت دھنیا کوٹ کر اور ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے) ڈال کر مکس کریں۔ ٹماٹر گل جائیں تو بھون لیں اور تھوڑا سا پانی شامل کرکے ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ پسندے گل جائیں تو پھر بھونیں، تیل اوپر آجائے تو لیموں کا رس، ہری مرچ اور ادرک باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

پشاوری چپلی کباب

ضروری اجزا :

قیمہ	ایک کلو
لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
انڈا، پیاز	دو، دو عدد
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
دھنیا، مرچ	ایک، ایک کھانے کا چمچہ
انار دانہ	دو کھانے کے چمچے
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمے کو سل پر بہت باریک پیس لیں۔ تمام مسالے کوٹ کر اس میں ملا دیں۔ انڈے بھی پھینٹ کر ڈال دیں۔ اچھی طرح مکس کرکے تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ گوندھیں اور ہتھیلی پر رکھ کر چوڑے اور بڑے کباب بنائیں اور ہلکے تیل میں تل لیں۔ رائتے کے ساتھ مزے دار چپلی کباب پیش کریں۔

اسپیشل چانپ

ضروری اجزا :

چانپ	دس عدد
کارن فلیکس	ایک کپ
میدہ، کارن فلور	آدھا آدھا کپ
انڈے	دو عدد
پسی کالی مرچ	چار چائے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

چانپوں میں لہسن ادرک پیسٹ، کالی مرچ، چھ سات ہری مرچ اور نمک ڈال ابال لیں۔ چانپیں گل جائیں تو ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں کارن فلور، انڈے، میدہ، نمک اور ایک کھانے کا چمچہ تیل ڈال کر گاڑھا سا پیسٹ بنا لیں۔ چانپوں کو اس آمیزے میں ڈبو کر کارن فلیکس میں کوٹ کریں اور گرم تیل میں تل لیں۔ مزے دار اور منفرد اسپیشل چانپ تیار ہے۔ رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

ضیافتی پلاؤ

ضروری اجزا :

ران کا گوشت	ایک کلو
چاول	ایک کلو
دہی	آدھا پاؤ
پیاز	چار عدد
لہسن	ایک پوتھی
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
کشمش، چار مغز	دو، دو کھانے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

گوشت دھو کر چار گلاس پانی ڈال کر چولہے پر چڑھادیں۔ ایک کپڑے کی تھیلی میں ثابت دھنیا، سونف، لہسن، دار چینی اور ایک پیاز اور ثابت گرم مسالا ڈال کر گوشت کے ساتھ پکائیں۔ اس کے بعد گوشت نکال کر الگ کرلیں اور یخنی چھان کر الگ رکھ لیں۔ ایک دیگچی میں پیاز سنہری کریں، پھر اس میں ابلا ہوا گوشت ڈال کر بھونیں۔ براؤن ہوجائے تو بوٹیاں نکال کر الگ رکھ لیں۔ اب اس میں دہی پھینٹ کر ڈالیں۔ ثابت گرم مسالا اور چار کپ تیار کی ہوئی یخنی ڈال کر ڈھک دیں۔ ابلنے لگے تو چاول ڈالیں۔ گوشت بھی شامل کردیں۔ چاول دو کنی رہ جائیں تو اس میں چار مغز اور کشمش چھڑک کر خشک کپڑا ڈھکن پر لپیٹ کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار ضیافتی پلاؤ تیار ہے۔

بہاری مسالا بوٹی

ضروری اجزا :

گوشت	ایک کلو
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد
دہی	آدھا کپ
بہاری بوٹی مسالا	چھ چائے کے چمچے
کچری پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

گوشت کی بوٹیاں بنالیں اور دھو کر اچھی طرح خشک کرلیں۔ پیاز، ہری مرچ پیس کر اور دیگر مسالے گوشت میں مکس کرکے تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں، پھر سیخوں پر چڑھا کر کوئلوں پر سینکیں۔ تھوڑا تھوڑا تیل لگاتی جائیں یا ہلکے تیل میں فرائی کرکے کوئلہ کا دم دے دیں۔ لچھے دار پیاز اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

دم کلیجی

ضروری اجزا :

بکرے کی کلیجی	ایک عدد
ثابت لہسن	چھ جوے
لیموں	دو عدد
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

تھوڑے سے تیل میں چھ سات ہری مرچ اور ثابت لہسن فرائی کرکے باریک پیس لیں۔ کلیجی میں گرم مسالا، فرائی مسالا اور نمک ملا کر آدھا گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر پانی ڈال کر چڑھادیں۔ گل جائے تو تیل ڈال کر بھون لیں۔ کوئلہ دہکا کر دیگچی میں رکھ دیں۔ پیش کرتے وقت کتری ہوئی ادرک اور لیموں کا رس چھڑک دیں۔

زعفرانی کھیر

دودھ	ایک لیٹر
چینی	دو کپ
کریم	ایک پیکٹ
بادام، پستہ	آدھا کپ
چاول	آدھا کپ
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
زعفران	دو چٹکی

چاول پانی میں ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ دودھ ابال لیں، پھر ابلتے دودھ میں چاول ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ چمچہ چلاتی رہیں۔ چینی اور الائچی پاؤڈر ڈال کر پکائیں۔ کھیر گاڑھی ہوجائے تو زعفران اور کریم ڈال کر مکس کردیں۔ ڈش میں نکال کر پستہ، بادام کی ہوائیاں چھڑک کر ٹھنڈی کرکے پیش کریں۔

آپ کا باورچی خانہ

فوزیہ سعید

عیدالفطر ہو یا عیدالاضحیٰ خواتین کے لیے یہ ایک خوشگوار مصروفیت کا دن ہوتا ہے' خصوصاً "عیدالاضحیٰ پر تو سارا دن کچن میں ہی گزر جاتا ہے۔

عید قرباں سے پہلے اگر آپ کچھ چیزوں کی تیاری کرلیں تو عید کے دن آپ کو کافی سہولت اور آسانی ہوسکتی ہے اور آپ مہمانوں اور گھر والوں کو بھی وقت دے سکتی ہیں۔

(1) ایک ہفتہ پہلے کچن کی صفائی کا اہتمام کریں مسالے چیک کریں۔ خاص طور پر گوشت کے خاص پکوان اور باربی کیو میں استعمال ہونے والے مسالے منگوا کر رکھ لیں۔

(2) فریج اور ڈیپ فریزر دو دن پہلے صاف کرلیں تاکہ گوشت وغیرہ محفوظ کرنے میں آسانی ہو۔

(3) پلاسٹک کی تھیلیاں گھر میں آتی ہیں۔ انہیں ضائع نہ کریں۔ سنبھال کر رکھیں۔ یہ گوشت محفوظ کرنے کے کام آئیں گی۔

(4) گوشت کاٹنے کے چھرے وغیرہ تیز کروالیں اور انہیں دھو کر سرسوں کا تیل لگا کر رکھ لیں تاکہ زنگ آلود نہ ہوں۔

(5) ادرک' لہسن وغیرہ پیس کر محفوظ کرلیں تاکہ بوقت ضرورت استعمال میں آسانی ہو۔

(6) سفید زیرہ' بھون کر پیس کر رکھ لیں۔

(7) کٹی لال مرچیں' اجوائن' پسا کالا نمک' پسی ہوئی سونٹھ' پسی ہوئی کھٹائی اور پسی ہوئی کالی مرچیں ملا کر رکھ لیں۔ یہ مسالے تکے بنانے کے لیے بوٹیوں پر لگائیں گی تو تکے نہ صرف مزے دار ہوں گے بلکہ ہاضم بھی ہوں گے۔

(8) گوشت کو اچھی طرح صاف کرکے اس کی چربی نکال دیں اور کوشش کریں کہ ایک دن میں بہت زیادہ گوشت نہ کھائیں۔ اس سے تیزابیت اور دیگر پرابلم ہوسکتے ہیں گوشت پکاتے ہوئے اس میں ادرک' لہسن اور لیموں کا استعمال ضرور کریں۔

نہاری' بریانی' قورمہ' روسٹ وغیرہ کے لیے گوشت کے علیحدہ علیحدہ پیکٹ بنا کر محفوظ کرلیں۔

(9) گوشت اور ڈشز کے لیے مسالے تیار کرکے رکھ لیں۔ تو کھانا پکانے میں آسانی ہوگی۔ کچا گرائنڈر میں پیس کر پپیتا رکھ لیں۔ یہ بہاری کباب سیخ کباب اور تکوں پر لگانے کے لیے کام آئے گا۔ چھالیہ بھی گوشت گلانے کے کام آسکتی ہے۔ ایک کلو گوشت میں آدھی چھالیہ کا ٹکڑا کافی ہوگا۔ گوشت گلانے کے لیے تھوڑی سی شکر بھی ڈالی جاسکتی ہے۔

(10) بہت زیادہ گوشت فریزر میں محفوظ نہ کریں باربار بجلی جاتی ہے اس گوشت میں خرابی آسکتی ہے۔

(11) کھانے کے بعد' کافی یا کولڈ ڈرنک پیش نہ کریں بلکہ سبز چائے (گرین ٹی) کا استعمال کریں۔ اس میں لیموں' پودینہ' سونف' ادرک اور چھوٹی الائچی ڈالنے سے اس کے فوائد بڑھ جائیں گے۔

(12) گوشت کے بنے پکوان کھانے کے بعد شدت سے میٹھے کی طلب ہوتی ہے۔ اس لیے ایک سویٹ ڈش ضرور بنا کر رکھیں۔ عید سے ایک دن پہلے کھیر' سویاں' رس ملائی' کسٹرڈ یا گلاب جامن بنا کر فریج میں رکھ دیں اور کھانے کے بعد مہمانوں کو پیش کریں۔

(13) آخر میں سب سے ضروری بات۔

اپنی تیاری پر بھی توجہ دیں۔ اچھی طرح تیار ہوں' ہلکا پھلکا میک اپ ضرور کریں۔



عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ع۔ چکوال

آپ کی بہن نے منگنی کے بعد منگیتر سے فون پر رابطہ رکھا اور اسے کچھ اپنی اور اپنے گھر کی باتیں بتا دیں۔ بلاشبہ یہ غلطی تھی لیکن اتنی بڑی نہیں۔ عموماً" رشتہ ہونے کے بعد میسج کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس طرح کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں لیکن اس لڑکے کی نیت شروع سے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ تب ہی اس نے یہ تمام میسج محفوظ کرکے رکھے۔ پھر سات سال تک منگنی رہی۔ اس دوران وہ خاموش رہا۔ سات سال بعد اس نے منگنی توڑنے کا اعلان کیا اور شادی سے انکار کر دیا۔ لڑکے کا باپ اس سے بھی زیادہ خراب ذہنیت کا تھا۔ اس نے کہا "نکاح کرلو، رخصتی سے پہلے طلاق دے دینا۔" اس نے ایک معصوم لڑکی کے متعلق نہیں سوچا۔ دراصل شروع سے ان لوگوں کی نیت میں فتور تھا۔ ممکن ہے وہ آپ کے والد کی عزت اور پیسے کی وجہ سے حسد کرتے ہوں۔

اس واقعہ پر آپ کے والد اتنے دکھی ہیں کہ وہ خودکشی کرنے کو کہتے ہیں۔ لوگ آپ کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ننھیال والوں نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ بہن کے خلاف آپ کے دل میں اتنا غصہ ہے کہ آپ نے اس سے بات چیت ترک کر دی ہے۔

اچھی بہن! آپ کے والد اور آپ جس بات پر دکھی ہیں۔ اگر تھوڑا غور کریں تو آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اتنے خراب اور گھٹیا ذہنیت کے لڑکے سے شادی ہو جاتی اور بچے ہونے کے بعد وہ چھوڑتا تو آج آپ لوگ اس سے زیادہ دکھی ہوتے۔ صرف نکاح منگنی کی طرح ہوتا ہے۔ آپ کی بہن کا ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ ان شاء اللہ بہت جلد اس کی شادی اچھی جگہ ہو جائے گی۔ یہ اس کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اتنے برے لوگوں سے بچ گئی ہے۔ جو لوگ آپ کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی پروا نہ کریں۔ ان کے گھر بھی بیٹیاں ہیں۔ ایسا ہی کوئی واقعہ ان کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ پروا نہیں کریں گی تو وہ خود ہی تھک کر چپ ہو جائیں گے۔ ویسے بھی ایک واقعہ کوئی کب تک دہرا سکتا ہے۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ اپنی بہن کی دل جوئی کریں۔ سب سے زیادہ دکھ تو اسے پہنچا ہے' اس کا اعتماد مجروح ہوا ہے۔ اسے اس وقت سہارے کی ضرورت ہے۔ اس کی غلطی اتنی بڑی نہیں تھی۔ اگر وہ میسج نہ کرتی۔ تب بھی ان لوگوں نے یہی کرنا تھا۔ صبر اور دعا کے ساتھ اس وقت کو گزار لیں اور یقین رکھیں جن لوگوں نے آپ کی بہن کی زندگی کے ساتھ کھیلا ہے۔ جلد یا بدیر وہ اس کا خمیازہ بھگتیں گے۔ بس آپ اپنی بہن کے لیے دعا کرتی رہیں۔ اعصابی کمزوری بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کسی ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے لیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کوئی بھی پریشانی ہو' آپ اللہ تعالیٰ سے شکوے کرنے کے بجائے اس پر کامل بھروسا اور یقین رکھیں کہ وہ آپ کے حق میں اچھا کرے گا۔

شہزا۔۔۔

میری طبیعت بچپن سے بہت حساس ہے۔ کسی کی ذرا سی بات برداشت نہیں ہوتی۔ میں کسی سے جو بات کرتی ہوں یا کسی کی جو بھی بات سنتی ہوں دماغ اسی فلم کو بار بار چلاتا رہتا ہے۔ میں بڑی کوشش کرتی ہوں کہ میرے دماغ سے بات نکل جائے مگر نہیں نکلتی۔ جس کی وجہ سے میرے چہرے سے ہر وقت پریشان نظر آتی ہوں۔ اس کے علاوہ دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکتی۔ مسلسل کسی کی طرف دیکھا نہیں جاتا۔ دماغ میں اکثر ہلکا ہلکا درد محسوس ہوتا ہے۔ نیند رات کو بالکل نہیں آتی۔ جب بھی سونے لگتی ہوں۔ عجیب و غریب خیالات دماغ میں چلنے لگتے ہیں۔ مجھے لیکوریا کی شکایت ہو گئی ہے۔ ان حالات میں مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں شادی کروں یا نہ کروں اور یہ مسئلہ اپنے والدین کو کیسے بتاؤں۔

ج۔

اچھی بہن! غیر معمولی حساس ہونے کی بنا پر آپ کے ساتھ یہ ہوتا ہے۔ جس بیماری کا آپ نے ذکر کیا ہے' وہ سرے سے بیماری ہی نہیں ہے۔ اکثر لڑکیوں کو یہ شکایت ہو جاتی ہے۔ آپ سبزیاں پھل زیادہ استعمال کریں۔ گرم تاثیر اشیا نہ کھائیں۔ اپنی امی کو بتا سکتی ہیں یا آپ خود بھی کسی ڈاکٹر یا حکیم سے مشورہ لے سکتی ہیں۔ شادی ضرور کریں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر شادی نہ کی جائے۔

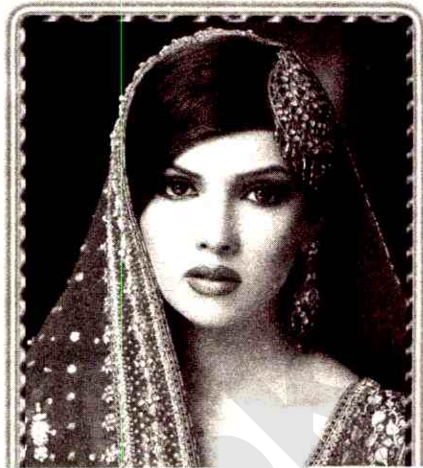
دماغ سے زبردستی بات نکالنے کی کوشش نہ کریں جب بھی یہ کیفیت ہو کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیں' ٹی وی دیکھیں' یا گھر میں کسی سے بات کرنے لگیں کچھ دیر بعد اس بات کو بھول جائیں گی۔

کسی کو مسلسل دیکھنے سے سر میں درد ہوتا ہے تو کوشش کریں' کسی سے بات کرتے ہوئے مسلسل نظر نہ جمائیں۔

انجم۔ کراچی۔۔۔

شرعی مسئلہ تو کوئی عالم دین ہی بتا سکتا ہے۔ آپ کسی عالم دین سے رجوع کریں۔ معاشرتی لحاظ سے یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ آپ کے بچے بڑے ہو چکے ہیں۔ بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ ماں کی عمر بھی ستر سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ اگر اب آپ نے کوئی قدم اٹھایا تو آپ کی ماں کی رسوائی ہو گی اور آپ کی شادی شدہ بیٹی کو بھی سسرال میں طعنے ملیں گے لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے تو بیٹوں کو بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شوہر بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس عمر میں اسے گھر سے نکالنا غلط ہو گا۔ آپ اس سے تعلق تو منقطع کر چکی ہیں۔ اب دنیا کی نظر میں تماشا نہ بنائیں خصوصاً" اپنی ماں کے بارے میں سوچیں۔ ماں باپ کے اولاد پر بڑے حقوق ہوتے ہیں اور اولاد کو ہر حال میں ان کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر یہ بھی سوچیں کہ جو بات اپنے شوہر اور ماں کے متعلق آپ کو پتا چلی ہے' اس میں پتا نہیں کتنی سچائی ہے۔ لوگ عام طور پر الزام لگانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر بڑے بڑے الزام لگا دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بات اس حد تک آگے نہ گئی ہو جس حد تک آپ سوچ رہی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر یہ بات باہر نکلی تو آپ کی اولاد اپنے باپ کے ساتھ ساتھ آپ سے بھی برگشتہ ہو جائے گی۔ آپ کی عزت بھی نہیں رہے گی۔



بیوٹی بکس

امت الصبور

نبیہ نور..... کوٹ مٹھن

س:۔ میری عمر چالیس سال ہے۔ لیکن میں اپنی عمر سے زیادہ نظر آتی ہوں۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی ہیں' میں نے سنا ہے کہ ماسک لگانے سے جھریاں نہیں پڑتیں اور جلد ترو تازہ نظر آتی ہے۔ پلیز کچھ ماسک بتائیں جو مجھے آسانی سے مل سکیں۔ ہمارے چھوٹے سے شہر میں بنے بنائے ماسک نہیں ملتے۔

ج : ماسک سے چہرے کی خشک ڈھلکتی ہوئی بے جان نظر آنے والی جلد بہتر ہو جاتی ہے۔ لیکن سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ آپ چہرے پر موئسچرائزر لگائیں۔ خشک جلد پر جھریاں جلد پڑتی ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے کولڈ کریم لگائیں اگر کولڈ کریم نہ ہو تو بالائی میں لیموں کا عرق ملا کر لگائیں۔

ماسک بنانے کی دو ترکیبیں دی جا رہی ہیں۔ یہ خشک جلد کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

شہد — تین کھانے کے چمچ
لیموں کا عرق — ایک چمچ
کھیرا — ایک عدد

شہد میں لیموں کا رس ملا کر چہرے کی جلد پر تقریباً" پانچ منٹ تک نرمی سے مساج کریں۔ اس کے بعد جلد کو دھوئے بغیر کھیرے کے قتلے باریک کاٹ کر چہرے پر رکھیں اور پندرہ سے بیس منٹ تک آرام کریں۔

روکھی اور بے رونق جلد کے لیے کیلے کا ماسک بھی بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔

کیلا — ایک عدد
کریم یا دودھ کی بالائی — ایک چائے کا چمچہ
(بالائی کو اچھی طرح پھینٹ لیں)
شہد — آدھا چائے کا چمچ

ایک پیالے میں کیلے کو کانٹے کی مدد سے اچھی طرح پیس لیں پھر اس میں بالائی یا کریم اور شہد ڈال کر مکس کریں پھر اس ماسک کو لیپ کی شکل میں دس سے پندرہ منٹ تک لگائیں اس کے بعد جلد کو نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ چہرہ دھونے کے لیے صابن استعمال نہ کریں' البتہ یہ ماسک لگانے سے پہلے چہرہ اچھی طرح دھو کر صاف کر لیں۔ دو گھنٹے بعد صابن استعمال کر سکتی ہیں۔ یہ ماسک جلد کو صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ضروری غذائیت بھی فراہم کرے گا۔

آپ ہفتے میں تین بار یہ ماسک لگائیں۔ آپ کی جھری زدہ روکھی کھردری بے رونق جلد دلکش ہو جائے گی۔

معصومہ خان..... لاہور

س : میرے دانت پیلے ہیں۔ حالانکہ میں صفائی کا ہر ممکن خیال رکھتی ہوں۔ اس کے باوجود دانت صاف نظر نہیں آتے۔

ج : اپنے دانتوں کو موتیوں کی طرح چمک دار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر کھانے کے بعد باقاعدگی سے برش کیا جائے۔ البتہ پھل کھانے کے بعد برش نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ پھلوں میں قدرتی شکر اور صحت بخش اجزا شامل ہوتے ہیں جو دانتوں کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ پھل استعمال کرنے کے فورا" بعد برش کرنے سے دانتوں کی چمک دار قدرتی تہہ اینمل کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اگر آپ دانتوں کی صفائی کا خیال رکھتی ہیں' اس کے باوجود دانتوں کا رنگ پیلا ہے تو آپ ڈینٹسٹ سے رجوع کریں اس کا علاج ہو سکتا ہے۔

